PAGES MISSING WITHIN THE BOOK ONLY

UNIVERSAL
LIBRARY
OU_222643
UNIVERSAL
LIBRARY

دیوان ذوق

یعنی

ملک الشعرا خاقانی ہند شیخ ابراہیم ذوق علیہ الرحمہ کا کلام

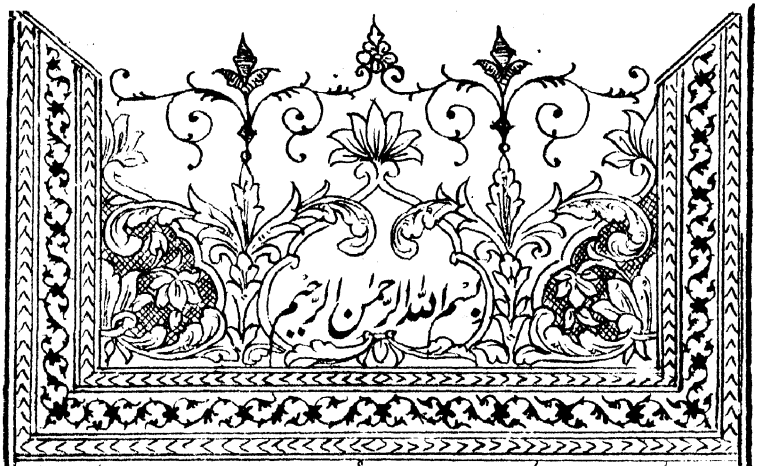
جسقدر ہم پہنچ سکا اور دیباچہ میں سوانح عمری

مؤلفہ

شمس العلماء مولوی محمد حسین صاحب آزاد

پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور

مطبع اسلامیہ لاہور بامر مولوی کرم بخش صاحب مالک و مہتمم مطبع ہذا



یہ علم معنی کی روحیں ہیں کہ الفاظ کی دنیا میں اُتری تھیں۔ ذوق وشوق کے وعدے تھے کہ دلوں کو آگاہ کرینگے۔ استاد مرحوم یہ حسرت ساتھ لے گئے۔ والد میرے شہید آرزو ہوئے۔ میں بڈھا ہو گیا۔ اب خطرہ ہے کہ امانت رہے۔ اور آزاد کو مسافر خانہ سے کوچ کا حکم آجائے۔ ان کے کلام کی ترتیب آسان کام نہیں۔ صدہا شعر ہیں کہ لوگوں کے پاس کچھ لکھے تھے۔ دیوان مروجہ میں کچھ چھپے۔ اور ان کی زبان سے کبھی کچھ سنے کبھی کچھ سنے۔ پھٹے پُرانے مسودے لڑکپن سے بڑھاپے تک کی یادگار ہیں۔ والد مرحوم کے ہاتھ کی بہت تحریریں ہیں۔ بہت کچھ میری قسمت کے نوشتے ہیں کہ حاضر و غائب لکھتا اور جمع کرتا تھا۔ کٹے پھٹے اشعار کاٹ چھانٹ۔ مٹے حرفوں کا اُجالنا۔ اُس زمانہ کے خیالات کو سمیٹنا۔ حالتوں کا تصوّر باندھنا۔ بھولے بسرے الفاظ و مطالب کو سوچ سوچ کر نکالنا میرا کام نہ تھا۔ خدا کی مدد اور پاک روحوں کی برکت شامل حال تھی۔ میں حاضر اور خدا ناظر تھا۔ راتیں صبح ہو گئیں۔ اور دن اندھیرے ہو گئے جب یہ مہم سر انجام ہوئی۔ اب پہلے مرحوم مغفور کا حال سوانح عمری کے طور پر لکھتا ہوں۔ اور جس جس موقع پر کوئی تصویر

خاص پیش آئی۔ یا کوئی نظم کسی تقریب خاص سے لکھی گئی۔ یا کوئی لطیفہ قابل آگاہی گفتہ ہوا۔ وہ بھی جا بجا درج کرتا ہوں۔ والد مرحوم کا اور ان کا آغاز تحصیل میں ساتھ ہوا تھا ساتھ پڑھے۔ ساتھ بڑھے۔ ہر سفر میں شریک حال رہے۔ اور تھوڑے فاصلہ میں دنیا سے رخصت ہوئے مجھے بیس برس تک اس طرح حضوری خدمت رہی کہ ہر وقت پاس بیٹھکر ظاہر و باطن کے فوائد حاصل کرتا تھا۔ جو حال نہیں دیکھے وہ بھی اس طرح سنے ہیں گویا سامنے گذرے ہیں ✤

تحریر حالات میں بعض باتوں کے لکھنے کو لوگ فضول سمجھینگے۔ مگر کیا کروں جی یہی چاہتا ہے کہ کوئی حرف اس گرانبہا داستان کا نہ چھوڑوں۔ یہ شاید اس سبب سے ہو کہ اپنے پیارے اور پیار کرنے والے بزرگ کی ہر بات پیاری ہوتی ہے۔ لیکن نہیں! اُس شعر کے پتلے کا ایک رونگٹا بھی بیکار نہ تھا۔ ایک صنعتکاری کی کل میں کون سے پرزے کو کہہ سکتے ہیں کہ نکالڈالو یہ کام کا نہیں۔ اور کونسی حرکت اس کی ہے جس سے کچھ حکمت انگیز فایدہ نہیں پہنچتا۔ اسی واسطے میں لکھونگا اور سب کچھ لکھونگا۔ جو بات سلسلۂ حالات میں مسلسل ہوسکیگی ایک حرف نہ چھوڑونگا ✤

خاندان

شیخ مرحوم کے والد شیخ محمد رمضان ایک غریب سپاہی تھے۔ مگر زمانہ کے تجربہ اور بزرگوں کی صحبت نے اُنہیں حالات زمانہ سے ایسا باخبر کیا تھا کہ اُن کی زبانی باتیں کتب تاریخ کے قیمتی سرمائے تھے۔ وہ دلّی میں کابلی دروازہ کے پاس رہتے تھے۔ اور نواب لطف علیخاں نے اُنہیں معتبر اور بالیاقت شخص سمجھکر اپنی حرم سرا کے کاروبار سپرد کر رکھے تھے ✤

ولادت

۱۱۔ ذیحجہ ۱۲۰۴ھ میں شیخ محمد رمضان کے گھر میں یہ مبارک چاند نکلا۔ جو آسمان سخن پر عید کا چاند ہو کر چمکا۔ جب پڑھنے کے قابل ہوئے تو حافظ غلام رسول نام ایک

شخص بادشاہی حافظ ان کے گھر کے پاس رہتے تھے۔ محلّہ کے اکثر لڑکے اُنہی کے پاس پڑھتے تھے اِنہیں بھی وہیں بٹھا دیا ✣

تخلص و تعلیم

حافظ غلام رسول شاعر بھی تھے۔ شوقؔ تخلص کرتے تھے۔ اور اگلے وقتوں کے لوگ جیسے شعر کہتے ہیں ویسے شعر کہتے تھے۔ محلّہ کے شوقین نوجوان لڑکوں کے اُمنگ میں اُن سے کچھ کچھ کہوا لیجاتے تھے۔ اکثر اصلاح بھی لیا کرتے تھے۔ غرض ہر وقت اُنکے ہاں یہی چرچہ رہتا تھا شیخ مرحوم خود فرماتے تھے کہ وہاں سُنتے سُنتے مجھے بہت شعر یاد ہو گئے۔ نظم کے پڑھنے اور سُننے میں دل کو روحانی لذّت حاصل ہوتی تھی۔ اور ہمیشہ اشعار پڑھتا پھرتا تھا۔ دل میں شوق تھا اور خدا سے دعائیں مانگتا تھا کہ الٰہی مجھے شعر کہنا آجائے ایک دن خوشی میں آکر خود بخود میری زبان سے دو شعر نکلے۔ اور یہ فقط حسن اتفاق تھا کہ ایک حمد میں ایک نعت میں۔ اُس عمر میں مجھے اتنا ہوش تو کہاں تھا کہ اس مبارک وزن کو خود اسطرح سمجھکر شروع کرتا کہ پہلا حمد میں ہو دوسرا نعت میں ہو جب یہ بھی خیال نہ تھا کہ اس قدرتی اتفاق کو مبارک فال سمجھوں۔ مگر اُن دو شعروں کے موزون ہو جانے سے جو خوشی دل کو ہوئی اس کا مزہ اب تک نہیں بھولتا۔ انہیں کہیں اپنی کتاب میں کہیں جا بجا کاغذوں پر رنگ برنگ کی روشنائیوں سے لکھتا تھا۔ ایک ایک کو سُناتا تھا اور خوشی کے مارے پھولوں نہ سماتا تھا۔ غرضکہ اسی عالم میں کچھ کچھ کہتے رہے اور حافظ جی سے اصلاح لیتے رہے ✣

ابتدائی مشق

اِسی محلّہ میں میر کاظم حسین نام ایک اِن کے ہم سن ہم سبق تھے کہ نواب سید رضی خاں وکیل سلطانی کے بھانجے تھے۔ بیقرار تخلص کرتے تھے۔ اور حافظ غلام رسول ہی سے اصلاح لیتے تھے۔ ان کا ذہن بھی تیزی اور برّاقی میں لاجواب تھا۔ اُنہیں اپنے بزرگوں کی صحبت میں تحصیلِ کمال کے لئے اچھے اچھے موقع ملتے تھے شیخ مرحوم اور وہ اتحادِ طبعی

مزا انگور کا ہے رنگ ہی میں۔ عسل زنبور کا ہے رنگ ہی میں
ہیں اشعار ہلالی اسکی پہچانکیں۔ یہ مضمون دور کا ہے رنگ ہی میں

کے سبب سے اکثر ساتھ رہتے تھے۔ اور مشق کے میدان میں ساتھ ہی گھوڑے دوڑاتے تھے +

ایکدن میر کاظم حسین نے غزل لاکر سنائی شیخ مرحوم نے پوچھا۔ یہ غزل کب کہی؟ خوب گرم شعر نکالے ہیں۔ انہوں نے کہا ہم تو شاہ نصیر کے شاگرد ہو گئے۔ انہیں سے یہ اصلاح لی ہے شیخ مرحوم کو بھی شوق پیدا ہوا اور اُنکے ساتھ جاکر شاگرد ہو گئے +

اسے عطار الٰہی کہنا چاہیئے کہ جوں جوں عمر بڑھتی گئی علم کا شوق بڑھتا گیا میاں عبدالرزاق ایک فاضل اُسی محلہ میں صاحب تدریس تھے۔ اُن کے درس میں جاکر شامل ہونے لگے۔ وہیں والد مرحوم سے بھی ملاقات ہوئی۔ اور کئی برس تک دونو کی تعلیم ایک اُستاد کے دامنِ شفقت میں پلتی رہی۔ نیکی کی بنیاد ہمیشہ استقلال پر ہوتی ہے۔ اول کا رابطہ اخیر دم تک قایم رہا۔ یہ بات اب سگے بھائیوں کو نصیب نہیں ہوتی +

سلسلۂ اصلاح جاری تھے مشاعروں میں غزلیں پڑھی جاتی تھیں۔ لوگوں کی داد واطبیعتوں کو بلند پروازی کے پر لگاتی تھی کہ رشک جو تلامیذ الرحمٰن کے آئینوں کا جوہر ہے استاد شاگردوں کو چمکانے لگا۔ بعض موقع پر ایسا ہوا کہ شاہ صاحب نے ان کی غزل کو دیکھکر بے اصلاح پھیر دیا۔ اور کہا کہ طبیعت پر زور ڈالکر کہو۔ کبھی کہدیا کہ یہ کچھ نہیں۔ پھر سوچ کر کہو۔ بعض غزلوں کو جو اصلاح دی تو اُس سے بے اعتنائی پائی گئی۔ اِدھر انہیں کچھ تو یاروں نے چمکا دیا۔ کچھ اپنی غریب حالت نے یہ آزردگی پیدا کی کہ شاہ صاحب اصلاح میں بے توجہی یا پہلو تہی کرتے ہیں۔ چنانچہ اسی طرح کئی دفعہ غزلیں پھیریں۔ کبھی بہت سے شعر کٹ گئے۔ زیادہ تر قباحت یہ ہوئی کہ شاہ صاحب کے صاحبزادے شاہ وجیہ الدین منیر تھے جو براقی طبع میں اپنے والد کے خلف الرشید تھے۔ انکی غزلوں میں تو اُردو سے یا خدا جانے کس اتفاق سے وہی مضمون پائے گئے۔ اسلئے انہیں رایہ تنسیخ ہوا +

نہیں ہے ناسکی پھانکوں میں یہ زیبا — یہ لشکر کا مورکا ہے رنگتر ے میں
گلگوں مبسم بھراخوں — کسی مہور کا ہے رنگتر ے میں

میر مرحوم کو جس قدر دعوے تھے اُس سے زیادہ طبیعت میں نوجوانی کے زور بھرے ہوئے تھے۔ وہ کسی شاعر کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ جس غزل پر ہم قلم اُٹھائیں اُس زمین میں کون قدم رکھ سکتا ہے۔ مشکل مشکل طرحیں کرتے تھے اور کہتے تھے کون پہلوان ہے جو اس نال کو اٹھا سکے۔ غرض کہ اُن سے اور شیخ مرحوم سے بمقتضائے سن اکثر تکرار ہو جاتی تھی اور مباحثے ہوتے تھے۔ چنانچہ ایک غزل پر جو معرکہ ہوا ردیف ی میں درج ہے دیکھو ع۔ یہاں کے آنے کا مقرر قاصدا وہ دن کرے ؎

اگرچہ لوازمات شاعری جو ایک ہونہار سخنور کیلئے چاہئیں سب انکی طبیعت میں جمع تھے لیکن ایک غریب سپاہی کے بیٹے تھے نہ دنیا کے معاملات کا تجربہ تھا نہ کوئی انکا دوست ہمدرد تھا۔ اسلئے رنج اور دل شکستگی حد سے زیادہ ہوتی تھی اسی حال میں انہوں نے سودا کی غزل پر غزل کہی۔ دوش نقش پا۔ آغوش نقش پا۔ شاہ حاتم صاحب کے پاس لے گئے انہوں نے خفا ہو کر غزل پھینکدی کہ استاد کی غزل پر غزل کہتا ہے؟ اب تو مزا رفیع سے بھی اونچا اڑنے لگا۔ یہاں سے چپکے چلے آئے۔ اُن دنوں میر ایک جگہ مشاعرہ ہوتا تھا۔ اشتیاق نے بیقرار کر کے گھر سے نکالا مگر غزل بے اصلاح تھی۔ دل کے ہراس نے روک لیا کہ ابتدائے کار ہے۔ احتیاط شرط ہے۔ قریب شام کے افسردگی اور مایوسی کے عالم میں جامع مسجد تک جا پہنچے۔ آثار شریف میں فاتحہ پڑھی حوض پر آئے وہاں میر کلو عقیر بیٹھے تھے۔ چونکہ مشاعرہ کی گرم غزلوں نے روشناس کر دیا تھا۔ اور سن رسیدہ اشخاص شفقت کرنے لگے تھے۔ میر صاحب نے انہیں پاس بٹھایا اور کہا کہ کیوں میاں ابراہیم؟ آج کچھ مکدر معلوم ہوتے ہو۔ خیر ہے؟ جو کچھ ملال دل پر تھا اُنہوں نے بیان کیا میر صاحب نے کہا بھلا وہ غزلیں ہمیں تو سناؤ! انہوں نے وہی غزل سنائی۔ میر صاحب کو اُن کے معاملہ پر درد آیا۔ کہا کہ جاؤ بے تامل غزل پڑھ

مزاج اب جسکا صفر آلودی ہے اے شوق — دل اُس بخور کا ہے رنگ تمرے ہیں
لکھا ہوا تھا یہ اُس جبیں کے پر وہ پر — نہیں ہے کوئی اب ایسا زمیں کے پردہ پر

کوئی اعتراض کریگا تو جواب ہمارا ذمہ ہے۔ اور ہاتھ اُٹھا کر دیر تک اِن کے لئے دعا کرتے رہے۔ اگرچہ میر صاحب موصوف کا قدیمانہ انداز تھا مگر وہ ایک کہن سال شخص تھے۔ بڑے بڑے باکمال شاعروں کو دیکھا ہوا تھا۔ اور مکتب پڑھایا کرتے تھے۔ اس لئے شیخ مرحوم کی خاطر جمع ہوئی اور مشاعرہ میں جاکر غزل پڑھی وہاں بہت تعریف ہوئی۔ دیکھو ردیف الف میں۔ ع

لکھا بقدرِ شوق یہ ہوشِ نقشِ پا

اُس دن سے جرأت زیادہ ہوئی اور بے اصلاح مشاعرہ میں غزل پڑھنے لگے طبیعت کی شوخی اور شعر کی گرمی سُننے والوں کے دلوں میں اثرِ برقی کی طرح دوڑی۔ اور کلام کا چرچا بڑھا۔ اُس زمانہ کے لوگ منصف ہوتے تھے۔ بزرگانِ پاک طینت جو اساتذۂ سلف کے یادگار باقی تھے۔ مشاعرہ میں دیکھتے تو شفقت سے تعریفیں کرکے دل بڑھاتے بلکہ غزل پڑھنے کے بعد آتے تو دوبارہ پڑھوا کر سُنتے۔ غزلیں اربابِ نشاط کی زبانوں سے نکلکر کوچہ و بازار میں رنگ اُڑانے لگیں ✣

اکبر شاہ بادشاہ تھے۔ اُنہیں تو شعر سے رغبت نہ تھی۔ مرزا ابوظفر ولیعہد کہ بادشاہ ہوکر بہادر شاہ ہوئے شعر کے شیدا تھے۔ اور ظفر تخلص سے ملکِ شہرت کو تسخیر کیا تھا۔ اس لئے دربارِ شاہی میں جو جو کہنہ مشق شاعر تھے مثلاً حکیم ثناء اللہ خان فراق۔ میر علی خان سید عبدالرحمٰن خانِ احسان۔ برہان الدین خانِ زار۔ حکیم قدرت اللہ خانِ قاسم۔ اِن کے صاحبزادے حکیم عزت اللہ خاں عشق۔ میاں شکیبا شاگردِ میر تقی مرحوم مرزا نظم بیگ عظیم شاگردِ سودا۔ میر قمر الدین منت اور اِن کے صاحبزادے میر نظام الدین میر سب شاعر وہیں آکر جمع ہوتے تھے۔ اپنے اپنے کلام سناتے تھے۔ مطلع

تلوار کے جگر میں لگھوپ چلی	آہ کی ہم نے ساتھ اودھر سے جنگ کو اپنے دھوپ چلی۔
فائدہ شوق بنوٹ کا دیکھو	آج وہ تیر پاس ہے جب ڈیڑھ پہر کی توپ چلی

اور مصرع جلسہ میں ڈالتے تھے۔ ہر شخص مطلع پر مطلع کہتا تھا۔ مصرع پر مصرع لگا کر طبع آزمائی کرتا تھا۔ میر کاظم حسین بیقرار کہ ولیعہد موصوف کے ملازم خاص تھے اکثر ان صحبتوں میں شامل ہوتے تھے۔ شیخ مرحوم کو خیال ہوا کہ اس جلسہ میں طبع آزمائی ہوا کرے تو قوت فکر کو خوب بلند پروازی ہو۔ اُس عہد میں کسی امیر کی ضمانت کے بعد بادشاہی اجازت ہوا کرتی تھی جب کوئی قلعہ میں جانے پاتا تھا۔ چنانچہ میر کاظم حسین کی وساطت سے یہ قلعہ میں پہنچے۔ اور اکثر دربارِ ولیعہدی میں جانے لگے۔

قلعہ میں سامان

شاہ نصیر مرحوم کہ ولیعہد کی غزل کو اصلاح دیا کرتے تھے دکن چلے گئے۔ میر کاظم حسین انکی غزل بنانے لگے۔ اُنہیں دنوں میں جان الفنسٹن صاحب شکارپور سندھ وغیرہ سے حدات سے لیکر کابل تک عہدنامے کرنے کو چلے۔ اُنہیں ایک میر منشی کی ضرورت ہوئی کہ قابلیت وملیت کے ساتھ امارتِ خاندانی کا جوہر بھی رکھتا ہو۔ میر کاظم حسین نے اس عہدہ پر سفارش کیلئے ولیعہد سے شقہ چاہا۔ مرزا اسفل بیگ اُن دنوں میں اُن کے مختارِ کُل تھے۔ اور وہ ہمیشہ اسی تاک میں رہتے تھے۔ کہ جس پر ولیعہد کی زیادہ نظرِ عنایت ہو اُسے کسی طرح سامنے سے کاٹتے رہیں۔ اس قدرتی ہیچ سے میر کاظم حسین کو شقۂ سفارش آسان حاصل ہوگیا۔ اور وہ چلے گئے ٭

شیخ ولیعہد کی غزل بنانے لگے

چند روز کے بعد ایک دن شیخ مرحوم جو ولیعہد کے ہاں گئے تو دیکھا کہ تیراندازی کی مشق کر رہے ہیں۔ انہیں دیکھتے ہی شکایت کرنے لگے کہ بھئی میاں ابراہیم! اُستاد تو دکن گئے میر کاظم حسین اُدھر چلے گئے تم نے بھی ہمیں چھوڑ دیا؟ غرض اُسی وقت ایک غزل جیب سے نکالکر دی کہ ذرا اسے تو بنا دو! یہ وہیں بیٹھ گئے اور غزل بنا کر سنائی ولیعہد بہت خوش ہوئے اور کہا کہ بھئی کبھی کبھی تم آکر ہماری غزل بنا جایا کرو۔

فاقے مست عدو سے بادا ایسا ہی چھٹی کا رجا ہے
شیخ بھلائے شیخی اپنی ہفت کے لقمے کھاتا ہے

نانی جس کی آنی میٹھی میں دھوم سے پڑے
دودھ ملیدا کھاتے ہیں یا مست قلندر گھر

کہ ممتاز محل کی خاطر سے اکبر شاہ کبھی مرزا سلیم کبھی مرزا جہانگیر وغیرہ شاہزادوں کی ولیعہدی کے لئے کوششیں کرتے تھے۔ اور کہتے تھے۔ کہ مرزا ابوظفر میرے بیٹے ہی نہیں۔ مقدمہ اس کا گورنمنٹ میں دائر تھا۔ اور ولیعہد کو بجائے ۵ ہزار روپیہ کے فقط ۵ سو روپے مہینا ملتا تھا غرض چند روز اصلاح جاری رہی اور آخر کو سرکار ولیعہدی سے للعہ رہینا بھی ہوگیا۔ اُس وقت لوگوں کے دلوں میں بادشاہ کا عجب دبدبہ کچھ اور تھا۔ چنانچہ کچھ ولیعہدی کے مقدمہ پر خیال کرکے کچھ تنخواہ کی کمی پر نظر کرکے اپنے اکلوتے بیٹے کو اس نوکری سے روکا۔ لیکن ادھر تو شاعروں کے جمگھٹ کی دل لگی نے اُدھر کھینچا۔ اُدھر قسمت نے آواز دی کہ للعہ رہ سمجھنا یہ ایوان ملک الشعرائی کے چار ستون قایم ہوتے ہیں موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دینا چنانچہ شیخ مرحوم ولیعہد کے استاد ہوگئے ۔

دلی میں نواب آغا بخش خان معروف ایک عالی خاندان امیر علوم ضروری سے باخبر اور شاعری کے کہنہ مشاق۔ اس فن سے ایسا عشق رکھتے تھے کہ فنا فی الشعر کا مرتبہ اسی کو کہتے ہیں۔ جہاں متاع نیک دیکھتے تھے۔ نہ چھوڑتے تھے۔ زمانہ کی درازی نے سات شاعروں کی نظر سے اُن کا کلام گذرانا تھا۔ ابتدا میں شاہ نصیر مرحوم سے اصلاح لیتے رہے اور سید علیخان غمگین۔ وغیرہ وغیرہ اُستادوں سے بھی مشورہ ہوتا رہا جب شیخ مرحوم کا شہرہ ہوا تو اُنہیں اشتیاق ہوا۔ یہ موقع وہ تھا کہ نواب موصوف نے دولت فقر کی برکت سے ترکِ دنیا کرکے گھر سے نکلنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ استاد مرحوم فرماتے تھے کہ میری ۱۹ - ۲۰ برس کی عمر تھی۔ گھر کے قریب ایک قدیمی مسجد تھی ظہر کے وہاں بیٹھکر وظیفہ پڑھا کرتا تھا۔ ایک دن ایک چوبدار آیا اُس نے سلام کیا اور رومال میں لپیٹی ہوئی میرے سامنے رکھکر الگ بیٹھ گیا۔ وظیفہ سے فارغ ہوکر

نواب آغا بخش خان صلابت

میں نے دیکھا تو اُس میں ایک خوشہ انگور کا تھا۔ چوبدار نے کہا کہ نواب صاحب نے دعا فرمائی ہے۔ یہ تبرک بھیجا ہے۔ اور فرمایا ہے کہ آپ کا کلام تو پہنچا ہے مگر آپ سے سننے کو جی چاہتا ہے۔ اُستاد نے کہا کہ کل تو کام ہے۔ کہدینا کہ پرسوں حاضر ہونگا۔ تیسرے دن تشریف لے گئے۔ وہ بزرگانہ اخلاق سے ملے اور بعد گفتگو معمولی کے شعر کی فرمایش کی۔ اِنہوں نے ایک غزل شروع کی تھی اُسکا مطلع پڑھا

نگاہ وار تھا دل پہ پھر کنے جان لگی	چلی تھی برچھی کسی پر کسی کے آن لگی

اُستاد کا ادب

سُنکر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ حال تو پہلے ہی معلوم ہوگیا تھا مگر تمہاری زبان سے سُنکر اور لطف حاصل ہوا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں عجیب اتفاق یہ کہ حافظ غلام رسول شوق یعنے اُستاد مرحوم کے قدیمی اُستاد اُسیوقت آنکلے۔ نواب اُنہیں دیکھکر مسکرائے۔ اور شیخ مرحوم نے اُسی طرح اُٹھکر سلام کیا جو سعادتمند شاگردوں کا فرض ہے۔ وہ ان سے خفا رہتے تھے کہ شاگرد میرا اور مجھے غزل نہیں دکھاتا۔ اور مشاعروں میں میرے ساتھ نہیں چلتا غرض اُنہوں نے اپنے شعر پڑھنے شروع کردئیے شیخ مرحوم نے وہاں ٹھیرنا مناسب نہ سمجھا اور رخصت چاہی۔ چونکہ نواب مرحوم کے برابر بیٹھے ہوئے تھے۔ نواب نے چپکے سے کہا کان بدمزہ ہوگئے۔ کوئی شعر اپنا سناتے جاؤ۔ اُستادِ مرحوم نے اُنہی دنوں میں ایک غزل کہی تھی۔ دو مطلع اُس کے پڑھے +

جینا نظر اپنا ہمیں اصلا نہیں آتا +	گر آج بھی وہ رشکِ مسیحا نہیں آتا
× مذکور تیری بزم میں کس کا نہیں آتا	پر ذکر ہمارا نہیں آتا نہیں آتا

اُسدن سے معمول ہوگیا کہ ہفتہ میں دو دن جاتے۔ اُن سے غزل لے آتے اور

اصلاح کی ہوئی دے آتے۔ چنانچہ جو دیوان **معروف** اب رائج ہے وہ تمام کمال انہیں کا اصلاح کیا ہوا ہے۔ نواب مرحوم اگرچہ ضعفِ پیری کے سبب سے خود کاوش کر کے مضمون کو نقطوں میں بٹھا نہیں سکتے تھے۔ مگر اس کے حقایق و دقایق کو ایسا پہنچتے تھے کہ جو حق ہے اُس عالم میں استادِ مرحوم کی جوان طبیعت اور ذہن کی کاوش اُن کی فرمایش کے نکتے نکتے کا حق ادا کرتی تھی۔ کہا کرتے تھے کہ اگرچہ بڑی بڑی کاہشیں اُٹھانی پڑیں مگر اُن کی غزل بنانے میں ہم آپ بن گئے ✣

فرماتے تھے کہ اپنی مدتِ شوق میں وہ بھی کبھی **جرات** کبھی **سودا** کبھی **میر** کے انداز میں غزلیں لکھتے رہے مگر اخیر میں کچھ بتقضاے سن۔ کچھ اس سبب سے کہ صاحبدل اور صاحبِ نسبت تھے۔ خواجہ **میر درد** کی طرز میں آ گئے تھے۔ یہ بھی آپ ہی کہتے تھے کہ اُن دنوں میں ہمارا عالم ہی اَور تھا۔ جوانی دِوانی۔ **جرات** کے رنگ میں۔ کبھی **سودا** کے انداز میں۔ اور وہ رو کتے۔ آج الٰہی بخش خاں مرحوم ہوتے تو ہم کہکر دکھاتے۔ اب ان کا دیوان ویسا بنا دیتے جیسا اُن کا جی چاہتا تھا۔ اُن کی باتیں کرتے اور بار بار افسوس کرتے۔ اور کہتے۔ ہاے الٰہی بخش خان۔ اُن کا نام ادب سے لیتے تھے۔ اور اس طرح ذکر کرتے تھے۔ جیسے کوئی با اعتقاد اپنے مرشد کا ذکر کرتا ہے۔ اُنکی سینکڑوں باتیں بیان کیا کرتے تھے جو دین دنیا کے کاموں کا دستور العمل ہیں ✣

یہ بھی فرماتے تھے کہ ایسا سخی میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ جو آتا تھا امیر فقیر بچہ بوڑھا اُسے بغیر دیئے نہ رہتے تھے۔ اور دیتا بھی وہی کہ جو اُس کے مناسب حال ہو کوئی سوا گر نہ تھا کہ آئے اور خالی پھر جاے۔ اسبات کی بڑی خوشی تھی کہ ہماری غزل

ہمارے پاس بیٹھکر بناتے جاؤ سناتے جاؤ۔ میں نے اس باب میں پہلو بچایا تھا
مگر اُن کی خوشی اُسی میں دیکھی تو مجبور ہوا اور یہی خوب ہوا ✣
ایکدِن میں اُن کا دو غزلہ بنا رہا تھا۔ اُسکا مقطع تھا۔

اِک غزل پر دو دسی معروف لکھا اس طرح میں	ذوق ہے دل کو نہایت درد کے اشعار سے
کون روتا ہے یہ لگ کر باغ کی دیوار سے	جانور گرنے لگے جائے ثمر اشعار سے

سود اگر آیا اپنی چیزیں دکھانے لگا۔ اُن میں ایک اصفہانی تلوار بھی تھی۔ وہ پسند آئی
خم دم۔ آبداری اور جوہر دیکھکر تعریف کی اور میری طرف دیکھکر کہا ۔ ع

اس ضعیفی میں یہاں تک شوق ہے تلوار سے

میں نے اُسی وقت دوسرا مصرع لگا کر داخل غزل کیا۔ بہت خوش ہوئے ✣

سر لگا دیں ابروئے خمدار کی قیمت میں آج	اس ضعیفی میں یہاں تک شوق ہے تلوار سے

نیا اور چیزوں کے ساتھ تلوار بھی لے لی۔ میں حیران ہوا کہ یہ تو اِن کے حالات و خیالات
سے کچھ بھی تعلق نہیں رکھتی۔ اسے کیا کرینگے۔ خدا کی قدرت ۲-۳ ہی دِن کے
بعد بڑے صاحب (فریزر صاحب رزیڈنٹ) ایک اَور صاحب کو اپنے ساتھ لیکر نواب
احمد بخش خاں مرحوم کی ملاقات کو آئے۔ وہاں سے اِن کے پاس آئے۔ باتیں
چیتیں ہوئیں۔ جو صاحب ساتھ تھے اُن سے ملاقات کروائی۔ جب چلنے لگے تو اُنہوں
نے وہی تلوار منگا کر صاحب ہمراہی کی کمر سے بندھوائی اور کہا

برگ سبز است تحفۂ درویش	چہ کند بے نوا ہمیں دارد

اُن کے ساتھ میم صاحب بھی تھیں۔ ایک ارگن باجا نہایت عمدہ کسی رومی سوداگر
سے لیا تھا وہ انہیں دیا ✣

تسبیح مرد

اُن کے اشعار ایک سلسلہ ہے جسمیں ردیف وار ۱۰۱ مطلع ہے اور کوئی سبزی کے مضمون سے خالی نہیں۔ اسی رعایت سے اُسکا نام تسبیح زمرد رکھا تھا۔ یہ تسبیح بھی استاد مرحوم نے پروئی تھی۔ اور آخر میں ایک تاریخ فارسی زبان میں اپنے نام سے کہکر لگائی تھی۔ جن دنوں اُس کے دانے پروتے تھے تو نواب صاحب مجسم کی سب پر فرمائش تھی کہ کوئی مثل۔ کوئی محاورہ سبزی کا بتاؤ۔ اُن کے بذل وکرم اور حسن اخلاق اور علوِ رتبہ کے سبب سے اکثر شعرا خصوصاً شعرا آکر جمع ہوتے تھے۔ اور اشعار سنتے سناتے تھے۔ ان دنوں میں ان کے شوق سے اوروں پر بھی سبز رنگ چھایا ہوا تھا۔ بھوریخان آشفتہ ایک پرانے شاعر شاہ محمدی مائل کے شاگرد اور اِن کے مرید تھے حمد وظیفہ بھی پاتے تھے۔ آشفتہ کے شعر میں ہری چگ کا لفظ آیا کہ ان کے ہاں ابھی تک نہ بندھا تھا اُن سے وہ شعر لے لیا اور اپنے انداز سے سجایا۔

سو روپیہ کی ایک دعوت خریدی

آج یہاں کل وہاں۔ گذرے یوہیں جگ ہمیں	کہتے ہیں سب سبزہ رنگ اِس سے ہری چگ ہمیں

آشفتہ کو سو روپے ایک رومال میں باندھ کر دیدیئے کہ تمہارے کاوش طبع کیوں خالی جائے ٭

فرماتے تھے ایک دن مجھے ایک غزل دی اور کہا کہ میاں ابراہیم یہ غزل ہماری مدت سے پڑی ہے۔ دیوان میں درج نہیں کی۔ ردی کرنے کو جی نہیں چاہتا مطلع اسکا ہمیں پسند ہے۔ **مطلع**

میں جو لکھنے لگا کچھ یار کے ناخونوں میں	بولے رکھ چھوڑے ہیں تجھ سا رکے ناخونوں میں

اُسی وقت عذر معقول میری سمجھ میں آگیا۔ اور **معروف** اس خوبی سے موزون ہوا

غلط العوام فصیح ہے سخن میں معروف	پھر سخن کیا ہے ان اشعار کے ناخونوں میں

دلی میں آبِ حیات کو دیکھکر بعض اشخاص نے مجھ سے کہا کہ ایسا کہنہ مشق صاحب کرامت بزرگ ایک نوجوان شخص کا کیونکر شاگرد ہوا ہوگا۔ اس مضمون کو تم نکال ڈالو۔ میں کیا کہوں کہ اُستاد کی صحبت میں ہفتہ میں کئی دفعہ اُن صحبتوں اور اصلاحوں کے ذکر ہو جاتے تھے۔ دو غزلوں کے اصل مسودے ابتک بھی میرے پاس موجود ہیں۔ دکھاؤں کیسے ✣

نوٹ دیکھو صحاف کا زمانہ

اُستاد مرحوم فرماتے تھے کہ دالان میں ایکطرف جانماز بچھی رہتی تھی جب میں رخصت ہوتا تو آٹھویں دسویں دن فرماتے۔ بھئی میاں ابراہیم ذرا ہماری جانماز کو نیچے دیکھنا۔ میں نے گوشہ جانماز اٹھا کر دیکھا تو حیران ہوا ایک پڑیا میں کچھ روپے دھرے تھے۔ میں سمجھ گیا اور لے لئے۔ اس میں لطیفہ یہ تھا کہ ہم کس قابل ہیں جو کچھ دیں جس سے ہم مانگتے ہیں یہ وہی تمہیں دیتا ہے۔ پھر جب کچھ دینے تو اسی طرح دیتے۔ یہ گوشہ جانماز اٹھاتے اور لے لیتے ✣

حقہ اسطرح پیتے تھے

ایک دفعہ اُستاد بیمار ہوئے اور کچھ عرصے کے بعد گئے ضعف تھا اور کچھ کچھ شکایتیں باقی تھیں فرمایا کہ حقہ پیا کرو۔ عرض کی کہ بہت خوب۔ مگر نواب صاحب حقہ پلوائیں تو خالی کیا پلوائیں۔ ایک چاندی کی گڑگڑی چلم اوپر جبل۔ مغرق نیچہ۔ مرصع نہال تیار کروا کر سامنے رکھوا دی ✣

بچہ بھی خالی نجا

خلیفہ صاحب (میاں محمد اسمٰعیل) چھوٹے سے تھے۔ ایک دن استاد کے ساتھ چلے گئے رخصت ہوئے تو ایک چھوٹا سا ٹانگن جھلجل سے منگایا زین زرین کسا ہوا اسپر سوار کرکے رخصت کیا کہ یہ بچہ ہے۔ کیا جانے گا کہ میں کس کے پاس گیا تھا ✣

شاہ نصیر مرحوم سے معرکہ آرائی ہوئی ہے

ادھر ولیعہد بہادر کی فرمایشیں اُدھر نواب مرحوم کی غزلوں پر طبیعت کی آزمایشیں تھیں۔ کہ کئی برس کے بعد شاہ نصیر مرحوم دکن سے پھرے اور اپنا معمولی مشاعرہ جاری کیا شیخ علیہ الرحمہ کی مشقیں خوب زوروں پر چڑھ گئی تھیں۔ انہوں نے بھی مشاعرہ میں جاکر غزل پڑھی۔ شاہ صاحب نے دکن میں کسی کی فرمایش سے ۹ شعر کی ایک غزل کہی تھی آتش و آب و خاک و باد۔ وہ غزل مشاعرہ میں سُنائی۔ اور کہا اس طرح میں جو غزل لکھے اُسے میں استاد مانتا ہوں[1] دوسرے مشاعرہ میں انہوں نے اس پر غزل پڑھی۔ شاہ صاحب کی طرف سے بجائے خود اُس پر کچھ اعتراض ہوئے جشن قریب تھا۔ شیخ علیہ الرحمہ نے بادشاہ کی تعریف میں ایک قصیدہ اسی طرح میں لکھا۔ مگر پہلے مولوی عبدالعزیز صاحب کے پاس لے گئے کہ اُس کے صحت و سقم سے آگاہ فرمائیں اُنہوں نے سُن کر پڑھنے کی اجازت دی۔ مگر ولیعہد بہادر نے اپنے شفقہ کے ساتھ اُسے پھر بادشاہ کے پاس بھیجا۔ انہوں نے جو کہا تھا۔ وہی جواب میں لکھدیا اور یہ شعر بھی لکھا۔

بود بگفتۂ من حرف اعتراض چناں		کسی ندیدہ بینا فرو برد انگشت	

شیخ مرحوم کا دل اور بھی قوی ہوگیا۔ اور دربار شاہی میں جاکر قصیدہ سُنایا۔ اس کے بڑے بڑے چرچے ہوئے۔ اور کئی دن کے بعد سُنا کہ اسپر اعتراض لکھے گئے ہیں +

شیخ مرحوم قصیدہ مذکور کو مشاعرہ میں لے گئے کہ وہاں پڑھیں اور روبرو۔ برسرمعرکہ فیصلہ ہوجائے۔ چنانچہ قصیدہ پڑھا گیا۔ شاہ نصیر مرحوم نے ایک ستعد طالب علم کو کہ کتب تحصیلی اُسے خوب رواں تھیں۔ جلسہ میں پیش کرکے فرمایا۔ کہ انہوں نے اسپر کچھ

[1] یہ طنز شیخ مرحوم پر کہ ولیعہد بہادر اور نواب الٰہی بخش خاں کے استاد کہلاتے تھے ۱۲

معترضین

اعتراض لکھے ہیں شیخ علیہ الرحمہ نے عرض کی کہ میں آپکا شاگرد ہوں۔ اور اپنے تئیں اس قابل نہیں سمجھتا۔ کہ آپکے اعتراضوں کے لئے قابلِ خطاب ہوں۔ انہوں نے کہا کہ مجھے کچھ تعلق نہیں۔ انہوں نے کچھ لکھا ہے شیخ مرحوم نے کہا۔ کہ خیر تحریر تو اُسی وقت تک ہے۔ کہ فاصلہ دوری درمیان ہو جب آمنے سامنے موجود ہیں۔ تو تقریر فرمایئے قصیدہ کا مطلع تھا۔

صرصر و کوہ میں ہوں گر آتش و آب و خاک و باد	آج نہ چل سکینگے پر۔ آتش و آب و خاک و باد

معترض نے اعتراض کیا کہ سنگ میں آتش کے چلنے کا ثبوت چاہئے۔ انہوں نے کہا کہ جب پہاڑ کو بڑھنے کے سبب سے حرکت ہے۔ تو اس میں آگ کو بھی حرکت ہوگی معترض نے کہا کہ سنگ میں آتش کا ثبوت چاہئے۔ انہوں نے کہا کہ مشاہدہ! اُس نے کہا کہ کتابی سند دو انہوں نے کہا تاریخ سے ثابت ہے کہ ہوشنگ کے وقت میں آگ نکلی۔ اُس نے کہا کہ شاعری میں شعر کی سند درکار ہے تاریخ شعر میں نہیں چلتی۔ حاضرین مشاعرہ ان سوال و جواب کی اُلٹ پلٹ کے تماشے دیکھ رہے تھے اور اعتراض پر حیران تھے کہ دفعتہً شیخ علیہ الرحمہ نے یہ شعر محسن تاثیر کا پڑھا۔

پیش از ظہورِ جلوۂ جانانہ سوختیم۔	آتش بہ سنگ بود کہ ماخانہ سوختیم۔

مشاعرہ میں ایک ولولہ پیدا ہوا اور ساتھ ہی سودا کا مصرع گذرا۔ ع

ہر سنگ میں شرارہ ہے تیرے ظہور کا

اسی طرح اور اکثر اشعار پر سوال و جواب ہوئے۔ شاہ صاحب بھی بیچ میں کچھ دخل دیتے جاتے تھے۔ اخیر میں ایک شعر پر اُس نے یہ اعتراض کیا کہ اسمیں ثبوت روانی کا نہیں ہے شیخ علیہ الرحمہ نے کہا۔ کہ تغلیب ہے۔ اُسوقت خود شاہ صاحب نے

فرمایا کہ تغلیب کہیں آئی نہیں۔ انہوں نے کہا کہ تغلیب کا قاعدہ عام ہے انہوں نے کہا کہ جب تک کسی اُستاد کے کلام میں نہو جائز نہیں ہوسکتی شیخ علیہ الرحمہ نے کہا کہ آپنے ۹ شعر کی غزل پڑھکر فرمایا تھا کہ اس طرح میں کوئی غزل کہے تو ہم اُسے اُستاد جانیں میں نے تو ایک غزل اور تین قصیدے لکھے اب بھی استاد نہوا ؟ معترض نے کہا کہ اس وقت مجھ سے اعتراضوں کا پورا سرانجام نہیں ہوسکتا کل پر منحصر رکھنا چاہئے۔ اور جلسہ برخاست ہوا ٭

اُسی دن سے تحصیل علوم اور سیر کتب کا شغل واجب ہوا۔ قدرتی سامان اسکا یہ ہوا کہ راجہ صاحب رام۔ جو اہلاک شاہ اودھ کے مختار تھے۔ اُنہیں یہ شوق ہوا کہ اپنے بیٹے کو کتب علمی کی تحصیل تمام کروائیں مولوی عبدالرزاق کہ شیخ مرحوم کے تمہیدی اُستاد تھے۔ وہی اُن کے پڑھانے پر مقرر ہوئے۔ اتفاقاً یہ بھی ایکدن مولوی صاحب کے ساتھ گئے چونکہ انکی میرزی طبع کا شہرہ ہوگیا تھا۔ راجہ صاحب رام نے ان سے کہا۔ کہ میاں ابراہیم تم ہمیشہ درس میں شریک ہو۔ چنانچہ یہ نوبت ہوگئی کہ اگر یہ کبھی شغل یا ضرورت کے سبب وہاں نہ جاتے۔ تو راجہ صاحب کا آدمی انہیں ڈھونڈکر لاتا۔ اور نہیں تو ان کا سبق بھی ملتوی رہتا ٭

کہا کرتے تھے کہ جب بادشاہ عالم ولیعہدی میں تھے۔ تو مرزا سلیم کے بیاہ کی تہنیت میں ایک مثنوی ہنے لکھی اُسکی بحر مثنوی کی معمولی بحروں سے الگ تھی۔ لوگوں نے چرچا کیا کہ یہ جائز نہیں میر نجات کی کل کشتی ہنے دیکھی ہوئی تھی۔ مگر حکیم مرزا[1] محمد صاحب رحمہم اللہ زندہ تھے

[1] حکیم مرزا محمد صاحب علوفیضی کے خاندان سے ایک فاضل کامل اور جامع العلوم تھے طب میں حکیم شریف خان مرحوم کے شاگرد تھے۔ جو حکیم مومنخان کے والد تھے حکیم مرزا محمد صاحب خود بھی شاعر تھے۔ اور اُنکے والد بھی صاحب علم فضل شاعر تھے کامل تخلص کرتے تھے۔ اور رسالہ الیمین فقیہ مصنف حدائق البلاغت کے شاگرد تھے۔ انکا ایک مبسوط رسالہ علم میں نے دیکھا ہوا ہے

اور میرے والد مرحوم انہیں کا علاج کرتے تھے۔ وسعت معلومات اور حصول تحقیقات کی نظر سے ہمنے اُن سے جاکر پوچھا۔ اُنہوں نے فرمایا کہ رواجِ اتفاقی ہے جو مثنوی آٹھ بحروں میں منحصر ہوگئی ہے۔ ورنہ طبع سلیم پر کون حاکم ہے جو روکے۔ جس بحر میں چاہو لکھو استاد کے مسوّدوں میں ایک پرچہ پر چند شعر اُس کے نکلے تھے۔ اُن میں ساچق کا مضمون تھا شعر اب تک یاد ہیں۔

ٹھلیاں تو نہ تھیں وہ مئے عشرت کے سُبو تھے	یا قلزمِ مستی کے حبابِ لبِ جو تھے
لازم تھا کہ لکھ باندھتے یہ اُن کے گلو میں	ہے بند کیا عیش کے دریا کو سُبو میں

چند سال کے بعد ایک قصیدہ اکبر شاہ کے دربار میں کہکر سُنایا کہ جس کے مختلف شعروں میں انواع و اقسام کے صنائع و بدائع صرف کئے تھے اس کے علاوہ ایک زبان میں جو ایک ایک شعر تھا ان کی تعداد ۱۸ تھی مطلع اس کا یہ ہے ✤

جبکہ سرطان و اسد مہر کا ٹھیرا مسکن	آب و ایلولہ ہوئے نشو و نمائے گلشن

اس پر بادشاہ نے خاقانی ہند کا خطاب عطا کیا۔ اُس وقت شیخ مرحوم کی عمر ۱۹ برس کی تھی ✤

حافظ احمد یار[1] نے چند روز پہلے خواب میں دیکھا۔ کہ ایک جنازہ رکھا ہے بہت سے لوگ گرد جمع ہیں۔ وہاں حافظ عبدالرحیم کہ حافظ احمد یار کے والد تھے۔ ایک کھیر کا

خاقانی ہند کا خطاب ملنے سے پہلے

حاشیہ متعلقہ صفحہ ۱۶ - انہوں نے تحفہ اثنا عشریہ کا جواب لکھا تھا۔ اخیر کے تین اجزا باقی تھے کہ دنیا سے انتقال کیا۔ اکثر علما نے کتاب مذکورہ کے جواب لکھے ہیں مگر جس متانت اور جامعیت اور اختصار کے ساتھ انہوں نے لکھا ہے کسی نے نہیں لکھا ۱۲

[1] حافظ احمد یار سید انشا کے یار تھے۔ عجب شگفتہ مزاج خوش طبع سخن فہم شخص تھے۔ باوجودیکہ ہمارے جوان تھے وہ بڈھے تھے۔ مگر یاروں کی طرح ملتے تھے حافظ مرحوم انہیں مولوی صاحب کے دادا تھے جنہوں نے ملت الکاظمین لکھا تھا اور سودا نے انکی ہجو کہی تھی۔ ترجیع بند مخمس میں ع ایک سخنور پہ ہنسا سے کوا حال ہے ۱۲

پیالہ لئے کھڑے ہیں۔ اور شیخ علیہ الرحمہ کو اُس میں سے چمچے بھر بھر کر دیتے جاتے ہیں حافظ موصوف نے اُن سے پوچھا کہ یہ کیا معرکہ ہے۔ اور جنازہ کس کا ہے؟ اُنہوں نے کہا کہ یہ مرزا رفیع کا جنازہ ہے۔ اور میاں ابراہیم ان کے قائم مقام مقرر ہوئے ہیں ✤

خاقانی ہند کے خطاب پر لوگوں نے بڑے چرچے کئے کہ بادشاہ نے یہ کیا کیا۔ کہن سال اور نامی شاعروں کے ہوتے ایک نوجوان کو ملک الشعرا بنایا! اور ایسا عالی درجہ کا خطاب دیا! ایک جلسہ میں یہی گفتگو ہو رہی تھی۔ کسی نے کہا کہ جس قصیدہ پر یہ خطاب ہوا ہے اُسے بھی تو دیکھنا چاہئے۔ چنانچہ قصیدہ مذکور لاکر پڑھا گیا۔ میر کلو حقیر۔ کہ شاعر سن رسیدہ اور شعرائے قدیم کے صحبت یافتہ تھے۔ سُن کر بولے کہ بھئی انصاف شرط ہے۔ کلام کو بھی تو دیکھو۔ ایسے شخص کو بادشاہ نے خاقانی ہند کے خطاب سے ملک الشعرا بنایا تو کیا بُرا کیا۔ مجھے یاد ہے جب اُستاد مرحوم نے یہ حال بیان کیا تھا۔ اُس وقت بھی کہا تھا۔ اور جب ہیں ارباب زمانہ کی بے انصافی یا ان کی بےخبری اور بے بصری سے دق ہو کر کچھ کہتا تو فرماتے تھے کہ بے انصافوں ہی میں سے کوئی با انصاف بھی بول اُٹھتا ہے۔ بے خبروں میں باخبر بھی نکل آتا ہے۔ اپنا کام کئے جاؤ۔ ۳۶ برس کی عمر تھی جبکہ جملہ منہیات سے توبہ کی۔ اور اُس کی تاریخ کہی۔ ع اے ذوق بگو شکستہ بار توبہ ✤

مرزا **ابوظفر** بادشاہ ہو کر بہادر شاہ ہوئے۔ تو انہوں نے یہ پہلے قصیدہ گذرانا

ہے ذرہ تیرا پرتو نور سحر رنگ شفق	رو کش ترے رخ سے ہو گیا نور سحر رنگ شفق

اگرچہ مرزا ابوظفر ہمیشہ انہیں دل سے عزیز رکھتے تھے۔ اور اُن رازوں کے لئے مخزن اعتبار سمجھتے تھے۔ مگر ولیعہدی میں مرزا مغل بیک مختار تھے جب کبھی بڑی سے بڑی تی یا انعام کے موقع آئے۔ تو اُستاد کے لئے یہ ہوا۔ کہ لعل رہینے سے صدر ہو گئے صہ

نیلے تو تھے مغل بیگ کا خطاب ہو
بادشاہ ہو گئے

معہ روپے ہو گئے۔ جب بادشاہ ہوئے۔ اور مرزا مغل بیگ وزیر ہوئے تو وزیر شاہی کا سارا کُنبہ قلعہ میں بھر گیا۔ مگر استادِ شاہی کو ۵ مہینا! پھر بھی انہوں نے حضور میں اپنی زبان سے ترقی کے لئے عرض نہیں کی۔ ان کی عادت تھی کہ فکرِ سخن میں ٹہلا کرتے تھے۔ اور شعر موزون کیا کرتے تھے۔ چنانچہ اُن دنوں میں جب کوئی عالی مضمون چُستی اور درُستی کے ساتھ موزون ہوتا تو اُسکے سُرور میں آسمان کی طرف دیکھتے اور کہتے پھر تے

یوں پھریں ہائے کمال آشفتہ حال افسوس ہے	اے کمال افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

میاں[1] عبدالعزیز خاں صاحب ایک مردِ بزرگ صاحبِ نسبت فقیر تھے شیخ مرحوم بھی اُن سے بہت اعتقاد رکھتے تھے۔ اس عالم میں ایکدن اُن کے پاس گئے۔ اور کہا کہ تخت نشینی سے پہلے حضور کے بڑے بڑے وعدے تھے۔ اب یہ عالم ہے کہ الف کے نام ب نہیں جانتے۔ زبان تک دست نہیں۔ مگر جو کچھ ہیں مرزا مغل بیگ ہیں۔ انہوں نے کہا کہ خدائی کے کارخانے میں عقل ظاہر بین کام نہیں کرتی۔ مگر یہ دیکھو کہ جو دولت تم کو دی ہے۔ وہ اُسکو بھی تو نہیں دی ہے جس دعوے سے تم دربار میں کھڑے ہو کر اپنا کلام پڑھتے ہو۔ اس دعوے سے وہ اپنی وزارت کے مقام پر کب کھڑا ہو سکتا ہو گا۔ ادنے ادنے منشی متصدی اس کے لکھتے پڑھتے ہونگے۔ وہ کیسا ترستا ہو گا۔ کہ نہ اُن کے لکھے کو سمجھ سکتا ہے۔ نہ اُن کا جھوٹ سچ معلوم کر سکتا ہے۔ شیخ مرحوم نے اُنکی ہدایت کو تسلیم کیا اور پھر کبھی شکایت نہ کی ✤

چند روز کے بعد مرزا مغل بیگ کی نُزکی تمام ہو گئی۔ تمام کُنبا قلعہ سے نکالا گیا۔ نواب حامد علیخان مرحوم مختار رہو گئے۔ تب اُستادِ شاہی کا سو روپیہ مہینا ہوا ہمیشہ عید و

[1] فراش خانہ کی کھڑکی رہتے تھے ۱۲

اور نوروزوں کے جشنوں میں قصیدے مبارکباد کے پڑھتے تھے۔ اور خلعت سے اعزاز پاتے تھے ✣

اور آخر ایام میں ایکدفعہ بادشاہ بیمار ہوئے جب شفا پائی اور انہوں نے ایک قصیدۂ غرا کہکر نذر گذرانا تو خلعت کے علاوہ خطاب خان بہادر اور ایک ہاتھی مع حوضۂ نقرئی انعام ہوا ✣

پھر ایک بڑے زور شور کا قصیدہ کہکر گذرانا جس کا مطلع ہے ع شبکو میں اپنے سر بستر خواب راحت ✣ اُسپر ایک گاؤں جاگیر میں عطا ہوا ✣

جس رات کی صبح کو انتقال ہوا قریب شام میں بھی موجود تھا کہ اُنہیں پیشاب کی حاجت معلوم ہوئی خلیفہ صاحب نے اُٹھایا۔ چوکی پائنتی لگی ہوئی تھی۔ ہاتھ کا سہارا دیا اور انہوں نے کھسک کر آگے بڑھنا چاہا۔ طاقت نے یاری نہ دی تو کہا۔ آہ ناتوانی۔ خلیفہ صاحب نے فرمایا کہ۔ شاعروں ہی کا ضعف ہوگیا۔ حافظ ویران بھی بیٹھے تھے۔ وہ بولے کہ آپنے بھی ضعف کے بڑے بڑے مضمون باندھے ہیں مسکرا کر فرمایا کہ اب تو کچھ اس سے بھی زیادہ ہے۔ میں نے کہا سبحان اللہ۔ اس عالم میں بھی مبالغہ قایم ہے خدا اسی مبالغہ کے ساتھ توانائی دے۔ میں رخصت ہوا۔ رات اُسی حالت سے گذری صبح ہوتے کہ ۴ صفر ۱۲۱۷ھ جمعرات کا دن تھا۔ ۱۷ دن بیمار رہکر وفات پائی مرنے سے ۳ گھنٹے پہلے یہ شعر کہا تھا ✣

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گذر گیا	کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

شعرائے ہند نے جس قدر تاریخیں اِن کی کہیں آج تک کسی بادشاہ یا صاحبکمال کو نصیب نہیں ہوئیں ✣

اردو اخبار اندنوں دہلی میں جاری تھا۔ برس دن تک کوئی پرچہ اُس کا ایسا نہ تھا جس میں ہر ہفتہ کئی کئی تاریخیں نہ چھپی ہوں ✤

خاص حالات اور طبعی عادات

شیخ مرحوم قد و قامت میں متوسط اندام تھے۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں۔

آدمیت سے ہے بالا آدمی کا مرتبہ	پست ہمت یہ نہ ہوے و پست قامت ہو تو ہو

رنگ سانولا چیچک کے داغ بہت تھے۔ کہتے تھے کہ ۹ دفعہ چیچک نکلی تھی۔ مگر رنگت اور وہ داغ کچھ ایسے مناسب و موزون واقع ہوئے تھے کہ چمکتے تھے اور بھلے معلوم ہوتے تھے آنکھیں روشن اور نگاہیں تیز تھیں۔ چہرہ کا نقشہ کھڑا کھڑا تھا۔ اور بدن میں پھرتی پائی جاتی تھی بہت جلد چلتے تھے۔ اکثر سفید کپڑے پہنتے تھے۔ اور وہ انکو نہایت زیب دیتے تھے آواز بلند اور خوش آیند جب مشاعرہ میں پڑھتے تھے۔ تو محفل گونج اٹھتی تھی۔ ان کے پڑھنے کا انداز اُن کے کلام کی تاثیر کو بیاندہ زور دیتا تھا۔ اپنی غزل آپ ہی پڑھتے تھے۔ کسی اور سے ہرگز نہ پڑھواتے تھے ✤

صانع قدرت جنہیں صاحب کمال کرتا ہے انہیں اکثر صفتیں دیتا ہے جن میں وہ اپنے ہمجنسوں سے صاف الگ نظر آتے ہیں۔ تیزی ذہن اور براقی طبع کا حال تو اب بھی اُن کے کلام سے ثابت ہے۔ مگر قوت حافظہ کے باب میں ایک ماجرا عالم شیرخوارگی کا انہوں نے کیا جسے سُنکر سب تعجب کرینگے۔ کہتے تھے مجھے اب تک یاد ہے کہ اُس عالم بُخار تھا۔ والد نے پلنگ پر لٹا کر لحاف اُڑھا دیا اور آپ کہ بلی لحاف میں گھس آئی۔ مجھے اُس سے اور خُرخُر کی آواز سے

لیکن نہ ہاتھ سے ہٹا سکتا تھا۔ نہ زبان سے پکار سکتا تھا۔ گھبراتا تھا اور رہ جاتا تھا تھوڑی دیر میں والدہ آگئیں۔ اُنہوں نے اُسے ہٹایا تو مجھے غنیمت معلوم ہوا۔ اور وہ دونو کیفیتیں اب تک یاد ہیں۔ چنانچہ جب بڑا ہوا۔ تو میں نے والدہ سے پوچھا اُنہوں نے یاد کرکے اِس واقعہ کی تصدیق کی۔ اور کہا کہ فی الحقیقت اُس وقت تیری عمر برس دن سے کچھ کم تھی ✣

صلاحیت طبع

صلاحیت طبع کے باب میں خدا کا شکر کیا کرتے تھے۔ اور کہتے تھے کہ ایک دن املی کے درخت میں کنکوا اٹک گیا۔ میں اتارنے کو اوپر چڑھ گیا۔ ایک ٹہنی کو سہارے کے قابل سمجھکر پانو رکھا۔ وہ ٹوٹ گئی میں نیچے آپڑا۔ بہت چوٹ لگی۔ مگر خدا نے ایسی توفیق دی کہ پھر نہ کنکوا اُڑایا۔ نہ درخت پر چڑھا ✣

خوش خلقی

عمر بھر اپنے ہاتھ سے جانور ذبح نہیں کیا عالم جوانی کا ذکر کرتے تھے کہ یاروں میں ایک مرغبی نسخہ قوت باہ کا بڑی کوشش سے ہاتھ آیا۔ شریک ہوکر اس کے بنانے کی صلاح ٹھیری۔ ایک ایک جُز کا بہم پہنچانا ایک ایک شخص کے ذمہ ہوا چنانچہ ۴۰ چڑوں کا مغز ہمارے ہر محوا ہم نے گھر آکر اُن کے پکڑنے کے سامان پھیلا دیئے۔ اور دو تین چڑے پکڑ کر ایک پنجرے میں ڈالے اُن کا چہچہانا دیکھکر خیال آیا کہ ابراہیم ایک پل کے پل مزے کیلئے ۴۰ بیگناہوں کا مارنا کیا انیت ہے۔ یہ بھی تو آخر جان رکھتے ہیں۔ اور اپنی پیاری زندگی کے لئے ہر قسم کی ۔ اُسی وقت اُٹھا۔ اُنہیں چھوڑ دیا۔ اور سب سامان تو پھوڑ یاروں میں اس نسخہ میں شریک نہیں ہوتے ✣

دروازہ کے آگے ایک لمبی گلی تھی اکثر اُس میں پھرا کرتے تھے رات کے وقت بھی ایک سانپ گلی میں چلا جاتا تھا۔ اُسوقت

حافظ غلام رسول ویران شاگرد رشید بھی بیٹھے تھے۔ انہوں نے کہا کہ حضرت پھر آپ نے اُسے مارا نہیں؟ کسی کو آواز دی ہوتی۔ فرمایا کہ خیال تو مجھے بھی آیا تھا مگر پھر میں نے کہا کہ ابراہیم آخر یہ بھی تو جان رکھتا ہے۔ تجھے کئے رکعت کا ثواب ہوگا۔ پھر یہ قطعہ پڑھا۔

چہ خوش گفت فردوسیٔ پاکزاد	کہ رحمت براں تربتِ پاک باد
میازار مورے کہ دانہ کش است	کہ جانِ دارد و جانِ شیریں خوش است

ایکدفعہ برسات کا موسم تھا۔ بادشاہ قطب میں تھے۔ یہ ہمیشہ ساتھ ہوتے تھے۔ اُسوقت قصیدہ لکھ رہے تھے ؎ ع شب کو میں اپنے سر بسترِ خواب راحت ؎ چڑیاں سایہ بان میں تنکے رکھکر گھونسلا بنا رہی تھیں۔ اور جو گرتے تھے اُنہیں لینے کو بار بار اُن کے آس پاس آ بیٹھتی تھیں یہ عالم محویت میں بیٹھے تھے۔ ایک چڑیا سر پر آن بیٹھی انہوں ہاتھ سے اُڑا دیا۔ تھوڑی دیر میں پھر آن بیٹھی ؎

اِنہوں نے پھر اُڑا دیا۔ جب کئی دفعہ ایسا ہوا تو ہنسکر کہا کہ اِس غلیبانی نے میرے سر کو کبوتروں کی چھتری بنا یا ہے؟ ایکطرف میں بیٹھا تھا ایکطرف حافظ ویران بیٹھے تھے وہ نابینا تھے۔ اُنہوں نے پوچھا کہ حضرت کیا؟ میں نے حال بیان کیا۔ ویران بولے کہ ہمارے سر پر تو نہیں بیٹھتی۔ استاد نے کہا بیٹھے کیونکر؟ جانتی ہے کہ یہ مُلّا ہے عالم ہے۔ حافظ ہے۔ ابھی اُحِلَّ لَکُمُ الصَّیْدُ۔ پڑھکر کُلُوْا وَاشْرَبُوْا کہے گا اور بِسْمِ اللّٰہِ اَللّٰہُ اَکْبَر کر دیگا۔ دیوانی ہے جو تمہارے سر پر آئے ؎

فرماتے تھے کہ میں نے ساٹھ سات سو دیوان اساتذہ سلف کے دیکھے اور اُن کا خلاصہ کیا۔ خان آرزو کی تصنیفات۔ ٹیک چند بہار کی تحقیقات اور اس قسم کی اَور کتابیں گو یا اُن کی زبان پر تھیں مگر مجھے اِس کا تعجب نہیں۔ اگر شعرائے عجم کے ہزاروں شعر اُنہیں ازبر تھے

تصوف

چند روز موسیقی کا شوق رہا

تو مجھے حیرت نہیں گفتگو کے وقت جس تڑاقے سے وہ شعر سند میں دیتے تھے مجھے اس کا بھی خیال نہیں کیونکہ جس فن کو وہ لئے بیٹھے تھے یہ سب اُس کے لوازمات ہیں۔ ہاں تعجب یہ ہے کہ تاریخ کا ذکر آئے تو وہ ایک صاحب نظر مؤرخ تھے تفسیر کا ذکر آئے تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا تفسیر کبیر دیکھکر اُٹھے ہیں خصوصاً تصوّف میں ایک عالم خاص تھا کہ جب تقریر کرتے تھے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ شیخ شبلی ہیں۔ یا بایزید بسطامی بول رہے ہیں۔ وحدتِ وجود اور وحدتِ شہود میں علم اشراق کا پرتو دیکر کبھی ابوسعید ابوالخیر تھے کبھی محی الدین عربی۔ پھر جو کہتے تھے۔ ایسی کانٹے کی تول کہتے تھے کہ دل پر نقش ہو جاتا تھا۔ اور جو کچھ اُن سے سن لیا ہے آجتک دل پر نقش ہے۔ رمل و نجوم کا ذکر آئے تو وہ نجومی تھے۔ خواب کی تعبیر میں اُنہیں خدا نے ایک ملکہ راسخہ دیا تھا۔ اور لطف یہ کہ احکام اکثر مطابق واقع ہوتے تھے۔ اگرچہ مجھے اسقدر وسعتِ نظر بہم پہنچانے کا بڑا تعجب ہے مگر اس سے زیادہ تعجب یہ ہے کہ اُنکے حافظہ میں اسقدر مضامین محفوظ کیونکر رہے ✤

علم طب کو خوب حاصل کیا مگر کام نہ کیا۔ خوف آتا۔ کہ ایسا نہ ہو۔ بے پروائی سے کسی کا خون ہو جائے ✤

کہتے تھے کہ شعر کا بچپن سے عشق ہے۔ ابتدا میں دنیا کی شہرت اور ناموری اور تفریح طبع نے مجھے مختلف کمالوں کے رستے دکھائے۔ چند روز موسیقی کا شوق ہوا اور کچھ حاصل بھی کیا مگر خاندیس سے ایک بڑا صاحب کمال گویا آیا۔ اُس سے ملاقات کی یا تو باتوں باتوں میں اُس نے کہا کہ جو گانے کا شوق کرے اُس کے لئے ۳۰۰ برس کی عمر چاہئے۔ ۱۰۰ برس سیکھے۔ ۱۰۰ برس سنتا پھرے اور جو سیکھا ہے اُسی مطابق کرے پھر ۱۰۰ برس بیٹھکر اَوروں کو سنائے اور اُس کا لطف اُٹھائے۔ یہ سُنکر دل برداشتہ ہو گیا۔

اور یہ بھی خیال آیا کہ ابراہیم اگر بڑا کمال پیدا کیا تو ایک ڈوم ہو گئے۔ اسپر بھی جو کلاونت ہوگا وہ ناک چڑھا کر یہی کہے گا کہ آتا ئی ہیں۔ سپاہی زادے سے ڈوم بنا۔ کیا ضرور؟

نجوم و رمل کا بھی شوق کیا اُس میں دستگاہ پیدا کی نجومیوں کا ایک صاحب کمال مغلپورے رہتا تھا اُس سے نجوم کے مسائل حاصل کیا کرتے تھے۔ ایکدن کسی سوال کا نہایت درست جواب اُس نے دیا اور گفتگو ہوتے ہوتے یہ بھی کہا کہ ایک ایک ستارہ کا حال اور اس کے خواص معلوم کرنے کے لئے تو برس چاہئے ہیں۔ یہ سُنکر اُس سے بھی دل برداشتہ ہو گیا ✣

نجوم کے چھوڑنے کا یہ سبب بھی ہوا کہ ولی عہدی کا زمانہ تھا۔ مرزا شمل بیگ کا بھائی روشن بیگ اور بھائی بندوں کی طرح بے علم بے تربیت جاہل تھا۔ غریبی سے بھائی کی بدولت آسودہ ہو گیا تھا۔ وضع کو تراشتا تھا۔ سرکار میں صاحب خدمت تھا۔ کاروبار میں دخیل تھا۔ یہی لوگ اجزا دربار تھے۔ اُستاد جاتے تو انہیں میں بیٹھنا اور وقت گذارنا پڑتا۔ اُن دنوں جوانی کا عالم تھا۔ اُس سے ہنسا کرتے اور دل بہلایا کرتے۔ اُس کی ایک رنڈی بھی تھی۔ اُستاد کبھی کبھی کہتے۔ کہو تمہاری وہ کیسی ہیں۔ وہ کہتا خوب! اُن دنوں احکام نجوم کی مشق چڑھی ہوئی تھی۔ کبھی گھر سے کبھی وہیں حساب لگا کر دیکھ لیتے۔ اور کہتے کیوں جی آج رات کو تو جوتی چلتی رہی۔ کبھی معلوم ہوتا تو کہتے کیوں صاحب رات کو تو مزے میں تھے۔ کیوں جی وہ طرہ پر بگڑی تھی یا اور بات پر۔ روشن بیگ سوچتا کہ انہیں کہاں سے خبر ہو جاتی ہے۔ اُسے وہم یہ تھا کہ شاید اُس سے ملتے نہ ہوں۔ گھبراتا اور شرماتا ✣

اُس نے کہنا شروع کیا کہ حضور انہیں نجوم میں بڑا دخل ہے۔ ایک دن اُستاد گئے۔ بادشاہ محل میں تھے۔ خبر ہوئی۔ باہر آئے مٹھی سامنے بند کر کے اُن سے پوچھا بھئی میاں ابراہیم اپنے نجوم حساب کر کے بتاؤ۔ ہمارے ہاتھ میں کیا ہے۔ وہ دلمیں شرمندہ ہوئے۔ مگر حساب کر کے عرض کی کہ

گوشت کی بوٹی معلوم ہوتی ہے۔ ہنس پڑے اور مٹھی کھولکر دیکھا دی وہی تھی۔ ہاتھ میں ایک سونے کی انگوٹھی تھی وہ مرحمت فرمائی۔ انہوں نے اُس دن سے توبہ کی۔ پھر کبھی موقعہ ہی آجائے تو حساب کرکے دیکھ لیتے تھے۔ وہ بات نہیں تھی ٭

مکھن لعل کے گنج میں ایک جوتشی پنڈت تلسی رام نامینا تھے۔ ایک مرد دیرینہ سال منشی درگا پرشاد کہ شیخ مرحوم کے قدیمی دوست تھے اور جوتشی صاحب کے پاس بھی جایا کرتے تھے۔ اُنہوں نے جوتشی صاحب کی بہت تعریف کی اور ایک دن قرار پاکر یہ بھی اُن کے پاس گئے۔ کئی دلچسپ سلسلے گفتگوؤں کے ہوئے۔ بعدازاں انہوں نے بے اظہار نام اپنے زائچہ کی صورت حال بیان کی۔ جوتشی صاحب نے کہا کہ وہ شخص صاحب کمال ہو۔ اور غالباً کمال اس کا کسی ایسے فن میں ہو کہ باعث تفریح ہو۔ اس کا کمال رواج خوب پاوے۔ اُس کے حریف بھی بہت ہوں مگر کوئی سامنے نہ ہو سکے۔ وہ اسی قسم کی باتیں کہے جاتے تھے جو شیخ مرحوم نے پوچھا کہ اُسکی عمر کیا ہو؟ اُنہوں نے کہا کہ ۶۷۔ ۶۸ حد ۶۹ یہ سنکر شیخ مرحوم کے چہرہ پر آثار ملال ظاہر ہوئے اور خدا کی قدرت کہ ۶۸ برس کی عمر میں انتقال ہوا۔ اگرچہ عقلاً اور نقلاً احکام نجوم پر اعتقاد نہ کرنا چاہئے لیکن واقعہ نظر پیش گذرا تھا اس لئے واقعہ نگاری کا حق ادا کیا۔ میں بھی دیکھتا تھا کہ اُنہیں آخر عمر میں مرنے کا خیال اکثر رہتا تھا۔ ایکدفعہ بادشاہ بیمار ہو کر اچھے ہوئے غسل صحت کا جشن قریب تھا اُنہوں نے مبارکباد کا قصیدہ کہا۔ میں حسب معمول خدمت میں حاضر ہوا۔ وہ اس وقت اس قصیدہ کے شعر لکھ رہے تھے۔ چنانچہ اشعار اُسکے سنانے لگے مطلع تھا۔

نہ ہے نشاط کہ گر کیجئے اُسے تحریر	عیاں ہو خامہ سے تحریر نغمہ جا بجا سر بر

اس کے آگے شعر سناتے جاتے تھے۔ میں تعریف کرتا جاتا تھا۔ وہ مسکراتے جاتے تھے۔ اور پڑھتے جاتے تھے۔ جب یہ شعر پڑھا ٭

ہوا پہ دوڑتا ہے اِس طرح سے ابر
بے اختیار میری زبان سے نکلا کہ
پھٹ گئے۔ اور کہا کہ اِس مزے
اِن کی طبیعت کو خدا تعالےٰ نے
اور اِسی میں خوش تھے۔ ایک
چارپائی ایک
لگا رہتا
جاڑا
تھے

سلامتی - بدن کی صحت دنیا کی عزت و
سالم رکھ۔ اُس کے دشمن بربادہوں وغیرہ وغیرہ
خاص خاص دوستوں کے لئے۔ یاجو
وغیرہ۔ ایک شب اس موقع پر میرے
چنانچہ اُن کے دروازے کے
اور مانگتے مانگتے وہ بھی
جائیگا
تھ
شب

عدیم الفرصت تھے۔ باوجود اس کے جب فرصت پاتے۔ تو اُستاد کا کلام اُن سے لیتے اور رصاف کرتے جاتے بداندیشوں میں گھرے ہوئے تھے۔ اسلئے بہت احتیاط کرتے تھے۔ اپنی تصنیف کسی کو دیتے نہ تھے۔ البتہ جو چیز والد مرحوم کو دیتے۔ جانتے تھے کہ اب محفوظ ہو گئی +

وفات کے چند روز بعد میں نے اور خلیفہ اسمٰعیل مرحوم نے چاہا کہ کلام کو ترتیب دیں۔ سب ذخیرہ نکالا محنت نے اسکے انتخاب میں پسینہ کی جگہ لہو ٹپکایا کیونکہ بچپن سے لیکر دم واپسیں تک کا کلام اُنہیں میں تھا۔ اور بہت سی غزلیں بادشاہ کی۔ بہتیری غزلیں شاگردوں کی بھی ملی ہوئی تھیں +

چنانچہ اول انکی اپنی غزلیں اور قصاید انتخاب کرلئے۔ یہ کام کئی مہینے میں ختم ہوا۔ غرض پہلے غزلیں صاف کرنی شروع کیں۔ اس خطا کا مجھے اقرار ہے کہ کام کو میں نے جاری کیا مگر بالطمینان کیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اس طرح یکایک زمانہ کا ورق اُلٹ جائیگا۔ عالم تہ و بالا ہو جائیگا جسقدر کے نمونہ یہ جا چھپینگے۔ دل کے ارمان دل ہی میں رہ جائینگے۔ دفعتہً ۱۸۵۷ء کا غدر ہو گیا کسی کا کسی کو ہوش نہ رہا چنانچہ افسوس ہے کہ خلیفہ محمد اسمٰعیل اُن کے فرزند جسمانی کے ساتھ ہی فرزندان روحانی بھی دنیا سے رحلت کر گئے۔ میرا حال ہوا کہ فتحیاب لشکر کے بہادر دفعتہً گھر میں گھس گئے۔ اور بندوقیں دکھائیں کہ جلد نکلو۔ دنیا آنکھوں میں اندھیر تھی بھرا ہوا گھر سامنے تھا اور میں حیران کھڑا تھا کہ کیا کیا کچھ اُٹھا کر لے چلوں۔ ان کی غزلوں کے جنگ پر نظر پڑی یہی خیال آیا کہ محمد حسین! زندگی باقی ہے تو سب کچھ ہو جائیگا مگر اُستاد کہاں سے پیدا ہونگے۔ جو غزلیں پھر آکر کہینگے۔ اب اُنکے نام کی زندگی ہے اور ہے تو ان پر منحصر ہے۔ یہ ہیں تو مر کر بھی زندہ ہیں۔ یہ گئیں تو نام بھی نہ رہیگا۔ وہی جنگ اُٹھا بغل میں مارا۔ بچے سچے گھر کو چھوڑ دو نیم جانوں کے ساتھ گھر سے بلکہ شہر سے نکلا غرض

میں تو آوارہ ہو کر خدا جانے کہاں کا کہاں نکل آیا۔ حافظ غلام رسول ویران نے شیخ مرحوم کے بعض دروغواہ دوستوں سے ذکر کیا کہ مسودوں کا سرمایہ سب آپ کے ساتھ برباد ہوا۔ اس وقت یہ زخم تازہ ہے اگر اب دیوان مرتب ہوا تو کیسا ہوگا۔ حافظ موصوف کو خود بھی حضرت مرحوم کا کلام بہت کچھ یاد تھا۔ اور خدا نے انکی بصیرت کی آنکھیں ایسی روشن کی تھیں کہ بصارت کے محتاج نہیں تھے باوجود اسکے لکھنے کی سخت مشکل ہوئی غرضکہ ایک مشکل میں کئی کئی مشکلیں تھیں۔ اُنہوں نے اس مہم کا سرانجام کیا۔ ۱۲۷۹ھ ہجری میں ایک مجموعہ جس میں اکثر غزلیں تمام اکثر ناتمام بہت سے متفرق اشعار۔ اور چند قصیدے ہیں۔ چھاپ کر نکالا مگر دردمندی کی آنکھوں سے لہو ٹپکا۔ کیونکہ جس شخص نے دنیا کی لذتیں عمر کے مختلف موسم اور موسموں کی بہاریں۔ دن کی عیدیں رات کی شبِ اتیں بدن کے آرام دل کی خوشیاں طبیعت کی اُمنگیں۔ سب چھوڑیں اور ایک شعر کو لیا جس کی انتہا تمنا یہی ہوگی کہ اس کی بدولت نام نیک باقی رہیگا۔ تباہ کار زمانہ کے ہاتھوں آج اس کی عمر بھر کی محنت نے یہ سرمایہ دیا۔ اور جس نے ادنےٰ ادنےٰ شاگردوں کو صاحبِ دیوان کر دیا۔ اسکو یہ دیوان نصیب ہوا۔ خیر ع یوں ہی خدا جو چاہے تو بندہ کا کیا چلے۔ میرے پاس بعض قصیدے ہیں اکثر غزلیں ہیں۔ یہ داخل ہو جائینگی۔ یا ناتمام غزلیں پوری ہو جائینگی۔ مگر تصنیف کے دریا میں سے پیاس بجھ پانی بھی نہیں ✣

جو غزلیں اپنے تخلص سے کہیں تھیں اگر جمع کیجاتیں تو بادشاہ کے چار دیوانوں کے برابر ہوتیں۔ غزلوں کے دیوان کو دیکھکر معلوم ہوتا ہے۔ کہ علم جو ہر اُن کی کلام کا۔ تازگی مضمون صفائی کلام۔ چستیٔ ترکیب خوبیٔ محاورہ۔ اور عام فہمی ہے۔ مگر حقیقت میں رنگ مختلف وقتوں میں مختلف رہا۔ ابتدا میں مرزا رفیع کا انداز تھا۔ شاہ نصیر سے اُن دنوں معرکے ہو رہے تھے

اُن کا ڈھنگ وہی تھا۔ اِس لئے انہوں نے بھی وہی اختیار کیا۔ اِسکے علاوہ مرزا کی طرز کو جلسہ کے گرمانے میں۔ اور لوگوں کے لبِ دہن سے واہ وا کے نکال لینے میں جادو کا اثر ہے۔ چنانچہ وہی مشکل طرحیں چست بندشیں۔ برجستہ ترکیبیں۔ معانی کی بلندی۔ الفاظ کی شکوہیں۔ ان کے ہاں بھی پائی جاتی ہیں +

چند روز کے بعد آصفی بخش خاں معروف بہ یحییٰ خدمت میں اور ولیعہد کے دربار میں پہنچے۔ معروف ایک دیرینہ سال مشاق اور فقیر مزاج شخص تھے۔ اُن کی پسند طبع کے بموجب انہیں بھی تصوف اور عرفان اور درد دلی کی طرف خیالات کو مائل کرنا پڑا۔ نوجوان ولیعہد طبیعت کے بادشاہ تھے۔ اِدھر یہ بھی جوان اور ان کی طبیعت بھی جوان تھی۔ وہ جرأت کے انداز کو پسند کرتے تھے۔ اور جرأت اور سید انشا و مصحفی کے مطلع اور اشعار بھی لکھنؤ سے اکثر آتے رہتے تھے انکی غزلیں انہیں کے انداز میں بناتے تھے نتیجہ اسکا یہ ہوا کہ ان کی غزل اخیر کو گلدستہ گلہائے رنگا رنگ کا ہوتی تھی۔ دو تین شعر بلند خیالی کے۔ ایک دو تصوف کے۔ دو تین معاملے کے اور بیچ اسمیں یہ ہوتا تھا کہ ہر قافیہ بھی ایک خاص انداز کے ساتھ خصوصیت رکھتا ہے کہ اُسی میں بندھے تو لطف دے۔ نہیں تو پھیکا رہے۔ پس وہ مشاق باکمال اس بات کو پورا پورا سمجھا ہوا تھا۔ اور جس قافیہ کو جس پہلو کے مناسب دیکھتا تھا۔ اُسی میں باندھ دیتا تھا۔ اور اس طرح باندھتا تھا کہ اُور پہلو نظر نہ آتا تھا۔ ساتھ اس کے صفائی اور محاورہ کو ہرگز ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ اور انہیں اصول کے لحاظ سے۔ میر۔ مرزا۔ درد۔ مصحفی۔ سید انشا۔ جرأت۔ بلکہ تمام شعرائے متقدمین اس ادب سے یاد کرتے تھے گویا انہیں کے شاگرد ہیں۔ ایک ایک کے چیدہ اشعار اس محبت سے پڑھتے تھے گویا اسی دستور العمل سے انہوں نے تہذیب پائی ہے۔ اور فی الحقیقت سب کے انداز کو اپنے اپنے موقع پر پورا پورا کام میں لاتے تھے پھر بھی [illegible]

جانتے ہیں کہ اصلی میلان انکی طبیعت کا سودا کے انداز پر زیادہ تھا ✤
نظم اردو کی نقاشی میں مرزائے موصوف نے قصیدہ پر دستکاری کا حق ادا کر دیا ہے
اُن کے بعد شیخ مرحوم کے سوا کسی نے اُسپر قلم نہیں اُٹھایا اور انہوں نے مرقع کو ایسی اونچی
محراب پر سجایا کہ جہاں کسی کا ہاتھ نہیں پہنچا۔ انوری۔ ظہیر۔ ظہوری۔ نظیری۔ عرفی فارسی
کے آسمان پر بجلی ہو کر چمکتے ہیں۔ لیکن انکے قصیدوں نے اپنی کڑک دمک سے ہند کی زمین کو آسمان کر دیا۔
ہر جشن میں ایک قصیدہ کہتے تھے۔ اور خاص خاص تقریبیں جو پیش آتی تھیں وہ الگ تھیں۔
اگر جمع ہوتے تو خاقانی ہند کے قصاید خاقانی شروانی سے دوچند ہوتے۔ جب تک اکبر شاہ زندہ
تھے۔ انکا دستور تھا کہ قصیدہ کہکر لیجاتے۔ اور اپنے آقا یعنی ولیعہد بہادر کو سناتے۔ دوسرے دن
ولیعہد ممدوح اُس میں اپنی جگہ بادشاہ کا نام ڈلوا کر لیجاتے۔ اور دربار شاہی میں سنواتے۔
افسوس ہے کہ عالم جوانی کی طبع آزمائی سب برباد ہوئی۔ جو کچھ ہیں وہ چند قصیدے بڑھاپے کی
برکت ہے ✤
کئی مخمس تھے۔ بہتیری رباعیاں تھیں۔ سب اُن کے ساتھ گئیں ✤
مرشئے سلام کہنے کا اُنہیں موقع نہیں ملا۔ بادشاہ کا قاعدہ تھا کہ شاہ عالم اور اکبر شاہ کی جلوس
محرم میں کم سے کم ایک سلام ضرور کہتے تھے۔ شیخ مرحوم بھی اسی کو اپنی سعادت
عبادت سمجھتے تھے ✤
ہزاروں گیت۔ ٹپے۔ ٹھمریاں۔ ہولیاں کہیں۔ وہ بادشاہ کے نام سے عالم میں مشہور ہیں
اور ان باتوں میں وہ اپنی شہرت چاہتے بھی نہ تھے ✤
اُن کے اور اُن کے دیکھنے والوں کے لئے بڑے فخر کی بات یہ ہے کہ زمانے کمال شاعری اور
درجہ قادر الکلامی کا پایا اور چند آدمیوں سے انہیں ناراضی یا رنج بھی پہنچا۔ مگر تمام

عمر میں ایک شعر بھی ہجو میں نہ کہا۔ خدا ہر شخص کو اُس کی نیت کا پھل دیتا ہے۔ اُس کی شان دیکھو کہ ۶۸ برس کی عمر پائی مگر خدا نے اُن کی ہجو بھی کسی کے مُنہ سے نہ نکلوائی۔ اکثر کہا کرتے تھے کہ زبان جوہر لطیف ہے اسے بدی سے آلودہ کرنا نہ چاہیئے ٭

اکثر نئے ایجاد و اختراع اُن کے ارادے میں تھے اور بعض بعض ارادے شروع ہوئے مگر ناتمام رہے۔ کیونکہ بادشاہ کی فرمایشیں دم لینے کی مُہلت نہ دیتی تھیں۔ اور تماشا یہ کہ بادشاہ بھی ایجاد کا بادشاہ تھا۔ اِتنا تھا کہ بات نکالنا مگر اُسے سمیٹ نہ سکتا تھا۔ اُس کا کیا ہوا اِنہیں سنبھالنا پڑتا تھا ٭

اپنی غزل بادشاہ کو سناتے نہ تھے۔ اگر کسی طرح پہنچ جاتی تو وہ اُسی غزل پر خود غزل کہتے اب اگر نئی غزل کہکر دیں اور وہ اپنی غزل سے پست ہو تو بادشاہ بھی بچّہ نہ تھا۔ ۷۰ برس کا سخن فہم تھا۔ اگر اُس سے چست کہیں تو اپنے کہے کو آپ مٹانا بھی کچھ آسان کام نہیں۔ ناچار اپنی غزل میں ان کا تخلص ڈالکر دیدیتے تھے[1]۔ بادشاہ کو بڑا خیال رہتا تھا کہ وہ اپنی کسی چیز پر زور طبع نہ خرچ کریں۔ جب اِن کی شوقِ طبع کو کسی طرف متوجّہ دیکھتا تو برابر غزلوں کا تار باندھ دیتا کہ جو کچھ جوشِ طبع ہو اِدھر ہی آجائے ٭

عموماً اندازِ کلام

کلام کو دیکھکر معلوم ہوتا ہے کہ مضامین کے ستارے آسمان سے اُتارے ہیں مگر اپنے لفظوں کی ترکیب سے اُنہیں ایسی شان و شکوہ کی کُرسیوں پر بٹھایا ہے کہ پہلے سے بھی اونچے نظر آتے ہیں۔ انہیں قادر الکلامی کے دربار سے ملکِ سخن پر حکومت مل گئی ہے کہ ہر قسم کے خیال کو جس رنگ سے چاہتے

[1] دیکھو رونیف ص میں ۱۲

ہیں کہ جاتے ہیں کبھی تشبیہ کے رنگ سے سجا کر استعارہ کی بُو سے بساتے ہیں۔ کبھی بالکل سادے لباس میں جلوہ دکھاتے ہیں۔ مگر ایسا کچھ کہ جاتے ہیں کہ دل میں نشتر سا کھٹک جاتا ہے اور مُنہ سے کبھی واہ نکلتی ہے اور کبھی آہ نکلتی ہے معلوم ہوتا ہے کہ اِن کے ہونٹوں میں شستہ اور برجستہ لفظوں کے خزانے بھرے ہیں۔ اور ترکیبِ الفاظ کے ہزاروں رنگ ہیں مگر جسے جہاں سجتا دیکھتے ہیں وہ گویا وہیں کے لئے ہوتا ہے۔ وُہ طبیعتِ کامل کی طرح ہر مضمون کی طبیعت کو پہچانتے تھے کہ کونسا ہے کہ سادگی میں رنگ دیجائے گا۔ اور کونسا رنگینی میں کامل مصور کی تیز نی قلم کو اُس کے رنگوں کی شوخی روشن کرتی ہے۔ اسی طرح اِن کے مضمون کی باریکی کو اُن کے الفاظ کی لطافت جلوہ دیتی ہے۔ اُنہیں اس بات کا کمال تھا کہ باریک سے باریک مطلب و پیچیدہ سے پیچیدہ مضمون کو اس صفائی سے ادا کر جاتے تھے گویا ایک شربت کا گھونٹ تھا کہ کانوں کے رستہ سے پلا دیا۔ اِسی وصف نے نادانوں کو غلطی میں ڈالا ہے۔ جو کہتے ہیں کہ اِن کے ہاں عالی مضامین نہیں بلکہ سیدھی باتیں اور صاف صاف خیالات ہوتے ہیں وہ نہیں جانتے کہ اُن کے ہونٹوں میں خدا نے عجب تاثیر دی تھی کہ جو لفظ اُن سے ترکیب پا کر نکلے ہیں۔ خود بخود زبانوں پر ڈھلکتے آتے ہیں۔ جیسے ریشم پر موتی۔ خدا جانے زبان نے کسی آئینہ کی صفائی اُڑائی ہے۔ یا اُنہوں نے الفاظ کے نگینوں پر کینو کر جلا کی ہے جس سے کلام میں یہ بات پیدا ہو گئی ہے حقیقت میں اِسکا سبب یہ ہے کہ قدرتِ کلام اُن کے ہر ایک نازک اور باریک خیال کو محاورہ اور ضرب المثل میں اس طرح ترکیب دیتی ہے جیسے آئینہ گر شیشہ کو قلعی سے ترکیب دیکر آئینہ بناتا ہے۔ اسی واسطے صاف ہر ایک شخص کی سمجھ میں آتا ہے اور دل پر اثر بھی کرتا ہے ٭

ہمیشہ فکرِ سخن میں غرق رہتے تھے۔ اور اپنے کلام کو آپ اُلٹ پلٹ کرتے تھے۔ یہی سبب ہے

کہ بعض اشعار دو دو تین تین چار چار طرح سُنے اور لکھے نظر آتے ہیں ✤
اُن کا کلام جس طرح دل کو بھلا معلوم ہوتا ہے اُسی طرح پڑھنے میں زبان کو مزا آتا ہے۔ انکے
لفظوں کی ترکیب میں ایک خداداد چستی ہے جو کلام میں زور پیدا کرتی ہے۔ وہ زور فقط
اُن کے دل کا جوش ہی نہیں ظاہر کرتا۔ بلکہ سُننے والے کے دل میں ایک خروش پیدا
کرتا ہے۔ اور یہی قدرتی رنگ ہے جو انکی کلام پر سودا کی تقلید کا پرتو ڈالتا ہے ✤
اِن کے دیوان کو جب نظر غور سے دیکھا جاتا ہے تو اُس سے رنگا رنگ کے زمزمے اور بوقلمون
آوازیں آتی ہیں۔ ہر رنگ کے انداز موجود ہیں یہی سبب ہے کہ اِن کے دیکھنے سے دل اکتا نہیں
جاتا۔ وہ لفظ لفظ کی نبض پہچانتے تھے۔ اور مضامین کے طبیب تھے جس طرح برجستہ بیٹھتا دیکھتے
تھے۔ اُسی طرح باندھ دیتے تھے۔ خیال بندی ہو یا عاشقانہ یا تصوف۔ ان کے سینہ میں
جو دل تھا گویا ایک آدمی کا دل نہ تھا۔ ہزاروں آدمیوں کے دل تھے۔ اِس واسطے کلام
ان کا مقناطیس کی طرح قبول عام کو کھینچتا ہے۔ دِل دِل کے خیال باندھتے۔ اور اِس طرح
باندھتے تھے گویا اپنے ہی دل پر گذری ہے ✤

شاگردوں کی غزل بڑی توجہ سے درست کرتے تھے۔ میں نے پوچھا کہ اور اُستاد اس قدر
زیادہ اصلاح نہیں دیتے۔ فرمایا کہ میری غزل پر اُستاد توجہ کم کرتے تھے۔ اکثر واپس بھی دیتے
تھے کہ دوبارہ دیکھو۔ طبیعت پر زور دیکر کہو۔ بعض شعر کاٹ دیتے تھے۔ مجھے رنج ہوتا تھا
اِس لئے شاگردوں کے کلام کا درد آتا ہے۔ اور کاوش سے درست کرتا ہوں ✤

اِس میں خوبی یہ تھی کہ شاگرد کا کلام اسکی حیثیت اور استعداد سے گھٹتے یا بڑھنے نہ پاتا تھا۔
اور کیفیت اسکی مشاعرہ کی غزلوں میں کھُلتی تھی مثلاً بادشاہ کی غزل بناتے تھے ولی عہد کی
غزل بھی بناتے تھے۔ اور جب جُدا جُدا دیکھو تو صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ بادشاہ کا کلام ہے

ولی عہد کا۔ اور ہر شاگرد کا کلام بعد اصلاح کے اپنے انداز پر تھا۔ ویران اپنی جگہ۔ داغ اپنی جگہ۔ اور اپنی غزل دیکھو تو سب سے الگ +

اعتراض

اِن کی کلام پر لوگ اعتراض بھی کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ ایک پُرانی غزل کا شعر ہے۔

سر بوقت ذبح اپنا اُس کے زیرِ پا ہے	یہ نصیب! اللہ اکبر لوٹنے کی جا ہے

لوگوں نے کہا کہ بے اضافی یا صفتی ترکیب کے اس میں ی زیادہ کرنی جائز نہیں۔ مگر یہ اعتراض ان کی کم نظری کے سبب سے تھے۔

درختے کہ اکنوں گرفت است پائے	بہ نیروے مردے برآید ز جائے
اے زدہ بر تراز گمان و امن کبک پائے را	دست بتو کجا رسد عقل شکار پائے را

ایک پُرانی غزل شاہ نصیر کے مشاعرہ میں طرح ہوئی تھی۔

دانہ خرمن ہے ہمیں قطرہ ہے دریا ہم کو	آئے ہے جُز میں نظر کُل کا تماشا ہم کو

اس پر اعتراض ہوا کہ اصل لفظ جزو مع واو کے ہے۔ فقط جز صحیح نہیں۔ اسکا بھی وہی حال تھا۔ امیر خسرو فرماتے ہیں +

ہر چہ کند در جزو در کل اثر	کلّی و جزئیش بود زاں خبر

اور میر تقی فرماتے ہیں۔

جز مرتبہ کل کو۔ حاصل کرے ہے آخر	ایک قطرہ نہ دیکھا جو۔ دریا نہ ہوا ہو گا

ایک دن میں امرج سے ملا اور استاد مرحوم کے مطلع کا ذکر آیا

مقابل اُس رُخِ روشن کے شمع گر ہو جائے	صبا وہ دھول لگائے کہ بس سحر ہو جائے

کئی دن کے بعد جو رستہ میں ملے تو دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے اور کہا۔

یہاں جو برگِ گلِ خورشید کا کھڑکا ہو جاوے	دھول دستارِ فلک پر گنے تڑکا ہو جاوے

اور کہا کہ دیکھا! محاورہ یوں باندھا کرتے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ یہ ملنسر کرتے ہیں کہ سحر ہو جائے۔ جو اُستاد نے باندھا ہے۔ یہ جائز نہیں مگر تجاہل کر کے میں نے کہا کہ ہاں حقیقت میں پاتھ کے کھڑکے کا آپ نے خوب ترجمہ کیا۔ اور استعارہ میں لا کر امیری طرف دیکھکر ہنسے اور کہا کہ بھئی واہ آخر شاگرد تھے۔ ہماری بات ہی بگاڑ دی ✤

دوسرے دن میں اُستادِ مرحوم کے خیمہ متیں گیا اور یہ اجرا بیان کیا۔ فرمایا کہ شمع کو صبح ہوتے ہاتھ مار کر بجھا دیتے ہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ شمع اگر مقابلہ کرے تو اُس گستاخی کی سزا میں صبا اُسے ایسی دھول مارے کہ وہ بجھ جائے اور ایسی بجھے کہ وہی اُس کے حق میں سحر ہو جائے یعنے روشنی نصیب نہو۔ کبھی دوسری تیسری رات ہوئی ہوئی۔ نہوئی نہوئی۔ وہ اور بات ہے۔ اب یہ ایک حسنِ اتفاق ہے کہ ہماری زبان میں اس کے مقابل ایک محاورہ بھی موجود ہے کہ۔ ایسی دھول لگی کہ تڑکا ہو گیا۔ خیر اگر ہوا تو کچھ لطف ہی پیدا ہوا۔ بلکہ طرزِ بیان میں ایک وسعت کا قدم آگے بڑھا۔ قباحت کیا ہوئی۔ اور یہ بھی دیکھو۔ وہ محاورہ تھا تو کیا تھا۔ مبتذل عامیانہ۔ اب ثقہ متین اور شریفانہ ہے ✤

آزاد۔ ایک شعر ناسخ کا بھی اسی ترکیب کا ہے ✤

جو شمشیر میں کبھی پھوٹتے پھلتے نہیں ✤	سبز ہوتے کھیت دیکھا ہے کہیں شمشیر کا

محاورہ میں تلوار کا کھیت کہتے ہیں۔ شمشیر کا کھیت نہیں ہے ✤

اُن کی ایک غزل کا شعر ہے۔

مُنہ اٹھائے ہوئے جاتا ہے کہاں تو کہ تجھے	ہے نیرا نقشِ قدم چشم نمائی کرتا ✤

نواب کلب حسین خاں نادر تخلص معلّے میں فرماتے ہیں (تجھے) دوسرے مصرع کا حق ہے۔ پہلے مصرع

ہیں نہیں لانا چاہیے۔ اِس کا جواب مجھے نہیں آتا ؂

نقل شاہ نصیر مرحوم کے ہاں سال بسال ایک عرس ہوا کرتا تھا اس میں بعد فاتحہ کے کھچڑی کھلایا کرتے تھے۔ ابھی نوجوانی کا عالم تھا حسب معمول استاد بھی گئے۔ فاتحہ کے بعد سب کھانا کھانے بیٹھے۔ شاہصاحب ایک ہاتھ میں چمچہ دوسرے میں ایک باریک پیسے ہوئے آئے اُسمیں دہی تھا۔ کہ خاص خاص اشخاص کے سامنے ڈالتے آتے تھے۔ اِن کے سامنے آکر کھڑے ہوئے اور چمچہ بھرا۔ انہیں تریش ہو رہی تھی۔ پرہیز کے خیال سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ شاہصاحب نے کہا سنکھیا ہے سنکھیا۔ کھاؤ گے تو مرجاؤ گے۔ اُستاد نے ہنس دیا۔

اور کہا کہ ع بھلا تم زہر دے دیکھو اثر ہو گے تو میں جانوں

مصرع میاں مجذوبؔ کا ہے۔ مگر کھانے کا موقع تھا اس لئے سب کو بہت مزا دیا ؂

ایک دن حسب معمول حضور میں گئے۔ مرزا شاہرخ ایک بیٹے حضور کے تھے اُنہوں نے اندنوں بہت سے کاروبار کی خدمتیں قبضہ میں لے رکھی تھیں اور اکثر حاضر رہا کرتے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی بولے کہ لیجئے وہ بھی آہی پہنچے معلوم ہوا کہ حضور کی ایک غزل ہے اُس کے ہر شعر میں ایک مصرع لگا کر شلث کرنا چاہتے ہیں۔ مگر ایجاد یہ ہے کہ مصرع جو لگے بموجب رواج قدیم کے اوپر نہ لگے۔ بلکہ ہر شعر کے نیچے ایک ایک مصرع لگے کہ جس سے گویا ہر بند میں ایک ایک مطلع پیدا ہوتا جائے۔ غرض بادشاہ نے وہ غزل انہیں دی کہ اُستاد اس پر مصرع لگا دو۔ انہوں نے قلم اُٹھا کر ایک شعر پر نظر کی۔ اور فوراً مصرع لگا دیا۔ اسی طرح دوسرے میں تیسرے میں سلسل غزل تمام کر کے جتنی دیر میں نظر ڈالی بے تامل ساتھ ہی مصرع لکھتے گئے اور اُسی وقت پڑھ کر سنائی۔ سب حیران ہو گئے۔ بلکہ مرزا شاہرخ نے کہا کہ اُستاد آپ گھر سے کہکر لائے

لہ مرزا رفیع سودا کے بیٹے کہلاتے تھے۔ شاید متبنے تھے ؂

تھے۔ بادشاہ بولے بھلا انہیں کیا خبر تھی کہ یہاں کیا ہوتا ہے ✤

نقل۔ برسات کا موسم تھا۔ بادشاہ بموجب معمول کے قطب صاحب میں تھے۔ مرزا فخرو بادشاہ کے صاحبزادے (کہ اخیر کو ولیعہد بھی ہو گئے تھے) شب مہتاب میں تلاؤ کے کنارہ چاندنی کی بہار دیکھ رہے تھے۔ اُستاد مرحوم پاس کھڑے تھے۔ اُنہیں بھی شعر کا شوق تھا اور شاگرد تھے۔ ان کی زبان سے یہ مصرع نکلا۔ ع

چاندنی دیکھے اگر وہ مہ جبیں تالاب پر	

اِن سے کہا کہ اُستاد اِس پر مصرع لگائیے گا۔ اِنہوں نے فوراً کہا۔ ع

عکس رخ کی تاب پانی پھیر دے مہتاب پر	

نواب جاں مدعلیخاں کے خسر نواب فضل علیخان سے اور شیخ مرحوم سے سابقہ محبت بھی تھا۔ اِس لئے نواب حامد علیخاں مرحوم بھی محبت و اخلاق سے ملا کرتے تھے۔ ایکدن دیوانِ خاص میں کھڑے ہوئے شعر سُنتے سُناتے تھے۔ نواب موصوف نے خواجہ وزیر کا مطلع پڑھا۔

جانور جو ترے صدقہ میں رہا ہوتا ہے	اے شہِ حُسن وہ چھٹتے ہی ہما ہوتا ہے

اُستاد مرحوم نے کہا کہ صدقہ میں اکثر کوّا چھڑواتے ہیں اِس لئے زیادہ مناسب ہے۔

زاغ بھی گر ترے صدقہ میں رہا ہوتا ہے	اے شہِ حُسن وہ چھٹتے ہی ہما ہوتا ہے[1]

بدیہہ فرماتے تھے کہ جوانی آغاز۔ اور میری بدیہہ گوئی پر نگاہیں پڑتی تھیں کہ ایکدن میر محمد خان اعظم الدولہ کے بالاخانہ کے نیچے سے میرا گذر ہوا۔ وہ پرانے شاعر تھے۔ اور سہ و تخلص کرتے تھے۔ مجھے دیکھکر آواز دی۔ میں گیا۔ بیٹھتے ہی فرمایش کی کہ تذکرہ ہم نے تمام کر دیا۔ اب اسکی تاریخ کہدو۔ میں نے کہا اچھا۔ فکر کروں گا۔ انہوں نے کہا فکر کرو گے

[1] ایسی بُت اصلاحیں روز ہو جاتی تھیں۔ لکھی جائیں تو ایک کتاب بن جائے ۱۲

کی سہی نہیں! بھی فکر کرو۔ اور کہدو نہ آتے تھے خدا کی قدرت! انکے خطاب کے خیال سے ہی وقت ذہن میں آیا۔ دریائے اعظم حساب کیا تو عدد برابر عجب خوشی دل کو ہوئی۔ میں نے جھٹ کہدیا۔ ہنسے اور کہا۔ پہلے سے کہ رکھی ہوگی۔ پھر کہا مصرع بھی لگادو۔ میں نے کہا کہ مصرع پھر انشاء اللہ۔ جو بات تھی وہ ہوگئی ✣

ایکدن معمولی دربار تھا۔ اُستاد بھی حاضر تھے۔ ایک مرشدزادے تشریف لائے۔ وہ شاید کسی اور مرشدزادے کی یا بیگمات میں سے کسی بیگم صاحب کی طرف سے کچھ عرض لیکر آئے تھے۔ اُنہوں نے آہستہ آہستہ بادشاہ سے کچھ کہا اور رخصت ہوئے۔ حکیم احسن اللہ خاں بھی موجود تھے۔ اُنہوں نے عرض کی صاحب عالم رسقدر جلدی؟ یہ آنا کیا تھا اور تشریف لیجانا کیا تھا صاحب عالم کی زبان سے اُس وقت نکلا کہ اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے۔ بادشاہ نے اُستاد کی طرف دیکھکر فرمایا کہ اُستاد! دیکھنا کیا صاف مصرع ہوا ہے اُستاد نے بے توقف عرض کی کہ حضور۔

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے۔	اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

یہ آواخر عمر کی غزل ہے۔ اِس کے دو تین ہی برس بعد انتقال ہوگیا ✣

ایکدن دربار سے آکر بیٹھے تھے جو میں پہنچا۔ افسردہ ہوکر کہنے لگے کہ آج عجیب ماجرا گذرا میں حضور میں گیا تو محل میں تھے وہیں بُلالیا۔ اور مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے۔ اُستاد آج مجھے ایک بات کا افسوس رہا۔ میں نے حال پُوچھا۔ کہا کہ وہ! جو قصیدہ تم نے ہمارے لئے کہا تھا اُسکے وہ! اشعار آج ہمیں یاد آگئے۔ اُن کے خیالات سے طبیعت کو عجب لُطف حاصل ہُوا مگر ساتھ ہی خیال آیا کہ اب تم یہ قصیدے ہمارے لئے کہتے ہو۔ ہم مرجائینگے تو جو تخت پر بیٹھے گا اُسکے لئے کہوگے۔ میں نے عرض کی کہ حضور کچھ مزید فرمائیں خیمہ پیچھے گرتا ہے میخیں اور طنابیں پہلے ہی اُکھڑ جاتی ہیں۔ ہم حضور سے پہلے ہی اُٹھ جائینگے! حضور

خیال فرمائیں کہ عرش آرام گاہ کے دربار کے لوگ حضور کے دربار میں کہاں تھے؟ فردوس منزل کے امرا ان کے عہد میں کہاں تھے۔ عرش منزل کے فردوس منزل کے دربار میں کہاں تھے۔ فردوس منزل کے امیر عرش آرامگاہ کے دربار میں کہاں تھے۔ عرش آرامگاہ کے امرا آج حضور کے دربار میں کہاں ہیں! بس یہی خیال فرمالیجئے۔ جو جس کے ہوتے ہیں وہ اسی کے ساتھ جاتے ہیں۔ نیا میر مجلس نئی ہی مجلس جماتا ہے اور اپنا سامانِ مجلس بھی اپنے ساتھ ہی لاتا ہے۔ یہ سن کر حضور بھی آبدیدہ ہوئے۔ میں بھی آبدیدہ ہوا مگر خیال مجھے یہ آیا کہ ہم ہمیشہ نماز کے بعد حضور کی سلامتی کی دعائیں مانگتے ہیں خدا شاہد ہے اپنا خیال اس طرح آج تک کبھی نہیں آیا حضور کو ہمارا خیال بھی نہیں۔ میاں! دنیا میں کوئی کسی کا نہیں ہے ؎

شیخ مرحوم ضعف جسمانی کے سبب سے اواخر عمر میں روزہ نہ رکھتے تھے۔ مگر اس پر بھی کسی کے سامنے کھاتے پیتے نہ تھے کبھی دوا یا شربت یا پانی بھی پینا ہوتا تو یا کوٹھے پر جاکر یا گھر میں جاکر پی آتے۔ ایک دفعہ میں نے پوچھا۔ کہا کہ میاں خدا کے گنہگار ہیں وہ عالم نہاں و آشکار کا ہے۔ اس کی تو شرم نہیں ہوسکتی بھلا بندے کی تو شرم رہے ؎

پھر ایک دفعہ رمضان کا مہینا تھا۔ گرمی کی شدت۔ عصر کا وقت۔ نوکر نے شربت نیلوفر کٹورے میں گھول کر کوٹھے پر تیار کیا۔ اور کہا کہ ذرا اوپر تشریف لے چلئے۔ چونکہ وہ اس وقت کچھ کھوئے سے تھے۔ مضمحلیت کے سبب سے نہ سمجھے اور سبب پوچھا۔ اس نے اشارہ کیا۔ فرمایا کہ لے آئیں۔ یہ ہمارے یار ہیں۔ ان سے کیا چھپانا جب اس نے کٹورا لاکر دیا تو یہ مطلع کہا۔ کہ فی البدیہہ واقع ہوا تھا۔

بلائے آشکارا ہم کسی کی ساقیا چوری	خدا کی جب نہیں چوری تو پھر بندے کی کیا چوری

تاریخ کی کمائی بھی سب بادشاہ کے حصہ میں آئی کیونکہ اکثر انہی کی فرمایش سے کہتے تھے۔ انہی کا تخلص سوتا تھا۔ نواب زینت محل بیگم۔ بادشاہ بیگم تھیں۔ اور کل انتظام سلطنت کی حاکم تھیں۔ انہوں نے

شہر میں یکمکان بنوایا تاریخ کیلئے بادشاہ سے عرض کی۔ انہوں نے دربار خلوت میں اُستاد سے فرمایا۔ بیگم بولیں کہ حضور اُستاد سے کہئے کہ آج تاریخ کہکر جائیں۔ اُستاد نے وہیں بیٹھے بیٹھے کہا

کردے ظفر زینت محل تعمیر قصر بے بدل	تاریخ گفتم بر محل۔ ایں خانہ زینت محل

ایسی ایسی تاریخیں سینکڑوں کہدیتے تھے۔ یاد کہاں! اور لکھے کون؟

والد مرحوم نے بنیتِ وقف امام باڑہ تعمیر کیا۔ ایکدن تشریف لائے۔ اُن سے تاریخ کے لئے کہا۔ اُسیوقت تامل کرکے کہا تعزیت گاہِ امامِ وارین پوری تاریخ ہے ✤

بلیچہ

حکیم میر فیض علی مرحوم طب میں انکے استاد تھے اور انہیں کا آپ علاج بھی کیا کرتے تھے۔ ایکدن میں بھی موجود تھا نوکر نے آکر کہا کہ آج میر فیض علی کا انتقال ہوا بار بار پوچھا اور ایسا اضطراب ہوا کہ اٹھکر ٹہلنے لگے۔ کچھ سوچکر دفعتہً بولے کہ ہائے میر فیض علی۔ مجھ سے کہا کہ دیکھو تو یہی تاریخ ہے؟ حساب کیا تو عدد برابر تھے۔ یوں تاریخیں سینکڑوں کہدیں۔ کہاں تک لکھوں! اور یاد کہاں؟

ایک شخص نے کہا کہ میرے دوست کا نام غلام علی ہے اور باپ کا نام غلام محمد ہے۔ اُس نے نہایت تاکید سے فرمایش لکھی ہے کہ حضرت سے ایسا سجع کہلوا دو کہ جس میں دونو نام آجائیں آپ نے سُنکر وعدہ کیا اور کہا کہ دو تین دن میں آپ آئیگا۔ انشاء اللہ ہو جاویگا۔ وہ رخصت ہوکر چلے۔ ڈیوڑی کے باہر نکلے ہونگے۔ جو نوکر سے کہا کہ محمد بخش بلانا نہیں۔ لینا لینا۔ خوب ہوا انکے تقاضے سے جلدی مخلصی ہوگئی۔ مجھ سے مخاطب ہوکر کہا۔

ع پدر غلام محمد پسر غلام علی

دیوان چندو لال نے ان کا کلام سُنکر مصرع طرح بھیجا اور بُلا بھیجا۔ آپ نے غزل کہکر بھیجی اور مقطع میں لکھا۔

آج کل گرچہ دکن میں ہے بڑی قدرِ سخن	کون جائے ذوق پر دلّی کی گلیاں چھوڑ کر

اُنھوں نے خلعت اور پانسو روپے بھیجے مگر یہ نہ گئے۔ ایکدن مَیں نے نہ جانیکا سبب پوچھا فرمایا۔

نقل۔ کوئی مسافر دلّی میں مہینہ بیس دن رہکر چلا۔ یہاں ایک کتا ہل گیا تھا۔ وہ وفا کا مارا ساتھ ہولیا۔ شاہدرہ پہنچکر دلّی یاد آئی اور رہگیا۔ وہاں کے کتوں کو دیکھا گردنیں فربہ۔ بدن طیار چکنی چکنی پشم۔ ایک کتّا انہیں دیکھکر خوش ہوا اور دلّی کا سمجھکر بہت خاطر کی دلمائیوں کے بازار میں لے گیا حلوائی کی دُکان سے ایک بالو شاہی اوٹاکر سامنے رکھا بھٹیارہ کی دکان سے ایک کلّہ جھپٹا۔ یہ ضیافتیں کھاتے اور دلّی کی باتیں سُناتے رہے تیسرے دن رخصت مانگی اُس نے روکا۔ انہوں نے دلّی کے سیر تماشے اور خوبیوں کے ذکر کئے۔ آخر چلے اور دوست کو بھی دلّی آنے کی تاکید کرآئے۔ اُسے بھی خیال رہا اور ایکدن دلّی کا رخ کیا۔ پہلے ہی مرگھٹ کے کُتّے مردار خوار۔ خونی آنکھیں۔ کالے کالے مُنہ نظر آئے۔ یہ اُترنے بھرتے نکلے۔ دریا بلا دیر تک کنارہ پر پہنچے۔ آخر کود پڑے۔ مگرمچھ کرپا پہنچے شام ہوگئی تھی۔ شہر میں گلی کوچوں کے کتوں سے بچ بچاکر ڈیڑھ پہر رات گئی تھی جو دوست سے ملاقات ہوئی۔ یہ بیچارے اپنی حالت پر شرمائے۔ بظاہر خوش ہوئے اور کہا اوہو اِس وقت تم کہاں؟ دل میں کہتے تھے کہ رات نے پردہ رکھا۔ ورنہ دن کو یہاں کیا دھرا تھا۔ اُسے لیکر اِدھر اُدھر پھرنے لگے۔ یہ چاندنی چوک ہے۔ یہ دریبہ ہے۔ یہ جامع مسجد ہے۔ مہمان نے کہا۔ یار بھوک کے مارے جان نکلی جاتی ہے۔ سیر ہو جائیگی کچھ کھلواؤ تو سہی۔ انہوں نے کہا عجب وقت تم آئے ہو اب کیا کروں۔ بارے جامع مسجد کی سیڑھیوں پر جانی کبابی مرچوں کی ہانڈی بھول گئے تھے۔ انہوں نے کہا۔ لو یار بڑی قسمت والے ہو۔ وہ دِن بھر کا بھوکا تھا مُنہ پھاڑ کر گرا۔ اور ساتھ ہی مُنہ سے مغز تک گویا روٹ اُڑ گئی چھینک کر پیچھے ہٹا۔ اور جل کر کہا واہ یہی دلّی! انہوں نے کہا۔ اس چٹخارے ہی کے مارے

تو پڑے ہیں ✤

لطیفہ۔ مرزا فخرو شاہزادے اواخر سلطنت میں ولی عہدی کے حقدار ہوئے تھے وہ بھی استاد سے اصلاح لیتے تھے۔ شہر میں چھوٹی بیگم نام ایک حسین صاحب جمال اپنے ہنر کی باکمال تھیں۔ عمر کی دوپہر ڈھل چکی تھی۔ اور کتنے ہی امیر زنکو مار کر ہضم کر چکی تھیں۔ اسپر بھی لڑکپن کی کلیاں پنتی تھیں۔ مرزا فخرو کی ۲۴-۲۵ برس کی عمر تھی۔ رنڈی کو نوکر رکھکر غلام ہوگئے۔ مرزا نے ایکدن اُستاد کو بُلا بھیجا۔ یہ گئے۔ اُنہوں نے غزل عنایت کی اور کہا کہ اُستاد اسے یہیں اصلاح دیدیجئے۔ اُستاد غزل بنانے لگے۔ مرزا نے ایک تصویر صندوقچہ میں سے نکالی۔ اُسے دیکھا اور کہا کہ اُستاد ذرا اسے دیکھئے۔ اُستاد سمجھ گئے کہ اُسی کی تصویر ہے۔ دیکھکر کہا۔ بہت خوب۔ مرزا کیخاطر جمع نہوئی۔ پھر کہا دیکھئے تو سہی۔ اگر واقعی ایسا معشوق ہو تو کیسا ہو۔ اُستاد سمجھے کہ دل آیا ہوا ہے۔ چاہتا ہے کہ میں بھی بڑھیا کی تعریف کروں۔ پھر بھی اتنا کہا کہ خوب! بہت خوب! اُن سے پھر بھی نہ رہا گیا۔ تیسری دفعہ تصویر ہاتھ میں دی اور کہا بھلا استاد اس حسن میں کچھ نقص تو بتائیے۔ اُستاد دیکھا۔ اور کہا ذرا چھاتیاں ڈھلکی ہوئی ہیں۔ اُستاد خود فرماتے تھے کہ میں نہ کہتا۔ مگر دل نے کہا۔ لڑکا ہے۔ اور ایک بیوا کے دام میں پھنس گیا ہے۔ کہ تو دو۔ شاید سمجھ جائے۔ میں اُستاد سے پوچھا۔ حضرت! پھر مرزا نے کیا کہا۔ فرمایا۔ پہلو میں رکھ لی۔ میں نے کہا۔ بارے اُس بات کا کچھ جواب دیا۔ فرمایا۔ کہتے کیا؟ پی گئے ✤

لطیفہ۔ دلی میں ایک شریف خاندانی خوش اخلاق خوش مزاج تھے۔ اُنکا قاعدہ تھا کہ نوکر کے پاس خاصدان میں ہر وقت چند گلوریاں رکھتے تھے۔ جہاں جاتے یا راہ میں کوئی دوست ملتا۔ مزاج پرسی کے بعد اُسے ایک گلوری بھی دیتے تھے۔ اور اسی واسطے **میر گلوری** مشہور تھے۔ اُنہوں نے بیٹے کی ختنہ کی۔ اور بعد غسل صحت کے تمام احباب کو بلا کر کھانا کھلایا۔ جلسۂ ضیافت

میاں عنایت افزوں خواجہ سرا کے مکان میں تھا۔ استاد مرحوم بھی گئے۔ کھانا کھا کر دوسرے
مکان میں آ بیٹھے۔ چند بزرگ اور بھی موجود تھے کہ اتنے میں میر گلوری صاحب آئے سینی میں
ایک شخص گلوریاں لئے ساتھ۔ اپنے ہاتھ سے سب کو گلوریاں دیں ✤
حکیم آغا جان عیش استاد سے باتیں کر رہے تھے۔ میر صاحب نے گلوری لے کر کہا۔ آج تو دوست نے
سے گلوریاں کھلانی واجب تھیں۔ استاد نے کہا۔ ہاں ضیافت تو سنت ہی تھی حکیم صاحب
ہنسے اور کہا حضرت! میر صاحب کی ظرافت کے نکتے کوئی کہاں تک پائے۔ خیر کی ضیافت
کی خواجہ سرا کے مکان میں کھانا کھلایا۔ استاد نے کہا ظرافت پر ظرافت یہ کہ کھلایا بھی
خصی پلاؤ ✤
عادت تھی کہ سات آٹھ بجے مکان ضرور جاتے تھے اور تین چار چلمیں حقہ کی وہاں پیتے تھے۔ بیس پچیس
کے دن سوقت جایا کرتا تھا۔ اور دن بھر وہیں رہتا تھا۔ مکان ضرور ڈیوڑھی پر
آہٹ پہچانتے تھے۔ پوچھتے کہ تم ہو؟ میں تسلیم عرض کرتا۔ چھوٹا
چارپائی۔ وہیں بیٹھ جاتا۔ فرماتے۔ اجی ہمارا وہ شعر
پڑھتے۔ میں سارا شعر عرض کرتا۔ فرماتے۔ ہاں اب اسے
پائنخانے سے نکلے۔ فرمایا کہ لوجی ۳۲ برس کے بعد
کہا حضرت کیونکر؟ فرمایا

ابتدائی مشق
تھا۔ آ

لہ خفہ

کھاتی ہے تین تین بل ایک گدگدی کے ساتھ

کمر کو اوپر ڈالدو۔ عرض کی پھر وہ کیونکر ۳ ۳ مصرع الٹ پلٹ کئے تھے۔ ایک اس وقت خیال میں ہے۔

بل بے کمر کہ زلفِ مسلسل کے پیچ میں ❊		کھاتی ہے تین تین بل ایک گدگدی کے ساتھ

کالی دروازہ پاس ہی مکان تھا۔ شام کو باہر نکلکر گھنٹوں ٹہلتے تھے۔ میں اکثر ساتھ ہوتا تھا۔ عیادت کتابی۔ خیالاتِ علمی افادہ فرماتے۔ شعر کہتے۔ ایکدن بادشاہ کی غزل کہہ رہے تھے۔ تیر ہمیشہ تصویر ہمیشہ۔ سوچتے سوچتے کہنے لگے تم بھی تو کچھ کہو۔ میں نے کہا کیا عرض کروں۔ فرمایا۔ میاں! اسی طرح آتا ہے۔ ہوں ہاں۔ نعوں غاں کچھ تو کہو۔ کوئی مصرع ہی سہی میں نے کہا۔ ع

سینہ سے لگائے تری تصویر ہمیشہ

فرمانا تامل کرکے کہا۔ ہاں درست ہے ؎

ہاتھ تو کیا چین سے رہئے		سینہ سے لگائے تری تصویر ہمیشہ

اس مقام میں گذر ہوتا ہے تو آنسو نکل پڑتے ہیں ❊

ہمارے مگر ٹال گئے مضمون آنہ سکا مطلع انہوں نے ندیا۔

ہے		ایک طرح مچھلیاں دو کشمکش آپس میں ہاتھ ہے

شاہ نصیر کی اصلاحی ہیں۔ کچھ میر کا قلم حسین بیقرار

حضرت مرحوم کے ہیں جن

یا ہے کہ دل گفتہ

تا ہے مگر تم

ع۔ کوئی

ہا پر

گوشت پوست چڑھا کر حسن عشق کی پتلیاں بادیتے تھے۔ ایجادی فرمائشوں کی حد نہ تھی چند شعر اُس غزل کے لکھتا ہوں جسکے ہر شعر کے نیچے مصرع لگایا ہے۔

یا تو افسر مرا شاہانہ بنایا ہوتا | یا مرا تاج گدایانہ بنایا ہوتا
ورنہ ایسا جو بنایا۔ نہ بنایا ہوتا

نشۂ عشق کا گر ذوق دیا تھا مجکو | عمر کا تنگ نہ پیمانہ بنایا ہوتا
دل کو میرے خم و خمخانہ بنایا ہوتا

اس خرد نے مجھے سرگشتہ و حیران کیا | کیوں خردمند بنایا نہ بنایا ہوتا
تو نے اپنا مجھے دیوانہ بنایا ہوتا

روز معمورۂ دنیا میں خرابی ہے ظفر | ایسی بستی سے تو ویرانہ بنایا ہوتا
بلکہ بہتر تو یہی تھا نہ بنایا ہوتا۔

ایک بڈھا چورن مرچن کی پڑیاں بیچتا پھرتا تھا اور آواز دیتا تھا ترے من چلیکا سودا ہے کھٹا اور میٹھا۔ حضور نے سُنا۔ ایجاد مصرع اسپر لگا کر اُستاد کو بھیجدئے۔ انہوں نے دس دوہرے لگا دئے۔ حضور میں کنچنیاں ملازم تھیں۔ انہوں نے یاد کر لئے۔ دوسرے دن بچہ بچہ کی زبان پر یہی گیت تھا۔ دو بند یاد رہ گئے ؎

لے ترے من چلے کا سودا ہے کھٹا اور میٹھا

کنجڑے کی سی ہاٹ ہے دنیا جنس ہے ساری کھٹی | میٹھی چاہے میٹھی لے لے کھٹی چاہے کھٹی
لے ترے من چلے کا سودا ہے کھٹا اور میٹھا

روپ رنگ پر بھول نہ دلیں دیکھ عقل کے بیری | اوپر میٹھی نیچے کھٹی۔ انبوا کی سی گیری
لے ترے من چلے کا سودا ہے کھٹا اور میٹھا

ایک فقیر صدا کہتا پھرتا تھا۔ کچھ راہ خدا دیجا۔ جاتر ابھلا ہوگا۔ حضور کو پسند آئی۔ اِن سے کہا انہوں نے بارہ دوہے اُسپر لگا دئیے۔ مدتوں تک گھر گھر سے یہی گانے کی آواز آتی تھی۔ اور گلی گلی لوگ گاتے پھرتے تھے۔ (حافظ ویران کو خدا سلامت رکھے اِنہی نے یہ شعر بھی لکھوائے) ؎

کچھ راہِ خدا دیجا۔ جاتر ابھلا ہوگا	
محتاج خراباتی ہے یا پاک نمازی ہے	کچھ کرنہ نظر اسپر۔ واں نکتہ نوازی ہے
کچھ راہِ خدا دیجا۔ جاتر ابھلا ہوگا	
دنیا ہے سرا اس میں تو بیٹھا مسافر ہے	اور جانتا ہے یہاں سے جانا تجھے آخر ہے
کچھ راہِ خدا دیجا۔ جاتر ابھلا ہوگا	
جو رب نے دیا تجھ کو۔ تو نام پہ رب کے دے	گر یہاں نہ دیا تو نے۔ واں دیوگا کیا بندے
کچھ راہِ خدا دیجا۔ جاتر ابھلا ہوگا	
دنیا کے کیا کرتا ہے سو ٹکڑوں تو دھندے	پر کام خدا بھی کرے کوئی بندے
کچھ راہِ خدا دیجا۔ جاتر ابھلا ہوگا	
دیگا اُسی کو تو۔ وُہ جس کو ہے دلواتا	پر ہے یہ ظفر تجھ کو۔ آواز سُنا جاتا
کچھ راہِ خدا دیجا۔ جاتر ابھلا ہوگا	

اس طرح کی ہزاروں چیزیں تھیں۔ ٹپّے ٹھمریاں پہیلیاں سیٹھنیاں۔ کیا کیا لکھوں؟

ایک دِن ٹہل رہے تھے۔ حافظ ویران ساتھ تھے۔ بہ تقاضائے استنجا بیٹھ گئے۔ اور وقت معین سے زیادہ دیر ہوئی۔ اُنہوں نے قریب جاکر خیال کیا تو کچھ گُنگُنا رہے ہیں۔ اور پٹکی سے جوتی پر کھٹ کھٹ کرتے جاتے ہیں۔ پوچھا کہ ابھی آپ فارغ نہیں ہوئے؟ فرمایا کہ حضور نے چلتے ہوئے ایک ٹھمری کے دو تین انترے سُنائے تھے کہ اسے پورا کر دینا۔ اِس وقت اُس کا خیال آگیا۔ پوچھا

کہ جوتی آپ پر چلکی کیوں مارتے تھے؟ فرمایا کہ دیکھتا تھا اس کے نعل ٹال پر ٹھیک بیٹھتے ہیں یا نہیں ✤

حافظ دیران کہتے ہیں ایکدن عجب تماشا ہوا۔ آپ بادشاہ کی غزل کہہ رہے تھے مطلع ہوا کہ

ابرو کی اُس کے بات ذرا چل کے تھم گئی	تلوار آج ماہ نقا چل کے تھم گئی

دو تین شعر ہوئے تھے کہ خلیفہ اسمٰعیل دربار سے پھر کر آئے اور کہا کہ اس وقت عجب معرکہ دیکھا استاد مرحوم متوجہ ہوئے انہوں نے کہا کہ جب میں بھوانی شنکر کے چھتے کے پاس پہنچا۔ تو کھاری باولی کے رُخ پر دیکھا کہ دو تین آدمی کھڑے ہیں اور آپس میں تکرار کر رہے ہیں باتوں باتوں میں ایسی بگڑی کہ تلوار کھنچ گئی اور دو تین آدمی زخمی بھی ہوئے۔ یہاں چونکہ غزل کے شعر حافظ دیران سُن رہے تھے ہنسکر بولے کہ حضرت آپ کیا وہاں موجود تھے آہستہ سے فرمایا کہ یہیں بیٹھے بیٹھے سب کچھ ہو جاتا ہے۔ اس سے میرا مطلب نہیں کہ انہیں کرامات تھی یا وہ غیب داں تھے۔ ایک حُسنِ اتفاق تھا اہل ذوق کے لطفِ طبع کیلئے لکھدیا۔ اس سے بڑھکر یہ ہے کہ ایکدن حضور میں غزل ہوئی جسکا مطلع تھا۔

آج ابرو کی تیرے تصویر کچھ کر رہ گئی	سنتے ہیں بھوپال میں شمشیر کچھ کر رہ گئی

پھر معلوم ہوا کہ اسی دن بھوپال میں تلوار چلی تھی۔ ایسے معاملے کتب تاریخ اور تذکروں میں اکثر منقول ہیں طول کلام کے خیال سے قلم انداز کرتا ہوں ✤

ایکدفعہ دوپہر کا وقت تھا۔ باتیں کرتے کرتے سو گئے۔ آنکھ کھلی تو فرمایا کہ ابھی خواب میں دیکھا کہیں آگ لگی ہے۔ اتنے میں خلیفہ صاحب آئے اور کہا کہ پیر بخش سوداگر کی کوٹھی میں آگ لگ گئی تھی۔ بڑی خیر ہوئی کچھ نقصان نہیں ہوا ✤

ایک شب والد مرحوم کے پاس آ کر بیٹھے۔ کہا کہ بادشاہ کی غزل کہنی ہے لاؤ یہیں کہہ لیں کئی فرمائشوں میں سے یہ طرح کہنی شروع کی۔ مجھ سے کیا ہے صورت کیا ہے مصیبت کیا ہے۔ میں نے کہا کہ نہیں سکوت کر کے فرمایا۔ کہنے والے کہتے ہیں پھر یہ دو مطلع پڑھے

(سودا) نہ بھولے آرسی گر یار کو تجھ سے محبت ہے	نہیں ہے اعتبار اسکا مگر دیکھے کی اُلفت ہے
(میر) بگولے جس بیاباں میں سر پٹکتے ہیں بہ وحشت سے	ہماری خاک یوں برباد ہوئے ابر رحمت ہے

اتفاق فرماتے تھے کہ ایکدن بادشاہ نے غزل کا مسودہ دیا اور فرمایا کہ ایسی ہی درست کر کے دیجانا موسم برسات کا تھا۔ ابر آرہا تھا۔ دریا چڑھا ہوا تھا میں دیوان خاص میں جا کر اُسی رُخ پر ایکطرف بیٹھ گیا۔ اور غزل لکھنے لگا تھوڑی دیر کے بعد پاؤں کی آہٹ معلوم ہوئی۔ دیکھا تو پشت پر ایک صاحب دانائے فرنگ کھڑے ہیں۔ مجھ سے کہا آپ کیا لکھتا ہے؟ میں نے کہا غزل ہے۔ پوچھا آپ کون ہے؟ میں نے کہا کہ نظم میں حضور کی دعا گوئی کیا کرتا ہوں۔ فرمایا کس زبان میں؟ میں نے کہا اردو میں۔ پوچھا۔ آپ کیا کیا زبانیں جانتا ہے؟ میں نے کہا فارسی عربی بھی جانتا ہوں۔ فرمایا اُن زبانوں میں بھی کہتا ہے؟ میں نے کہا کوئی خاص موقع ہو تو اسمیں بھی کہنا پڑتا ہے ورنہ اُردو ہی میں کہتا ہوں کہ یہ میری اپنی زبان ہے۔ جو کچھ انسان اپنی زبان میں کر سکتا ہے غیر کی زبان میں نہیں کر سکتا۔ پوچھا۔ آپ انگریزی جانتا ہے؟ میں نے کہا نہیں۔ فرمایا کیوں نہیں پڑھا؟ میں نے کہا کہ ہمارا لب و لہجہ اُس سے موافق نہیں وہ ہمیں آتی نہیں ہے۔ صاحب نے کہا وَل یہ کیا بات ہے۔ دیکھئے ہم آپکی زبان بولتے ہیں۔ میں نے کہا پختہ سالی میں غیر زبان نہیں آسکتی بہت مشکل معاملہ ہے۔ انہوں نے پھر کہا کہ وَل ہم آپ کی تین زبان ہندوستان میں آکر سیکھا۔ آپکا ایک زبان نہیں سیکھ سکتے۔ یہ کیا بات ہے؟ اور تقریر کو طول دیا۔ میں نے کہا۔ صاحب ہم زبان کا سیکھنا اسے کہتے ہیں کہ اُسمیں بات چیت ہر قسم کی تحریر تقریر اس طرح طرح خود اہل زبان کرتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں۔ ام آپ کا تین زبان سیکھ لیا مان ہے اور کیا سیکھنا ہے۔ اِسے زبان کا سیکھنا اور بولنا نہیں کہتے اِسے ب کرنا کہتے ہیں ✣

اللھم تمم بالخیر

ردیف الالف

ہوا حمد خدا میں دل جو مصروف رقم میرا
الف الحمد کا سا بن گیا گویا قلم میرا

رہے نام محمد لب پہ یارب اول و آخر
اُلٹ جائے بوقت نزع جب سینہ میں دم میرا

محبت اہلبیت مصطفےٰ کی نور برحق ہے
کہ روشن ہوگیا دل مثل قندیل حرم میرا

دکھائی مجھ کو راہ شرع اصحاب پیمبر نے
چراغ راہ ہے اکرام اصحاب کرم میرا

کہیں شاہ نجف کے عشق میں دل میرا ڈوبا تھا
کہ ہے در نجف ہو کر چمکتا دُرّ یتیم میرا

رہیگا دانہ افشاں مزرع امید بخشش میں
غم آل نبی سے دانہ ہر اشک نم میرا

شہ بغداد کا خط غلامی ذوق رکھتا ہوں
نہ کیوں دل اس خط بغداد سے ہو جام جم میرا

ہوا یہ سینہ یکسر خار زار دشت غم میرا
کہ آبلہ پا بجوں آغشتہ ہو کر لب پہ دم میرا

صراط عشق پر از بسکہ ہے ثابت قدم میرا
دم شمشیر قاتل پر بھی خوں جاتا ہے جم میرا

مری خواری کے رتبہ کا کمال اوج تو دیکھو
کہ ہے چرخ زحل بھی سایہ بخت دژم میرا

وہ ہوں میں آتشیں گل تازہ نخل شمع الفت کا
نہیں ہے کوئی گلچیں غیر مقراض ستم میرا

نشان بے نشانی گرد کھائے زور مٹ جائے
جھپک سے دیدہ صراف کی نقش درم میرا

رواں ریگ رواں ہے جائے آب اشک مژگاں سے
کہ دورت بارہے دیکھو سحاب پر نج و غم میرا

وہ ہوں میں آہوے وحشی رمیدہ دام ہستی سے
کہے ایک کو چہ رم جادہ دشت عدم میرا

جھپکتی آنکھ شب جوں حلقہ زنجیر کیا مری
طلسم خواب بندی تھا سر زلف الم میرا

کہوں میں ہو دہن سے حرف قطع آنسوئے دل
لب ہر زخم پر ہے جوں لب شمشیر دم میرا

مری فسردہ حالی گر ہو جنس آرائے دل سردی
عجب کیا شیر برفیں ہو اگر شیر علم میرا

پھپولا کام افعی میں ہے، وہاں اب تک جہاں ٹپکا
قضا کے جام سے یک قطرہ زہر اب کم میرا

ہوا روشن چراغ کعبہ زاہد جس کے شعلے سے
اُسی آتش کا رکھتا ہے شرر سنگ صنم میرا

نہو بے وقر ترک سجدۂ ابلیس سے آدم +
عدو کی سرکشی سے رتبہ کب ہوتا ہے کم میرا

وہ ہوں میں گیسوئے موج محیط اعظم وحشت
کہ ہے گھیرے پڑے رونے زمیں کو پیچ خم میرا

مری صورت کے معنے ہیں نفخت فیہ من روحی
حدوث بے ثبات اثبات کرتا ہے قدم میرا

وہ ہوں میں رہ نورد شوق میرے ساتھ جاتا ہے
بزنگ سایہ مرغ ہوا نقش قدم میرا

تخیل نے مرے باندھا طلسم تازہ کیفیت +
نہ کیوں ہو کاسہ سر ذوق رشک جام جم میرا

لکھنو سے شیخ ناسخ کی غزل اس طرح میں آئی۔ شہر میں چرچا ہوا کہ ان شعروں پر شعر نہیں ہو سکتے۔ شاہ نصیر مرحوم استاد وقت تھے۔ اُن کی صحبت میں بھی یہ باتیں پہنچیں۔ اُستاد مرحوم کی اصلاح بند ہو چکی تھی۔ مگر آداب شاگردانہ کی آمد و رفت جاری تھی۔ یہ ان کی خدمت میں گئے۔ انہوں نے فرمایا کہ میاں ابراہیم تم نے بھی وہ غزل دیکھی یہ لوگ کیا کہتے ہیں؟ عرض کی حضرت سنتا ہوں۔ ایسی تو نہیں جیسی لوگ کہتے ہیں۔ فرمایا۔ پھر تم نہیں کہتے؟ کہا۔ جو ارشاد ہو۔ اُنہوں نے فرمایا کہ ہم بھی کہینگے۔ تم کیوں نہیں کہتے۔ دیکھو تو وہ کیا کہتے ہیں جبھی اُستاد نے یہ غزل کہی تھی۔ وہ غزلیں پھر لکھنو گئیں۔ وہاں بھی تعریفیں ہوئیں +

شوق نظارہ ہے جب سے اُس رخ پر نور کا
ہے میرا مرغ نظر پروانہ شمع طور کا

اے صنم کیا پوچھتا ہے حال اس رنجور کا
دل نہ اٹکائے کہیں اللہ بے مقدور کا

گر لکھوں مضمون اپنے نالہ پر شور کا
لوں صریر خامہ سے میں کام بانگ صور کا

لطف جاتا ہے سرودِ نالۂ پرشور کا
خونِ دل پنپا ہے یہ کھانا مجھے سیندور کا

نزع میں بھی دھیان تھا اس نرگسِ مخمور کا
مجھ کو شربت میں مزا آیا مئے انگور کا

وادیٔ ظلمت میں اپنی دخل کب ہے نور کا
مہر ایک شعلہ سا ہے سو بھی چراغِ دور کا

تیرے کوچہ میں تن لاغر تیرے رنجور کا
ایک غبارِ ناتواں ہے کاروانِ مور کا

باندھوں میں مضموں جو اپنی شوخیِ تحریر کا
ہو زمینِ شعر میں عالم زمینِ شور کا

میں وہ ہوں نخچیر جسکو دیکھتا ہے وقتِ ذبح
دیدۂ حسرت سے حلقہ جوہرِ ساطور کا

اس نزاکت پر نظر کرنا کہ وہ رشکِ پری
بال بھی باندھے جو مستی پر تو زلفِ حور کا

دل کا یہ احوال ہے غم سے تیرے اے مستِ ناز
جیسے مرجھایا ہوا دانا کوئی انگور کا

تفتہ دل وہ ہوں کہ آکر داغِ سوزاں پر مرے
اڑ گیا مرہم کے پھاہے سے اثر کافور کا

گر تیرے فریادیوں کے نامۂ پیچیدہ کو
لب پہ رکھکر پھونکئے پیدا ہو نالہ صور کا

حق تو یوں - ہے یہ امانت عجب غماز ہے
قصہ پہنچایا زبانِ دار پر منصور کا

عشق کے مکتب میں ہو فرہاد سب سے تیز ذہن
تین دن چاٹے اگر تعویذ میری گور کا

زخم میرا ہے وہ ایذا دوست خوں رونے لگے
منہ سے گر جراح کے سن پائے نام انگور کا

جھانکتے تھے وہ ہمیں جس روزنِ دیوار سے
واے قسمت ہو اسی روزن میں گھر زنبور کا

دفن ہے جسپا پہ کشتہ سرد مہری کا تیری
مثل ہوتا ہے پیدا واں شجر کافور کا

تو ہو بعد از مرگ بھی گر اے محبت دستگیر
استخواں سے ہو میری دستہ تیرے ساطور کا

عشق نے ڈالی تھی جب قصرِ محبت کی بنا
لکھ دیا تھا کوہ کن بھی نام ایک مزدور کا

بلبے وحشت ابتک بھی شاخِ آہو کی طرح
پیچ کھاتا ہے دھواں میری دماغِ گور کا

دیکھنا ہر آب پیکانِ محبت کا اثر
چشمِ افعی نگہبانِ دہن ہر اژدہا سے

نسخہ دلی میں کتابت کی غلطی سے مرزا کے جہاں ہے

کھینچے مانی اُس پری کی کیونکر تصویر کفک
جمع ہو جبتک نہ رنگ سُرخ روئے حور کا

تیرے قامت سے جو ہو بر پا قیامت پر پر
کام لے منقار سے فیذ و قمری صور کا

ذوق راہ عشق وہ کوچہ ہے جسکی خاک میں
ہے دُر تاج سلیماں بیضہ بیضہ مور کا

لکھئے اُسے خط میں کہ ستم اُٹھ نہیں سکتا ۔
پر ضعف سے ہاتھوں میں قلم اُٹھ نہیں سکتا

بیمار ترا صورت تصویر نہ ہالی ۔
کیا اٹھے سر بستر غم اُٹھ نہیں سکتا

آتی ہے صدائے جرس ناقہ لیلی ۔
پر حیف کہ مجنوں کا قدم اُٹھ نہیں سکتا

جوں دانۂ روئیدہ تہ خاک ہمارا
سر زیر گراں بار الم اُٹھ نہیں سکتا

ہر داغ معاصی میرا اُس دامن تر سے
جوں حرف سر کاغذ نم اُٹھ نہیں سکتا

اتنا ہوں تیری تیغ کا شرمندۂ احساں
سر میرا تیرے سر کی قسم اُٹھ نہیں سکتا ۔

پردہ در کعبہ سے اُٹھانا تو ہے آساں
پر پردۂ رخسار صنم اُٹھ نہیں سکتا

کیوں اتنا گراں بار ہے جو زاد سفر بھی
اے راہ رو ملک عدم اُٹھ نہیں سکتا

دنیا کا زر و مال کیا جمع تو کیا ذوق +
کچھ فائدہ بے دست کرم اُٹھ نہیں سکتا +

نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا
پل بنا چاہ بنا مسجد و تالاب بنا

واہ ۔ کیا مرہم زخم دل بیتاب بنا
آب ہے نشتر سر تیز کے تیزاب بنا

نہ بجھے اشک کے دریا سے مری سوزش دل
گرچہ دے شعلہ جوالہ کو گرداب بنا

دل بیتاب کو ہم سینہ میں ٹھہرا نہ سکے
شعلہ خو ۔ دیکھتے ہی تجھ کو وہ سیماب بنا

جھیر گر مجھ سے مئے عشق ہوئی کب ہے تلخ
کہوں جس دن سے فلک کاسۂ زہراب بنا

چشمِ مخمور کا ہوں کس کی میں کشتہ یارب
کہ مری خاک سے بھی جام مئے ناب بنا

تیرہ روزی نے مری مہر جہانتاب کا نور
جب اڑایا تو وہیں کرمکِ شب تاب بنا

کاہے پھٹتا ہوں کیوں اُس سے کیا میں نے بگاڑ
کہ جو اب پھرتا ہوں اس طرح سے بیتاب بنا

سرمہ چشمِ عزیزاں نہ بنا میں اے چرخ
کیا بنا خاک۔ غبار دلِ احباب بنا

آیت سجدہ ہے حق میں مرے ہر جوہر تیغ
ہے خم تیغ فقط کیا خم محراب بنا

خال عارض ہے جو ہندو ئے خدا ترس تو کیا
ہم سیہ بختوں کے حق میں تو ہے قصاب بنا

اپنے جلسوں میں جلاتے ہیں مجھے مرثیہ گو
میں ہوں ایک شمع پئے محفل احباب بنا

تو اگر آپ کو دیکھے تو مری آنکھ سے دیکھ
اپنا آئینہ مرا دیدۂ پر آب بنا

آہ کے ساتھ جو نکلا شرر آتش دل
چرخ پر جا کے وہ خورشید جہانتاب بنا

جب کیا عشق کے دریا نے تلاطم اے ذوق
تو کہیں موج بنا اور کہیں گرداب بنا

اُسے ہم نے بہت ڈھونڈا نہ پایا
اگر پایا۔ تو کھوج اپنا نہ پایا

جس انساں کو سگِ دنیا نہ پایا
فرشتہ اُسکا ہمپایہ نہ پایا

مقدر ہے یہ گر سود و زیاں سے
تو ہم نے یہاں کچھ کھویا۔ نہ پایا

لحد میں بھی ترے مضطر نے آرام
خدا جانے کہ پایا یا نہ پایا

کیا تھا یا نہ تھا سب ہم پہ گذرا
فلک تو نے کیا اپنا نہ پایا

سراغ عمر رفتہ ہاتھ کیا آئے
کہیں جس کا نشانِ پا نہ پایا

کرے کیا سیر دل ملک فنا کی
کہ اس بازار میں سودا نہ پایا

رہِ گم گشتگی میں ہم نے اپنا
غبارِ راہ بھی عنقا نہ پایا

رہا ٹیڑھا مثالِ نیش کر دم — کبھی کج فہم کو سیدھا نہ پایا
نہ خنجر ترے بسمل نے ہے ہے — ذرا تابِ تڑپنے کا نہ پایا
ترے مجنوں کی تربت پر جنوں نے — بگولے کے سوا سایہ نہ پایا
فلک کے گنبدِ بے در سے ہم تو — نکلجاتے مگر رستہ نہ پایا
جہاں دیکھا کسی کے ساتھ دیکھا — کہیں ہم نے تجھے تنہا نہ پایا
چراغِ داغ لے کر دل میں ڈھونڈا — اثر پر صبر و طاقت کا نہ پایا
وہ از خود رفتہ ہوں جسکو خودی نے — خدائی میں اگر ڈھونڈا نہ پایا
یہی ہر دم ہے زخمِ دل کو رونا — دہن پایا لبِ گویا نہ پایا
کبھی تو اور کبھی تیرا رہا غم — غرض خالی دلِ شیدا نہ پایا
سوا تیرے خطِ مشکیں کے کوئی — مجرّب نسخہ سودا نہ پایا
وہ بولے دیکھکر تصویرِ یوسف — سُنا جیسا اسے ویسا نہ پایا
کیا ہم نے سلام اے عشق تجھکو — کہ اپنا حوصلہ اتنا نہ پایا +
نہ مارا تو نے پورا ہاتھ قاتل — ستم میں بھی تجھے پورا نہ پایا
مری طالع کی وہ گردش ہے جس سے — فلک نے بھی قرار اصلا نہ پایا

نظیر اُسکا کہاں عالم میں لے ذوق
کہیں ایسا نہ پائیگا - نہ پایا +

۱۲۳۵ھ میں ایک بزرگ کہن سال حافظ علی شاہ نام و رنگ آباد ملک دکن سے وارد دہلی ہوئے - اور قلعہ میں آمد و رفت شاہی کے داروغہ کے پاس اترے وہاں اُستاد سے ملاقات ہوگئی - وہ صاحبِ دل صاحبِ وقت شخص تھے طرزِ معاشرت سے معلوم ہوا کہ نامدانی پیدا نہ نکلے - امیری چھٹو کو فقیری انتخاب کی

تھی زبان سے نہ کہتے تھے مگر ٹیپو سلطان اور خوانین مدراس کے معرکے اس طرح بیان کرتے تھے گویا آپ شامل تھے باوجود اسکے علوم رسمی سے آگاہ تھے شعر و سخن کا مذاق بہت خوب تھا۔ استاد سے تھوڑے عرصہ میں بہت رابطہ بڑھ گیا۔ استاد نے والد مرحوم کو بھی ملایا۔ شاہ موصوف استاد کی غزلیں اپنی بیاض میں لکھواتے تھے۔ اور فرمائشیں کر کے کہلواتے تھے طبیعت کی آزادی اور بے نیازی انکی خداداد سلطنت معلوم ہوتی تھی۔ کئی مہینے کے بعد فقہ غائب ہو گئے۔ بستر بچھا اور جزدان سرہانے رکھا رہ گیا۔ اسوقت اکبر شاہ بادشاہ تھے +

سنہ ۱۲۶۰ھ میں فقہ پھر آئے۔ کہا ہمیں شاہ جلیشاہ خطاب ہوا ہے۔ یہ ارتھا کہ دلی کے ٹوٹے پھوٹے تخت پر بہادر شاہ بیٹھے تھے۔ استاد کی شاعری اوج پر اور اختیارات موج پر تھے خلیفہ اسمٰعیل کو سرکار شاہی سے کئی خدمتیں حاصل تھیں انہی میں تیول شاہی (املاک و باغات) بھی سپرد تھے شاہ صاحب ہمارے ہاں اترے۔ مگر فرمایا کہ فقیر کو شہر میں رہنا مناسب نہیں۔ کوئی جگہ باہر ہونی چاہئے کہ اوقات میں خلل نہ ہو +

شہر کے اندر کابلی دروازہ کے پاس ہی استاد مرحوم رہتے تھے یہ ہا ایک باغ بادشاہی میں سے تیس ہزاری باغ مشہور تھا۔ عمارات قدیم تعمیر تھیں زیب النسا بیگم خواہر عالمگیر کی قبر بھی تھی۔ اس میں ایک بالاخانہ مرمت کر کے درست کروا دیا شاہ صاحب وہیں جا رہے۔ شام کو استاد والد مرحوم وہاں جاتے تھے شیخ ناسخ کا پہلا دیوان انہی دنوں ہمارے ہاں آیا تھا۔ اسکی غزلوں سے کوئی مصرع لیتے تھے اسی پر استاد غزل کہتے تھے۔ والد مرحوم لکھتے تھے۔ شاہ صاحب سنتے تھے۔ اور خوش ہوتے تھے عجب گلزار صحبت تھی +

لہ اب تیس ہزاری باغ صاف ہو گیا۔ وہاں ریل چلتی ہے۔ زیب النسا کی قبر کا نام و نشان نہیں رہا۔ میں نے خود پڑھا ہوا ہے۔ فاد خلی جنتی۔ عالمگیر کی کہی ہوئی تاریخ تھی جو پر کندہ تھی ۱۲

یوں تن خاکی میں دل روشن ہمارا ہوگیا
جس طرح پانی کوئیں کی تہ میں تارا ہوگیا

میرے نالوں سے جو پانی سنگ خارا ہوگیا
کوہ کے چشموں کا ہر آنسو شرارا ہوگیا

ذکر دنیا نفس مردہ کو ہوا آبِ حیات
مرکے یہ سیماب پھر زندہ دوبارہ ہوگیا

دانت یوں چمکے ہنسی میں رات اُس مہ پارہ کے
میں نے جانا ماہِ تاباں پارہ پارہ ہوگیا

ہر حباب بحر کی کھلجائے گی تارا سی آنکھ
عکس افگن گر رخ روشن تمھارا ہوگیا

رشک سے اُس زلف کے کیا مشک ہی یکسر ہے خوں
بلکہ جلکر سوختہ عنبر بھی سارا ہوگیا

شیخ نے افطاریوں کے ترنوالے کھائے خوب
ہے مگر روزوں کی گرمی سے چھوارا ہوگیا

ایک دم بھی ہمکو جینا ہجر میں تھا ناگوار
پر امید وصل پر برسوں گوارا ہوگیا

ہے مقام زندگی زیر دم شمشیر مرگ +
ہوگیا جس طرح کوئی دم گذارہ ہوگیا

دل پہ زخموں کی ترقی سے عجب پائی بہار
آگے تھا صد برگ یہ گل اب ہزارہ ہوگیا

ظلمت عصیاں سے میرے بنگیا شب روزِ حشر +
آفتاب ایک نیزہ پر دُمدار تارا ہوگیا

چشم مست یار میں آخر ہوئی سُرخی عیاں
لو! ہمارا خون پنہاں آشکارا ہوگیا

ذوق اس بحر فنا میں کشتی عمر رواں
جس جگہ پر جا لگی وہ ہی کنارا ہوگیا +

میں ہجر سے مرنیکے قریں ہو ہی چکا تھا
تم وقت پہ آپہنچے نہیں ہو ہی چکا تھا

اب جان پہ آفت ہے جو آئے ہو دوبارہ
ایک بار تو غارت دل دیں ہو ہی چکا تھا

سینہ جو کیا چاک تو واں کچھ بھی نہ پایا
کیا جلکے جگر خاک کہیں ہو ہی چکا تھا

لہ کوئیں کی تہ کا تارا یا کوئیں کا تارا۔ زبان اردو کا محاورہ ہے۔ کبھی نہایت گہرے اور پرانے کوئیں میں دیکھتے ہیں۔ اندھیرے کے سبب کچھ نظر نہیں آتا۔ غور کرکے بعد پانی چمکتا دکھائی دیتا ہے۔ دیکھنے والا کہتا ہے وہ پانی تارا چمکتا ہے۔ کبھی کبھی بیرزائیش کواں ہے ہم نے دیکھا ہوا ہے۔ پانی دُور کہیں تہ میں تارا چمکتا ہے ۱۲

برہم اُسے کیوں تو نے کیا چھیڑ کے پھر لُطف
ایدل وہ ابھی چیں بہ جبیں ہو ہی چکا تھا

ہوتا جو نہ پیوند زمیں تیری گلی میں
آسودہ دلِ زیر زمیں ہو ہی چکا تھا

آنے سے مرے ٹھیر گئے آپ وگرنہ
جانیکا ارادہ تو کہیں ہو ہی چکا تھا

جو خط میں لکھا اُس نے وہ لکھنے سے بھی پہلے
مکتوب سر لوحِ جبیں ہو ہی چکا تھا

بے بدرقۂ مرگ تو قفس رہا ورنہ
تجھ بن سفرِ جانِ حزیں ہو ہی چکا تھا

کیا ہوتا جو سمجھاتے اسے جا کے مرے دوست
دشمن کا سخن ذہن نشیں ہو ہی چکا تھا

کیا دیکھتے ہم یوسفِ کنعاں کو کہ اپنا
منظورِ نظر ایک حسیں ہو ہی چکا تھا

کیا گرمیِ پیش ہوتا تڑپ کر تنسے آگے
میں سرزنۂ خنجرِ کیں ہو ہی چکا تھا

جو کچھ کہ ہوا ہم سے وہ کس طرح نہ ہوتا
حکمِ ازلی ذوقؔ یوہیں ہو ہی چکا تھا

یہ غزل بھی تمیں ہزاری باغ میں کہی تھی سنہ ۱۲۶۰ ہجری

محفل میں شورِ قلقلِ مینائے مل ہوا
لا ساقیا پیالہ کہ توبہ کا تل ہوا

دریائے غم سے میرے گذرنیکو اے پلے
تیغِ خمیدہ یار کی لو ہیکا پل ہوا

پروانہ بھی تھا گرمیِ پیش پر کھلا نہ راز
بلبل کی تنگ حوصلگی تھی کہ غل ہوا

آئی تھی اندروں کی نہ ہرگز سمجھ میں بات
آوازہ گو بلند مثالِ دہل ہوا

جنکی نظر چڑھا تیرا رخسار آتشیں
اُنکا چراغ گور نہ تا حشر گل ہوا

بندہ نوازیاں تو یہ دیکھو کہ آدمی
جزوِ ضعیف محرمِ اسرارِ کل ہوا

اُس بن رہا چمن میں بھی میں ذوقؔ دلخراش
ناخن سے تیز تر مجھے ہر برگِ گل ہوا

چند شعر اس غزل کے عالم شباب میں کہے تھے وہی بانکپن و خلائق تھے پھر ۱۲۹۰ھ میں تنویر کی باغ میں غزل پوری کی تھی +

اس نیش کا ہے مزا دل ہی کو حاصل ہوتا
کاش میں عشق میں سرتا بقدم دل ہوتا

آسماں درد محبت کے جو قابل ہوتا
تو کسی سوختہ کا آبلۂ دل ہوتا

چھوڑتا ہاتھ سے ہرگز نہ کبھی بسمل شوق
دامن برق اگر دامن قاتل ہوتا

چین پیشانی اگر تیری نہ ہوتی زنجیر
نالہ دیوانہ تھا جو پا بسلاسل ہوتا

کرتا بیمار محبت کا مسیحا جو علاج
اتنا دق ہوتا کہ جینا اُسے مشکل ہوتا

فرج ہونیکا مزہ جانتا گر صید حرم
آپ گردن پہ چھری پھیر کے بسمل ہوتا

گر سیہ بخت ہی ہونا تھا نصیبوں میں میرے
زلف ہوتا تیرے رخسار پہ یا تل ہوتا

آتا کیوں مصر میں کنعاں سے نکلکر یوسف
جذبۂ شوق زلیخا جو نہ کامل ہوتا

موت نے کر دیا ناچار وگرنہ انساں
ہے وہ خود بیں کہ خدا کا بھی نہ قائل ہوتا

دل گرفتوں کی اگر خاک چمن میں ہوتی
تو جہاں دیکھتے ہو غنچہ وہاں دل ہوتا

آپ آئینہ ہستی میں ہے تو اپنا حریف
ورنہ یہاں کون تھا جو تیرے مقابل ہوتا

سینہ چرخ میں ہر اختر اگر دل ہے تو کیا
ایک دل ہوتا مگر درد کے قابل ہوتا

ہوتی گر عقدہ کشائی نہ یداللہ کے ساتھ +
ذوق حل کیونکہ میرا عقدۂ مشکل ہوتا

جو نہ رنگ رنج و ماتم کا یہاں نمود ہوتا
تو زمین زرد ہوتی نہ فلک کبود ہوتا

کسی رنج کش کو دیتا تو کچھ اُسکو سود ہوتا
دل سخت کاش کافر جو الیہود ہوتا

تیری بزم میں تو جلتا کہ تجھے بھی بو پہنچتی
جو یہیں تھا دل کو جلنا تو بلا سے عود ہوتا

جو نہ نُومید واشد نہ ہو دل گرفتہ غنچہ
کہ قبول تنگ رہنا نہیں بے کشود ہوتا

لبِ نازک اُس کا کیونکر کہو بارِ حرف اُٹھائے
کہ جو صد مہ تبسم سے بھی ہو کبود ہوتا

یہ حیاتِ چند روزہ جو نہ سدِ راہ ہوتی
تو پھر ایک عرصہ گاہِ عدم و وجود ہوتا

جو حسد کسی کو تجھ پر ہو تو ہے یہ تیری خوبی
کہ جو تو نہ خوب ہوتا تو وہ کیوں حسود ہوتا

تہِ خاک ہوتا ظاہر جو سنگنا اپنے دل کا +
تو شرارِ سنگِ تربت میں بھی اپنے دود ہوتا

جو ہے سرگذشتہ اُسکو نہیں دیتا سر کا شکل
کہ وہ سر بکف نہ ہوتا جو نہ دست جود ہوتا

جو رقیب زر بکف ہیں کبھی ہوتے سر بکف بھی
تیرے جاں نثار کا گر اُنہیں دست جود ہوتا

تیرے در کی جبہ سائی اگر اشک اپنے کرتے
سر قطرہ قطرہ پر اک اثر سجود ہوتا

کوئی زہر نوش مجھ سا نہیں پہنچا ذوق ورنہ
شجرِ زقوم دوزخ میں بھی خشک و دود ہوتا

نہ پہنچا یار نے جس وقت بغل میں مارا
جو چڑھا منہ اُسے میدانِ اجل میں مارا

اُس نے جب مال بہت ردو بدل میں مارا
ہم نے دل اپنا اُٹھا اپنی بغل میں مارا

اجل آئی نہ شبِ ہجر میں اور تو نے فلک
بے اجل ہم کو تمنائے اجل میں مارا

آنکھ سے آنکھ ہے لڑتی مجھے ڈر ہے دل کا
کہیں یہ جائے نہ اس جنگ و جدل میں مارا

عشق کے ہاتھ سے نے قیس بچانے فرہاد
اس کو گر دشت میں تو اُسکو جبل میں مارا

دل کو اس کاکل پیچاں سے نہ بل کرنا تھا
یہ سیہ بخت گیا اپنے ہی بل میں مارا

کھینچکر عشق جفا پیشہ نے شمشیرِ جفا
پہلے ایک ہاتھ مجھی پر تھا ازل میں مارا

چرخ بدبیں کی کبھی آنکھ نہ پھوٹی سو بار
تیر نالے نے میرے چشمِ زحل میں مارا

ہم نے جانا تھا جبھی عشق نے مارا اُسکو
تیشہ فرہاد نے جس وقت جبل میں مارا

اُس لب و چشم پہ ہے تیغ و کماں کی دستِ اجل
کہ کبھی دم میں جلایا کبھی پل میں مارا

کون سُنتا ہے تری زلف میں دل کی فریاد
کہ مسلمان کو ہے کافر کے عمل میں مارا

عُرس کی شب بھی میری گور پہ پھولا نہ سمائے
پتھر ایک گنبدِ تربت کے کنول میں مارا

نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب
ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

جینا ہمیں اصلا نظر اپنا نہیں آتا
گر آج بھی وہ رشکِ مسیحا نہیں آتا

مذکور تیری بزم میں کس کا نہیں آتا
پر ذکر ہمارا نہیں آتا نہیں آتا

دیتا دلِ مضطر کو تیری کچھ تو نشانی
پر خط بھی ترے ہاتھ کا لکھا نہیں آتا

کیا جانے اُسے وہم ہے کیا میرؔ سے طرف کا
جو خواب میں بھی اُس کو تنہا نہیں آتا

آیا ہے دمِ آنکھوں میں دمِ حسرتِ دیدار
پر لب پہ کبھی حرفِ تمنا نہیں آتا

کس دم نہیں گھٹتا میرا دم سینہ میں غم سے
کس وقت میرا منہ کو کلیجہ نہیں آتا

مَیں جاتا جہاں سے ہوں تو آتا نہیں یہاں تک
کافر مجھے کچھ خوفِ خدا کا نہیں آتا

ہم رونے پہ آجائیں تو دریا ہی بہائیں
شبنم کی طرح سے ہمیں رونا نہیں آتا

ہستی سے زیادہ ہے کچھ آرام عدم میں
جو جاتا ہے یہاں سے وہ دوبارہ نہیں آتا

آنا ہے تو آجا کہ کوئی دم کی ہے فرصت
پھر دیکھیے آنا بھی ہے دم یا نہیں آتا

غافل ہے بہارِ چمنِ عمرِ جوانی
کر سیر کہ موسم یہ دوبارہ نہیں آتا

ساتھ اُنکے ہوں میں سایہ کی مانند ولیکن
اس پر بھی جدا ہوں کہ لپٹنا نہیں آتا

دنیا ہے وہ صیاد کہ سب دام میں اس کے
آجاتے ہیں لیکن کوئی دانا نہیں آتا

دل مانگتا ہے آور یہ پھر اُس پہ تقاضا
کچھ قرض تو بندہ پہ تمہارا نہیں آتا

بیجا ہے لاؤ اُس کے نہ آنے کی شکایت — کیا کیجیے گا فرشتہ اچھا نہیں آتا +
جاتی رہی نفسوں کی لٹک دل سے ہمارے — افسوس کچھ ایسا ہمیں لکھا نہیں آتا
جو کوچہ قاتل میں گیا پھر وہ نہ آیا — کیا جانے مزہ کیا ہے کہ جیتا نہیں آتا
آئے تو کہاں جائے نہ تا جی سے کوئی جائے — جبتک نہیں آتا اُسے غصہ نہیں آتا

قسمت ہی سے لاچار ہوں اے ذوق وگرنہ
سب فن میں ہوں میں طاق مجھے کیا نہیں آتا

ساتھ آہ کے شب دل سے وہ پیکاں نکل آیا — تھا کام تو مشکل مگر آساں نکل آیا +
شب ہم نے تہیہ جو کیا توبہ کا ساقی — مغرب سے سحر مہر درخشاں نکل آیا
تنگ آکے جو دم تن سے نکل جائے تو جانو — زنداں سے کوئی قید سے زنداں نکل آیا
ہاتھ آئے نہ قسمت کے سوا گوہر مقصود — دریا سے تہی پنجۂ مرجاں نکل آیا
رات آہ میں یوں سینہ سے ایک شعلہ سا چمکا — میں نے تو یہ جانا دل سوزاں نکل آیا
ناقوس! یہ کس دل سے کیا نالۂ جاں سوز — یاں دل کا دھواں آہ سے پیچاں نکل آیا
عصمت بھی ہے کیا شے کہ اگر یوسف کنعاں — درہائے مقفل سے عزیزاں نکل آیا
ہے کوچۂ قاتل میں شہادت کا دفینہ — جب کھ اُفتواں گنج شہیداں نکل آیا +

دل رکھکے کہیں ذوق کا ہ — گئے تھے
تھا گم وہ کئی دن سے — آیا +

ہرا کسے ہے قول آشنائی کا جھوٹا — ساری خدائی کا جھوٹا
نہ کیوں ہیرے دانتوں سے جھوٹا ہو — تھا صفائی کا جھوٹا
ہوا بخت دامن سے جب — رسائی کا جھوٹا

بناتا ہے آئین اُلفت میں تجھکو
یہ شیوہ تیری بے وفائی کا جھوٹا

ترا قول ہاتھوں میں چمکا رہا ہے
نگین خاتم دلربائی کا جھوٹا۔

اُڑا کر کیا رنگ الفت کو رُخ نے
یہ ساغر مے کہربائی کا جھوٹا +

مزے لیکے پیوے اگر موت پاوے
یہ پانی مریض جدائی کا جھوٹا

مجھے نعمت خلد ہووے جو پاؤں
تیرے در پہ کھڑا گدائی کا جھوٹا

گئے طاق ابرو میں تھے حضرت دل
سو دعوے ہوا پارسائی کا جھوٹا

خدا جانے ہے ذوق جھوٹا کہ سچا
نہیں ہے وے آشنائی کا جھوٹا +

یہ غزل بھی تیس ہزاری باغ میں کہی تھی +

یاں تک عدو زمانہ ہے مرد دلیر کا +
جھکتے[1] ہیں منہ شکار کئے پر بھی شیر کا

جس گھر میں ہو لڑائی وہاں آدمی نہیں
کانٹا سمجھئے سیہہ کا یا گل کنیر کا

مجنوں کی روح دشت میں مانند گرد باد
کرتی طواف تھی تیرے مجنوں کے ڈھیر کا

ہیں اُس صنم کے ملنے کے رستے تو سینکڑوں
پر کوئی راست ہے کوئی رستہ ہے پھیر کا

دم آچکا لبوں پہ ہے آنکھوں کو ہے انتظار
بے دید جلد آ کہ نہیں وقت دیر کا

چھوڑا نہ ایک دانہ انھوں نے بھول کر
گردوں کو لگ گیا جو مزہ شب خنگیر کا

کوٹھے پہ اُن کے خوب
ہوتے زبان حال سے مضمون
جب
تھا ہاتھ آگیا جو سہارا مُنڈیر کا +

ہیں مع اختلاف زبر کا نہ زیر کا +

[1] شکاریوں کا قاعدہ ہے کہ جب بندوق دیر تک سر ہوتی
جھلس دیتے ہیں۔ کہ کوئی بدنیت اس کو چلا کر
چھوٹے ٹکڑے کرتے ہیں اور پان میں جھوٹ کر کے سچا
پولا بنا کر اُسے آگ دیتے ہیں اور شیر کا منہ
ناخون نہ کرے۔ اُن بالوں کے چھوٹے

زیبا ہے ذوق خرقۂ درویش مرد کو
برقع کبھی نہ پائیگا نامرد شیر کا +

یہ غزل بھی وہیں لکھی تھی +

دریائے اشک چشم سے جس آن بہ گیا
سُن لیجیو کہ عرش کا ایوان بہ گیا

بل بے گداز عشق کہ خوں ہو کے دل کے ساتھ
سینہ سے تیرے تیر کا پیکان بہ گیا

زاہد شراب پینے سے کافر ہوا میں کیوں
کیا ڈیڑھ چلو پانی میں ایمان بہ گیا

ہے موج بحر عشق وہ طوفاں کہ الحفیظ
بیچارہ مشت خاک تھا انسان بہ گیا

دریائے اشک سے دم تحریر حال دل
کشتی کی طرح میرا قلمدان بہ گیا

یہ روئے پھوٹ پھوٹ کے پاؤں کے آبلے
نالہ سا ایک سوے بیابان بہ گیا

تھا تو بہا میں بیش پر اُس لب کے سامنے
سب مول تیرا لعل بدخشان بہ گیا

کشتی سوار عمر ہیں بحر فنا میں ہم +
جس دم بہا کے لے گیا طوفان، - بہ گیا

تھا ذوق پہلے دلی میں پنجاب کا سا حُسن
پر اب وہ پانی کہتے ہیں ملتان[1] بہ گیا +

یہ غزل شیخ ناسخ کی غزل پر کہی تھی - مطلع

سرو عاشق ہو گیا اُس غیرتِ شمشاد کا
غل مچایا قمریوں نے ہے مبارکباد کا

ہے قفس سے شور رہا یک گلشن تا کفر فریاد کا
خوب طوطی بولتا ہے اِن دنوں صیاد کا

روز مرگ عاشق ناشاد ہے شادی کا دن
ہے بجائے شور ماتم غل مبارکباد کا

[1] ہند۔ ستان میں محاورہ تھا کہ جب کوئی موقع ہاتھ سے جاتا رہتا۔ یا کسی کام کا وقت گذر جاتا تو کہتے تھے۔ اب وہ پانی ملتان بہ گیا۔ یعنی اب نہ ہوگا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ دریاے راوی جو لاہور کے نیچے بہتا ہے ملتان کی جانب سے چکر بچا کے اور دریاؤں سے ملتا ہوا دریاے شور میں جا پڑتا ہے۔ پہلے اِدھر آنیکا موقع نہیں۔ پس جب کسی مفوت شدہ کے بابت کہیں کہ اب وہ پانی ملتان بہ گیا تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ دریا کے بہاؤ کی طرح اسکا موقع گذر گیا۔ اب نہ ہوگا ۱۲

آنچ سے تلوار کی ڈرتا نہیں یہ سخت جاں
کشتہ کرنا سخت ہی مشکل ہے اس فولاد کا

کچھ گدازِ عشق میں ہوتا اثر تو دیکھتے
کوہ کے چشموں سے ہوتا خوں رواں فرہاد کا

ہو سبق آموز شوخی گر پری کو چشمِ شوخ
کام لے موجِ نگہ سے سیلیٔ اُستاد کا

سوزشِ غم سے ہزاروں داغ جل جل کر پڑے
ہو گیا میرا کفن جامہ مگر حداد کا

سرد موجِ آب جو سے پائے در زنجیر ہے
دیکھ لو آزاد کو یہ حال ہے آزاد کا

آبداری ہے تیری تلوار میں یا ہو گیا
آبِ برہ سخت جانی سے میری فولاد کا

یاد کرتا ہے مجھی کو پہلے وقتِ قتلِ عام
کیوں نہ میں کشتہ ہوں اے قاتل تیری اس یاد کا

میں ہوں چکر میں لگی جسدن سے دنیا کی ہوا
حال میرا ہے بعینہٖ آسیائے باد کا

تیرے کشتہ کا دیکھے گا نہ ہرگز روئے خاک
لے اُڑے گا شوق پا بوسی اسے جلاد کا

سلسلہ میں لفظ و معنی کے نہ آیا دل کبھی
ابجدِ عالم میں گویا تھا الف آزاد کا

تم ہے اُستادِ شیطاں پر اسے کیا تجھکو دل
تُو تو شاگردی میں بھی اُستاد ہے اُستاد کا

ذوق حیراں ہے بہت فکر کشاد کار میں
یا علیؑ مشکل کشا یہ وقت ہے امداد کا

میرے سینہ سے تیرا تیر جب اے جنگجو نکلا
دہانِ زخم سے خوں ہو کے حرفِ آرزو نکلا

میرا گھر تیرا منزل گاہ ہو ایسے کہاں طالع
خدا جانے کدھر کا چاند آج اے ماہ رو نکلا

پھرا گر آسماں تو شوق میں تیرے ہے سرگرداں
اگر خورشید نکلا تیرا گرم جستجو نکلا

مے عشرت کا تھا خمخانہ افلاک پر دھوکا
کہ تھا لبریز غم اس غمکدہ سے جو سبو نکلا

تیرے آتے ہی آتے کام آخر ہو گیا میرا
رہی حسرت کہ دم میرا نہ تیرے رو برو نکلا

کہیں تجھکو نہ پایا گرچہ ہم نے ایک جہاں ڈھونڈا
پھر آخر دل ہی میں دیکھا بغل ہی میں سے تو نکلا +

خجل اپنے گناہوں سے ہوں میں یہانتک کہ جب رویا
تو جو آنسو میری آنکھوں سے نکلا سرفرو نکلا

گھسے سب ناخن تدبیر اور ٹوٹی سوزن
مگر تھا دل میں جو کانٹا نہ وہ ہرگز کبھو نکلا

اُسے عیار پایا یار سمجھے ذوق ہم جس کو
جسے یہاں دوست اپنا ہم نے جانا وہ عدو نکلا +

جب نیم جاں ہوں کوچۂ قاتل میں لوٹتا
قاتل ہے لوٹنے پہ مرے دل میں لوٹتا

لیلیٰ کے شوق وصل میں مجنوں کو دیکھنا
کیا کیا ہے راہ ناقۂ محمل میں لوٹتا

غیروں سے دیکھ دیکھ تیری گرمجوشیاں
میں آگ پر ہوں رشک سے محفل میں لوٹتا

دی لب نے تیرے غنچہ کو اکسیر مسکرات
گل ہو کے ہے جو پائے عنا دل میں لوٹتا

کعبہ کا رخ ہے اور ترے درد فراق سے
میں اے صنم ہوں پہلی ہی منزل میں لوٹتا

دل کا سا ہو تا گر دُر غلطاں کو اضطراب
پھرتا تمام دامن ساحل میں لوٹتا

سودائیوں کے دل پہ تری یاد زلف میں
ایک سانپ ہے قید سلاسل میں لوٹتا

کس کس مزے سے لوٹتے ہیں میکدہ میں مست
ہے ایک کے جو ایک مقابل میں لوٹتا

بے آب تیغ۔ ماہیِ بے آب کی طرح
اے ذوق دل ہے سینۂ بسمل میں لوٹتا

یہ غزل ناتمام ہے یعنی عالم شباب کے شعر ہیں۔ کہا کرتے تھے کہ قافیے اور مضمون ہیں ہمارے خیال میں۔ کبھی کہیں گے +

عالم نے زندگی میں زمانہ شباب کا
گلشن میں برگ برگ ہے پھول آفتاب کا

جلوہ ہو کیونکہ خاکپۂ آفتاب کا
جلتا نہیں ہے برق سے دامن سحاب کا

اے گلرخو نہ چھیڑنا دامن سحاب کا
دیکھو چھلک رہا ہے کٹورا شراب کا

اُس گل بغیر طوطیِ بسمل سے کم نہیں
سبزہ مزارِ عاشقِ پر اضطراب کا

صد پارہ دل ہے گنجفۂ عشق ہوگیا
اور ہر ورق پہ نقش ہے حکم آفتاب کا

ہے دل جلوں کے واسطے نامہ بر تو خوب
اُڑنا مگر محال ہے مرغِ کباب کا

ٹپکے اگر عرق گلِ رخسارِ تیرے
دریا میں ہر حباب ہو شیشہ گلاب کا

اے آفتاب تیرے رخِ تابناک سے
کیا کیا چمک رہا ہے ستارہ حباب کا

ہوتا ہے دل جلوں سے کہیں ذوق ضبطِ آہ
موجِ دخاں سے ضبط نہ ہو پیچ و تاب کا

نالہ جب دل سے چلا سینہ میں پھوڑا اٹکا
چلتی گاڑی میں دیا عشق نے روڑا اٹکا

جلد آ وعدۂ دیدار پہ اے وعدہ خلاف
کب تک اٹکا ہے دمِ آنکھوں میں نتھوڑا اٹکا

تو سمنِ عمر رواں ہر نفس اڑتا ہی رہا +
کبھی میدانِ فنا میں نہ یہ گھوڑا اٹکا +

بھاگا مجنوں مری وحشت سے بگولے کی طرح
سامنے میرے ذرا بھی نہ بھگوڑا اٹکا +

لیگئے مر کے بھی اے ذوق رکاوٹ دل میں
ہاتھ تلوار کا جو یار نے چھوڑا اٹکا

عالم شباب کا مطلع خاص و عام میں عام ہوا تھا اور عمر میں آکر غزل پوری ہوئی تھی سنہ ۱۲۶۶ھ میں تیس ہزاری میں غمیں کہی تھی۔

ہم ہیں اور سایہ تیرے کوچہ کی دیوار ونکا
کام جنت میں ہے کیا ہم سے گنہگاروں کا

محتسب گرچہ دل آزار ہے مے خوار ونکا
دیکھے ایک جام تو ہے یار ابھی یاروں کا

اتنا تو شور و فغاں ہو کہ چمن میں بلبل
خرمنِ گل کی جگہ ڈھیر ہو انگاروں کا

چرخ پر بیٹھ رہا جان بچا کر عیسے
ہو سکا جب نہ مداوا تیرے بیماروں کا

ہوں رگیں حلق بریدہ کی ہمارے خونبار
گر تماشا انہیں منظور ہو فوارون کا

اے ستمگر جو ترے تیر نہیں تشنہ خوں
تو کھلا رہتا ہے مُنہ کس لئے سوفاروں کا

کیوں نہ ہر تار میں دل ہو وہیں گرفتار کہ زلف
جیلخانہ ہے محبت کے گرفتاروں کا

دینگے جاں بوسۂ لعل نمکیں پر ہم بھی
جاں نثاری ہے اگر شیوہ نمکخواروں کا

بے سیاہی نہ چلا کام قلم کا اے ذوق
روسیاہی سر و ساماں ہے سیہ کاروں کا

نالہ اس شوخ سے کیوں میرا دہائی دیتا
ایفلک گر تجھے اونچا نہ سنائی دیتا

دیکھ چھوٹوں کو ہے اللہ بڑائی دیتا
آسماں آنکھ کے تل میں ہے دکھائی دیتا

دے عداوے پر خارجنوں کو ہر گام
داد یہ تیری ہے اے آبلہ پائی دیتا

لاکھ دیتا فلک آزار گوارا تھے مگر
ایک تیرا نہ مجھے درد جدائی دیتا

پنجہ مہر کو بھی خون شفق میں صبح
غوطے کیا کیا ہے ترا دست حنائی دیتا

روش اشک گرا دینگے نظر سے ایکدن
ہے ان آنکھوں سے یہی مجھکو سجھائی دیتا

میں وہ ہوں صید کہ پھر دام میں پھنستا جاکر
گر قفس سے مجھے صیاد رہائی دیتا

کون گھر آئینہ کے آتا اگر وہ دل میں
خاکساری سے نہ جارو صفائی دیتا

ساغرے بھی ترے کشتہ انداز کو یار
بوسۂ لب نہیں بے چشم نمائی دیتا

نہ سے بس کرتے نہ ہرگز یہ خدا کے بندے
گر نہیں آکے خدا ساری خدائی دیتا

دیکھ گر دیکھتا ہے ذوق کہ وہ پردہ نشیں
دیدۂ روزن دل سے ہے دکھائی دیتا

یہ غزل بھی تیس ہزاری باغ کی سہار ہے۔

نکتہ اس بت سے کبھی لیوینگے ہم ایمانکا
ایسی کیا جلدی ہے جلدی کا کام ہے شیطانکا

جھوٹ ہی جانو کلام اُس رہزن ایمان کا
پہنکر جامہ بھی وہ آئے اگر قرآن کا

تو ہماری زندگی پر زندگی کی کیا اُمید
تو ہماری جان لیکن کیا بھروسا جان کا

جو دل پر آرزو سے نکلا نالہ عشق میں۔
ایک پُتلا تھا سراپا حسرت و ارمان کا

بن گیا جوش محبت سے ہمارے سینہ میں
ماہی دریائے خوں جوہر تیرے پیکان کا

جو فرشتے کرتے ہیں کر سکتا ہے انسان بھی
پر فرشتوں سے نہ ہو جو کام ہے انسان کا

یہ تپ غم کی ہے شدت اس تپے بیمار کو
یوم راحت بھی ہے حق میں اسکے دن ہجران کا

اے اجل تکلیف مت کریجیا کریگی آن کر
ہو چکا پہلے ہی میں کشتہ کسیکی آن کا

ہو سکے آلودہ دامن پاکدامن کسطرح
اے زلیخا چھوڑ دامن یوسف کنعان کا

نفس بے مقدور کو قدرت ہو گر ٹھوکر بھی
دیکھ پھر سامان اس فرعون بے سامان کا

دیکھنا اے ذوق ہونگے آج پھر لاکھوں کے خوں
وہ جماتا ہے لب لعلیں پہ لاکھا پان کا +

کسی بیکس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا
جو آپہی مر رہا ہو اسکو گر مارا تو کیا مارا

بڑے موذی کو مارا نفس امارہ کو گر مارا
نہنگ و اژدہا و شیر نر مارا تو کیا مارا

نہ مارا آپ کو جو خاک ہوا اکسیر بن جاتا
اگر پارے کو اے اکسیر گر مارا تو کیا مارا

خطا تو دل کی تھی قابل بہت سی مار کھانیکے
تیری زلفوں نے مشکیں باندھکر مارا تو کیا مارا

نہیں وہ قول کا سچا ہمیشہ قول دے دیکر
جو اُس نے ہاتھ میرے ہاتھ پر مارا تو کیا مارا

تفنگ و تیر تو ظاہر نہ تھا کچھ پاس قاتل کے
الٰہی پھر جو دل پر تاک کر مارا تو کیا مارا

ہنسی کے ساتھ ہاں رونا ہے مثل قلقل مینا
کسی نے قہقہہ اے بے خبر مارا تو کیا مارا

میرے آنسو ہمیشہ ہیں بزنگ بحر غرق خوں
جو غوطہ آب میں تو نے گہر مارا تو کیا مارا

جگر زخمی ہے اور دل لوٹتا ہے تم نے کیا جانے
اِدھر مارا تو کیا مارا اُدھر مارا تو کیا مارا

دلِ سنگین خسرو پر بھی ضرب اے کوہکن پہنچے
اگر تیشہ سر کوہسار پر مارا تو کیا مارا

گیا شیطان مارا ایک سجدہ کے نہ کرنے میں
اگر لاکھوں برس سجدہ میں سر مارا تو کیا مارا

دل بدخواہ میں تھا مارنا یا چشم بد میں میں
فلک پر ذوق تیرا آہ گر مارا تو کیا مارا

میں وہ شہید ہوں لب خنداں یار کا
ہنستا ہے چراغ بھی میری مزار کا

ہنگامہ گرم ہستیٔ ناپائیدار کا
چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا

ہو راز دل نہ کیسے پوشیدہ یار کا
پردہ جو درمیان ہو دل کے غبار کا

آنکھوں میں آکے ٹھیرا ہے دم انتظار کا
آئے اگر تو آہ کہ سینہ سے چل کے اب

کھٹکا نہیں نگاہ کو مژگاں کے خار کا
ہو پاکدامنوں کو خلش نگر سے کیا خطر

شربت ہے باغ خلد میں کے انار کا
پوچھے ہے کیا حلاوت تنخواہ سرشک

مکتوب شوق اُڑ کے تیرے ہفت ار کا
پہنچیگا تیرے پاس کبوتر سے پیشتر

لپکا جو پڑ گیا ہے مجھے انتظار کا
تو بر میں ہے مگر ہے میری آنکھ سوئے در

کرتی ہے قصد ٹٹی کی اوجھل شکار کا
ہے دل کی داو گھات میں مژگاں سے چشم یار

ناجانے وہ یہ خط ہے کسی خاکسار کا
قاصد لکھوں لفافہ کو خط غبار سے

ہوگا درخت گور پہ میری چنار کا
بجھنے کی دل کی آگ نہیں زیر خاک بھی

گویا کہ ایک ستارہ ہے صبح بہار کا
اس روئے تابناک پہ ہر قطرہ عرق

اے ذوق! ہوش گر ہے تجھے دنیا سے دور بھاگ
اس میکدہ میں کام نہیں ہوشیار کا

ن - دیکھئے دیوان شوق کے قصیدہ میں جو سنہ ۱۲۷۳ھ کا ہے +

یہ بھی ہیں ہزاری باغ کا چمن ہے ۔

خطر ہے خون سے دل پائمال کے کیسا
بچا ہے دیکھنا دامن سنبھال کے کیسا

بغل سے لیگئے دل کو نکال کر وہ صریح
جو مانگا تو کہا آنکھیں نکال کے کیسا؟

کسی کے رنپہ ہے جوگی جو چشم ہندو اد
تو اسکو گھیرے ہیں مژگاں مال کے کیسا

نمود خال کی دیکھو تو زیر ابرو ے یار
ستارہ نکلا ہے نیچے ہلال کے کیسا

ہماری نعش پہ ہنگامہ کیوں ہے اے قاتل
اٹھا ہے قصہ یہ بعد انفصال کے کیسا

شب فراق میں اس مہ جبیں کے انجم چرخ
مجھے ڈراتے ہیں آنکھیں نکال کے کیسا

ہزار دم میں اُسے یاد تو نے دیکھا ذوق
گیا وہ غیر کے گھر تجھ کو ٹال کے کیسا +

پُرانی غزل تھی ۔ میرے سامنے دوبارہ بنائی تھی ۔

میں کہاں سنگ دلِ یار سے ٹل جاؤنگا
کیا وہ پتھر ہے پھسلنا کہ پھسل جاؤنگا

نالہ کہتا ہے کہ تا چرخ زحل جاؤنگا
بلکہ میں توڑ کے اسکو بھی نکل جاؤنگا

آج اگر راہ نہ پاؤں گا تو کل جاؤنگا
کوچہ یار میں پر سر ہی کے بل جاؤنگا

دل سے کہتا ہوں کہ تو ساتھ نہ لیجا مجکو
جا کے میں وہاں تجھے قابو سے نکل جاؤنگا

مدرسہ میں بھی اگر جاؤنگا تو جائے کتاب
شیشۂ بادہ لئے زیر بغل جاؤنگا

دیکھکر کوئے صنم کہتا ہے یہ پاس ادب
ہوں جو خورشید تو یہاں سر ہی کے بل جاؤنگا

دل یہ کہتا ہے مجھے روزنِ سینہ سے نکال
ورنہ خوں ہو کے میں آنکھوں سے نکل جاؤنگا

سرد مہروں سے فلک ڈال نہ پالا کہ بن آگ
نخل سرو کی طرح سے جل جاؤنگا

آنکھ سے اشک صفت مجھکو گرا کر نہ اُٹھا
دل نہیں میں کہ سنبھالے سے سنبھل جاؤنگا

کہتا وحشت سے یہ ہے جامہ پیری میرا
دیکھ کپڑا ہوں پرانا ابھی چل جاؤنگا

عقل سے کہدو کہ لائے نہ یہاں اپنی کتاب
میں ہوں دیوانہ ابھی گھر سے نکل جاؤنگا

اے صنم در پہ نہیں دیر میں جا بیٹھونگا
کچھ میں بچہ تو نہیں ہوں کہ مچل جاؤنگا

قیس و فرہاد کو بتلاؤنگا کچھ عشق کی راہ
ایکے میں گر طرف دشت و جبل جاؤنگا

گر پڑا آگ میں پروانہ دم گرمی شوق
سمجھا اتنا بھی نہ کمبخت کہ جل جاؤنگا

کہتا پیراہن گل ہے یہ نزاکت سے نسیم
ہاتھ مجھکو نہ لگانا کہ نکل جاؤنگا

سنتے ہو اے زاہد و ناصح جو ہیں سمجھاتے مجھے
کیا بدل دینگے یہ اور میں بدل جاؤنگا

میں وہ مشتاق شہادت ہوں کہ سر دینے کو
پائے کوباں تہ شمشیر اجل جاؤنگا

جنبش برگ صفت باغ جہاں میں اے ذوق
کچھ نہ ہاتھ آئیگا تو ہاتھ تو مل جاؤنگا

اس سے تو اور آگ وہ بیدرد ہو گیا
اب آہ آتشیں سے بھی دل سرد ہو گیا

سینہ میں بوالہوس کے بھی تھا آبلہ مگر
نشتر کا نام سنتے ہی منہ زرد ہو گیا

سو بار مر کے عاشق جاں باختہ تیرا
لڑنے کو پھر کھڑا روش نرد ہو گیا

مجنوں بھی دشت گرد تھا مانند گرد باد
جب خاک اڑ گئی ہم نے تو وہ گرد ہو گیا

اس صید تیر خوردہ کو تو نے کیا نہ ذبح
آخر تڑپ تڑپ کے یوہیں سرد ہو گیا

آ اے مرے چمن کے گل ورد دیکھ لے
عاشق کا رنگ زرد و زرد ہو گیا

پیر مغاں کے پاس وہ دارو ہے جس سے ذوق
نامرد مرد - مرد جواں مرد

پرانی غزل تھی میرے سامنے نظر ثانی کی -

پانی طبیب یگانہ ہمیں کیا بجھا ہوا
ہے دل ہی زندگی سے ہمارا بجھا ہوا

کہتے تھے آفتاب قیامت جسے سو وہ
نکلا چراغ داغ دل اپنا بجھا ہوا

چشم غضب سے نیم نگہ میرے واسطے
ایک نیمچہ ہے زہر میں گویا بجھا ہوا

پھر دل میں آہ سرد ہوئی میرے شعلہ ور
لو پھر بھڑک اٹھا یہ فتیلہ بجھا ہوا

پہلے نشانہ کرتا وہ بندوق کا مجھے
پر تھا میرے نصیب سے توڑا بجھا ہوا

جلکر اگر بجھا بھی دل سوختہ میرا
یوں جل اٹھے گا جیسے کہ کوئلا بجھا ہوا

ہم آپ جل بجھے مگر اس دل کی آگ کو
سینہ میں ہم نے ذوق نہ پایا بجھا ہوا

اُستاد کے مسودہ سے جسدن یہ غزل مَیں نے لکھی۔ فرمایا کہ عجیب اتفاق ہوا۔ ایک دن میاں نثار علیشاہ تشریف لائے۔ حسب عادت غزل کی فرمائش فرمائی۔ مَیں نے بھی یہ غزل کہی تھی۔ انہیں سنائی۔ خوش ہوئے۔ بہت عنایت کی اور چلے گئے۔ دوسرے دن سُنا کہ چلے ہی گئے۔ کاش کوئی اور غزل سُناتا۔

جدا ہوں یار سے ہم اور رہوں رقیب جدا
ہے اپنا اپنا مقدر جدا نصیب جدا

تیری گلی سے نکلتے ہی اپنا دم نکلا
رہے ہے کیونکہ گلستاں سے عندلیب جدا

الٰہی جلوہ ہے کس بت کا آج مسجد میں
کہ دم بخود ہے موذن جدا خطیب جدا

تمہارا درد جدائی نہ جسد مجھ سے
حروف درد میں ہو حکمت طبیب جدا

مکتب محبت میں
کہ ہے وہاں کا معلم جدا ادیب جدا

نہو نالہ
کہ فوج سے نہیں رہتا کبھی نقیب جدا

چاک تک
اٹھی ہو نہ وطن سے کوئی غریب جدا

کیا حبیب کو مجھ سے جدا فلک نے مگر | نہ کر سکا میرے دل سے غم حبیب جدا

کریں جدائی کا کس کی رنج ہم اے ذوق
کہ ہونے والے ہیں ہم سب سے عنقریب جدا

یہ بھی تیس ہزاری باغ کی غزل ہے سنہ ۱۲۶۰ ہجری

شجر پردہ ہی میں اس بت کو حیا نے رکھا | ورنہ ایمان گیا ہی تھا خدا نے رکھا
تھا نہ پامال رہ عشق کی تربت کا نشاں | بارے تعویذ تو نقش کف پا نے رکھا
تشنہ کامی کا رہا بعد فنا بھی یہ اثر + | استخواں کو میرے منہ پر نہ ہما نے رکھا
آشیاں باغ میں ڈھونڈا جو قفس سے جا کر | ایک تنکا بھی تھا باد صبا نے رکھا
دل جو دیوانہ نہ تھا میرا تو پھر کیوں اسکو | پا بزنجیر تیری زلف دوتا نے رکھا
آنکھیں دیدار طلب گور سے آئی ہیں نکل | دستہ نرگس کا نہیں سیر سرہانے رکھا
پنے ناواقف رہ پہلے ہے رہبر موجود | گور سے آگے قدم دیکھ عصا نے رکھا
ناتواں ہیں نہ تن زار میرا دیکھ سکا + | خوب دھوکے میں اُسے تا رقبا نے رکھا
نرکھے خوبی و زشتی سے غرض آئینہ وار | گھر میں مہمان جسے اہل صفا نے رکھا
کیا تماشا ہے کہ دیوانہ بنا کر اپنا | نام مجنوں میرا اُس ہوش ربا نے رکھا
شربت مرگ سے محروم نہ رہتا کبھی خضر | لیک نا کام اُسے آب بقا نے رکھا
نہ کیا مر کے بھی اُس صید حرف خسار کا شوق | کہ رہا گور پہ تا حشر سر اُن نے رکھا

بے نشاں پہلے فنا سے ہو جو ہو تجھکو بقا
ورنہ ہے کس کا نشان ذوق نمانے رکھا

نشہ دولت کا بد اطوار کو جس آن چڑھا | سر پہ شیطان کے یہاں وہی شب خون چڑھا

عشق کے ڈھب پہ نہ کوئی بجز انسان چڑھا
اس کے قابو پہ چڑھا تو یہی نادان چڑھا

توسن وحشت اگر اپنا زمیں چڑھ جاے
ابھی افلاک کو دیں خاکِ بیابان چڑھا

دل نے کب دیکھا مہ نو کو جوابرو کافر
لیکے شمشیر ہے سینہ پہ میرے آن چڑھا

دیکھنا ملت و دیں دونو ہیں برباد کرآج
باوکے گھوڑے پہ ود دشمن ایمان چڑھا

مصحفِ رخ پہ تیرے رنگ سنہرا تیرا
واہ کیا خوب ہے سونا سر قرآن چڑھا

آنکھ تو لڑ گئی پر کوئی بھی اس دل کے سوا
فوج مژگان کے نہ منہ پر سرِ میدان چڑھا

بلہوس جاتے ہیں گرداب میں آہو کی طرح
چلۂ ابرو کی کماں پر تیرے قربان چڑھا

دیکھو قسمت کا لکھا اُس نے پڑھا خط سو بار
دیہان پر مرا نہ مطلب کسی عنوان چڑھا

نگہ یار کو دے سونپ متاع دل و جاں
چور قسمت سے نظر اپنی نگہبان چڑھا

سنگ سرمہ میں سیہ تاب تھی وہ تیغ نگاہ
گردش چشم نے پردی ہے غضب سان چڑھا

کشتہ دست حنا بستہ ہوں ان ہاتھوں سے
کبھی دو پھول تو لاکر تو میری جان چڑھا

اشک آئے نہیں مژگاں پہ کہ یاروں نے ابھی
پانی سونیزہ دیا باندھ کے طوفان چڑھا

حضرت عشق کی درگاہ میں آکر اے ذوق
دل و دیں دیتے ہیں سب گبر و مسلمان چڑھا

نیمچہ جب مول وہ بانکا جواں لینے لگا
موت کے جی میں مزے یہ نیم جاں لینے لگا

تیر چٹکی میں لیا اُس نے پے جان عدو
رشک سے میرے دل میں کیا کیا چٹکیاں لینے لگا

نام میرا سُن کے مجنوں کو جنبھائی آگئی
بید مجنوں دیکھکر انگڑائیاں لینے لگا

مجھ کو ہر شب ہجر کی ہونے لگی جوں روز حشر
مجھ سے یہ کسدن کے بدلے آسماں لینے لگا

ہے جو غنچوں کا چٹکنا انگلیوں کی سی چٹک
یہ بلائیں کسکی باغ اے باغباں لینے لگا

جس نے کی اس میکدہ میں بیعتِ دستِ سبو
وہ قدم تیرے بلائے پیرِ مغاں لینے لگا

لیکے آئینہ جو دیکھی حسن کی اپنی بہار
اپنے بوسے آپ وہ غنچہ دہاں لینے لگا

آکے دل پر جب کبھی کرنے لگے تیغ نگاہ
چشم کی گردش سے وہ کافر سناں لینے لگا

ذوقِ حسن و عشق روشن ہوگیا سب نم پر
شمع کی گلگیر جو منہ میں زباں لینے لگا

موت اسکو یاد کرتی ہے خدا جانے کہ گور
یوں ترا بیمارِ غم جو ہچکیاں لینے لگا

رات کو اے ذوق اسکے نوکِ مژگاں کا خیال
تن پہ ہر مو سے میرے کارسناں لینے لگا

پہنچا آبِ تیغِ قاتل تا بسر اچھا ہوا
اے دلِ مجروح لے تو غسل کر اچھا ہوا

ایکدن بالکل نہیں اے چارہ گر اچھا ہوا
داغِ اِدھر تازہ ہوا اگر زخم اُدھر اچھا ہوا

کم نہ ہوا اُس آبِ خنجر کی الٰہی آبرو
آج مدت میں ہمارا حلق تر اچھا ہوا

آرہیگا دشت میں لیلیٰ تیرے ناقہ کے کلام
ہوگیا مجنوں جو کانٹا سو کھکر اچھا ہوا

روز کہتا تھا مزا مجھکو چکھاؤں عشق کا
بھر دیا لون اُس نے دل کو چیر کر اچھا ہوا

سُن کے مجنوں نے میرے شورِ جنوں کو یہ کہا
واقعی مجھ سے بھی یہ شوریدہ سر اچھا ہوا

بندھگیا اُس مو کمر کا جبکہ مضمون کمر
ہوگئی مضموں میں وقعت شعر پر اچھا ہوا

مجھکو صدقے کر اگر ہے بدمزہ تیرا مزاج
یہ اِدھر صدقہ دیا تو نے اُدھر اچھا ہوا

ہاتھ تو اوچھا پڑا تھا یار کی شمشیر کا
زخم پر قسمت سے میری کارگر اچھا ہوا

کھچ گیا میری طرف سے اور بھی دلبر کا دل
واہ وا جذبِ محبت کا اثر اچھا ہوا

قتل کرتا ہے نیا بسمل سے یہ کہنا کہ لو
اب تو دامن بھی ہوا لہو تر اچھا ہوا

نامہ بر جانے ہے جا جلدی چلی جانِ حزیں
دیر مت کر ساتھ تیرے ہم سفر اچھا

آئینہ خانے میں عالم کے سمجھ لے یہ مثال
ہے بُرا تو ہی اگر آیا نظر تجھ کو بُرا

ق

تا تجھے جانیں کہ یہ صاحب نظر اچھا ہوا
تو ہی اچھا ہے تجھے معلوم گر اچھا ہوا

ذوق کے مرنے کی سُن کر پہلے تو کچھ رک گئے
پھر کہا تو یہ کہا منہ پھیر کر - اچھا ہوا -

عبث جاں منتظر ہونٹوں پہ ہے تیرے تو خوش کب آیا
اگر چہلم کو بھی آیا تو ہم جانینگے اب آیا

چمن میں کہتے ہیں ہر موسم عیش و طرب آیا
بہار ہیں خوب لونگے اگر وہ غنچہ لب آیا

خلاف وعدہ سے میں تیرے کل تو جاں بلب آیا
نہ آیا آج بھی گر تو تو اے ظالم غضب آیا

عجب حیرت میں ہوں جب سے نظر وہ خال لب آیا
دہن اُس کا عدم ہے اور عدم میں نکتہ کب آیا

نوید اے تشنہ کامی بارے آب خنجر قاتل
گلو تک میرے اور زخم گلو کے تا بلب آیا

تامل کیجیو ذوق طپیدن - دیکھئے کیا ہو
کہ اب تک ذبح کرنیکا نہیں قاتل کو ڈھب آیا

وہ مست ناز لیکر مجھ سے میرے شیخ شہر دل کو
ہوا خوش اسقدر گویا کہ ہاتھ اسکے حلب آیا

نوشتہ سے ہوا ایک حرف بھی ہرگز نہ بیش و کم
جو پیشانی میں تھا لکھا ہوا وہ پیش سب آیا

برگ غنچہ مونہیں دل نے کیا اس گلستاں میں
بھر آیا منہ میں خوں گر ایک تبسم زیر لب آیا

وہ آئیں یا نہ آئیں میں نہیں رنجیدہ دل اُنسے
مگر یہ رنج ہے کیوں رنج اُنکو بے سبب آیا

لگائی زلف کو شانہ نے جو اُنگلی پکا اول
یہ گستاخی بھلا رہ تو سہی او بے ادب آیا

تیرے ڈر سے نہ آیا پاس کوئی نیم جانوں کے
مگر رونا کبھی چوری سے بعد از نیم شب آیا

میں اپنے ذوق کے قربان کہ سستی میں محبت کی
بلایا کس نے اس کو جب یہ آیا بے طلب آیا +

نے سر تن سے گرا اس شامت کے مارے کا
تو بھولونگا نہ میں احسان تیرے تنکا آر یکا

بیر طالع میں ہے کیا کام اے گردوں ستارے کا
چمک جانا ہے کافی آتش دل کے شرارے کا

ستارے دیکھکر موتی تمہارے گوشوارے کا
کمینگے ہے ہمارا نور صدقہ اس ستارے کا

نفس ہے جادۂ عمر رواں جس طرح سے گذرے
یہاں پوچھے ہے اے گمراہ کیا رستہ گذارے کا

جسے کہتے ہیں بحر عشق اسکے دو کنارے ہیں
ازل نام اس کنارے کا ابد نام اُس کنارے کا

نیزا ہر موئے مژگان دل کو انگشت اشارت ہے
سمجھنے والا مجھ سا چاہیے پر اس اشارے کا

ملے اکسیر گر اس کشت و خوں سے میں لوں ہرگز
میرے مذہب میں خوں کرنا ہے کشتہ کر ہارے کا

مفید حال دل ہوں چاندنی کے پھول کیا مجھکو
دکھاد و خندۂ دنداں نما اس من پیارے کا

نہ پکڑیں دامن الیاس گرداب بلا میں ہم
کہ بہتر ڈوب کر مرنے سے ہے جینا سہارے کا

میرے گھر میں تو ہو ماہ سیر السیر بجانے
کیا غیروں میں پیدا حکم کیونکر قطب تارے کا

سر راہ فنا میں ہوں مہیا ہے سفر لیکن
بزنگ اشک مژگاں منتظر ہوں ایک اشارے کا

گنہ رحمت سے اُسکی بخشوانے رو رو کر
چھڑک کر ہم نے بیچا نفع پر سودا خسارے کا

ڈھلکتا ہے مثال دانۂ تسبیح کیوں منکا
کہ جب ٹھیرا سفر دنیا سے کیا کام استخارے کا

فقط نار نفس کا ذوق خط جادہ کافی ہے
پئے عمر رواں کیا چاہیے رستہ گذارے کا

نالہ ہے اُن سے بیاں درد جدائی کرتا
کام قاصد کا ہے یہ تیرہ ہوائی کرتا

پنجۂ شانہ کو دیتا ہے فلک کب نا خن
جانتا ہے کہ یہ ہے عقدہ کشائی کرتا

دیکھتا اُس بت مغرور کا گر جاہ و جلال
کبھی فرعون نہ دعوے خدائی کرتا

خاک آئینہ سے ہے نام سکندر روشن
روشنی دیکھتا گر دل کی صفائی کرتا

نہیں گوش شنوا باغ جہاں میں غافل
ورنہ ہر برگ ہے یہاں نغمہ سرائی کرتا

بند آنکھیں کئے جاتا ہے کدھر تو کہ تجھے
ہے تیرا نقش قدم چشم نمائی کرتا +

سوز دل کون بجھائے کہ نہیں چشم میں اشک
پر ہے کچھ خون جگر کا رونمائی کرتا +

بیٹھ رہئے تو قفس ہے عجب آرام کی جائے
پر ہے بے چین ہمیں شوق رہائی کرتا

ذوق اُس پائے نگارین کا جو ہے وصف نگار
اشک خونی سے ہے کاغذ کو حنائی کرتا +

پرانی غزل تھی نظر ثانی میں نئی ہوئی ۔

نکرتا ضبط میں نالہ تو پھر ایسا دھواں ہوتا
کہ نیچے آسماں کے ایک نیا اور آسماں ہوتا

ابھی ٹھنڈا بھلا کیونکر شہید تفتہ جاں ہوتا
کوئی دم شمع مردہ میں بھی ہے باقی دھواں ہوتا

کہے ہے مرغ دل اے کاش میں زاغ کماں ہوتا
کرتا شاخ کماں پر اسکی میرا آشیاں ہوتا

عزاداری میں ہے کسکی یہ چرخ ماتمی جامہ
کہ جیب چاک کی صورت ہے خط کہکشاں ہوتا

نہوتی دلمیں گر کاوش کسی کی نوک مژگاں کی
تو کیوں حقیں سے ہر موئے تن مثل سناں ہوتا

نرکھتا گر نرکھتا منہ پہ دانہ یہ مریض غم
مگر تیرا میسر بوسہ خال دہاں ہوتا +

اگر جی کھول کر میں تنگنائے ہر میں روتا
تو جیحوں کہکشاں میں بھی فلک پر خوں رواں ہوتا

بگولا گر نہوتا وادیٔ وحشت میں اے مجنوں
تو گنبد ہم سے سرگشتوں کی تربت پر کہاں ہوتا

تیرے خونیں جگر کی خاک پر ہوتا اگر سبزہ +
تو مثل موئے مژگاں اُس سے پیہم خوں رواں ہوتا

رکاوٹ دل کی قاتل کے بوقت ذبح ظاہر تھی
کہ خنجر تھا میری گردن پہ رک رک کر رواں ہوتا

نہ کرتا ضبط میں گر یہ نوائے ذوق ایک گھڑی پل میں
کٹورے کی طرح گھڑیال کے غرق آسماں ہوتا +

لڑکپن کی غزل تھی نظر ثانی نے اصطلاح کی ۔

آنکھیں میری تلووں سے وہ ملجائے تو اچھا
یہ حسرت پا بوس نکل جائے تو اچھا

جو چشم کہ بے نم ہو وہ ہو کور تو بہتر +
جو دل کہ ہو بے داغ وہ جل جائے تو اچھا

بیمار محبت نے لیا تیرے سنبھالا
لیکن وہ سنبھالے سے سنبھل جائے تو اچھا

ہو تجھ سے عیادت جو نہ بیمار کی اپنے
لینے کو نہ جب اُس کی اجل جائے تو اچھا

کھینچے دل انسان کو نہ وہ زلف سیہ فام
سانپ اسکو اگر آ کے نگل جائے تو اچھا

اے گریہ نہ رکھ میرے تن خشک کو غرق آب
لکڑی کی طرح پانی میں گل جائے تو اچھا

تاثیر محبت تو عجب حب کا عمل ہے
لیکن یہ عمل یار پہ چل جائے تو اچھا

فرقت سے تیری تا نفس سینہ میں میرے
کانٹا سا کھٹکتا ہے نکل جائے تو اچھا

ہاں کچھ تو ہو حاصل ثمر نخل محبت ۔
یہ سینہ پھپھولوں سے جو پھل جائے تو اچھا

دل گر کے نظر سے تیری اٹھنے کا نہیں پھر
یہ گرنے سے پہلے ہی سنبھل جائے تو اچھا

وہ صبح کو آئے تو کروں باتوں میں دوپہر
اور چاہوں کہ دن تھوڑا سا ڈھل جائے تو اچھا

ڈھل جائے جو دن بھی تو اسی طرح کروں شام
اور پھر کہوں گر آج سے کل جائے تو اچھا

جب کل ہو تو پھر ہی کہوں کل کی طرح سے
گر آج کا دن بھی یونہیں ٹل جائے تو اچھا

القصہ نہیں چاہتا میں جائے وہ یہاں سے
دل میری ہی باتوں میں بہل جائے تو اچھا

ہے قطع رہ عشق میں اے ذوق ادب شرط
یہاں شمع نمط سر ہی کے بل جائے تو اچھا +

کہے ہے خنجر قاتل سے یہ گلو میرا +
کمی جو مجھ سے کرے تو پیئے لہو میرا +

مجھے وہ پردہ نشیں سامنے کبھی لے کے
جو ذکر آنے نہ دے اپنے روبرو میرا

نہ پہنچا گردن جاناں تک اور ٹوٹ کے ہاتھ
پڑا گلے میں میرے دست آرزو میرا

نہیں بلا سے کوئی یار عشق میں اے دل +
کہ غمگسار ہوں میں تیرا اور تو میرا

مقام وجد میں آئیں ابھی ملائک عرش
جو میکدہ میں سنیں شور ہائے ہو میرا

عجب نہیں ہے میری سوزش محبت سے
کہ تار شمع ہو ہر ایک تار مو میرا +

بزنگ آئینہ چشم پر آب سے میرے
گرا نہ اشک کیا پاس آبرو میرا

عطائی ای نگہ یار تجھ کو کچھ غیرت
کہ آگے تیغ اجل کے ہو سر فرو میرا

کروں میں کیا کہ گریبان صبح کی مانند
نہیں ہے چاک جگر قابل رفو میرا +

نظر جو آتا ہے اب تک فلک کا رنگ سیاہ
پڑا تھا سایہ بخت سیہ کبھو میرا +

ہمشہ میں ہوں اسی داؤ گھات میں اے ذوق
کہ رام ہو وہ غزال پلنگ خو میرا +

نہوا آب شہادت سے گلو تر نہوا
مستعد جب وہ ہوا ئے تو خنجر نہوا

جلکے میں خاک ہوا تو بھی رہا دل مضطر
یہ وہ سیماب ہے کشتہ نہوا پر نہوا

بے چراغ اسکو نہ رکھ داغ الم سے اے عشق
خانۂ دل کوئی ویرانہ ہوا گھر نہوا

کب صبا آئی تیرے کوچہ سے لے کر نہیں
جو حباب لب جو جامہ سے باہر نہ ہوا

خون برگہائے گلو لالہ بے سے میرے
آکے کب جوش پہ فوارہ سے ہمسر نہوا

عشق یہ معجزہ کیسا ہے کہ اس کشتہ کے
موئے سر حلق سے پیدا ہوا اور سر نہوا

ذوق بیمار محبت ہے خدا خیر کرے
کہ یہ آزار ہوا جسکو وہ جاں بر نہوا

جاں کے دلمیں سما جینے کا ارماں ہی رہا
دل کو بھی دیکھا کئے یہ بھی پریشاں ہی رہا

بعد مردن بھی خیال چشم فتاں ہی رہا
سبزۂ تربت میرا وقف غزالاں ہی رہا

میں ہمیشہ عاشق پیچیدہ معیاں ہی رہا
خاک پر روئیدہ میری عشق پیچاں ہی رہا

پستہ قندی ہے کام غیر میں وہ لعل لب
پر میرے حق میں تو سنگ زیر دنداں ہی رہا

بندھ سکا ہم سے نہ مضمون اُس دہان تنگ کا
ہاتھ اپنا فکر میں زیر زنخداں ہی رہا

جاہل منکر نہ آئے راہ پر معجز سے بھی
جہل سے بوجہل اپنے نا مسلماں ہی رہا

حلقہ زنجیر میں بھی دل رہا پا در رکاب
توسن وحشت ہمارا گرم جولاں ہی رہا

کب لباس دنیوی میں چھپتے ہیں روشن ضمیر
جامۂ فانوس میں بھی شعلہ عریاں ہی رہا

آدمیت اور شے ہے علم ہے کچھ اور چیز
کتنا طوطے کو پڑھایا پر وہ حیواں ہی رہا

جلوہ اے قاتل اگر تیرا نہیں حیرت فزا
دیدۂ بسمل نے کیا دیکھا کہ حیراں ہی رہا

حلقۂ گیسو میں دیکھی کسکے رخسارے کی تاب
شب مہ ہالہ نشیں سر در گریباں ہی رہا

مدتوں دل اور پیکاں دونو سینہ میں رہے
آخرش دل بے گیا خوں ہو کے پیکاں ہی رہا

سب کو دیکھا اُس سے اور اُسکو نہ دیکھا جوں نگاہ
وہ رہا آنکھوں میں اور آنکھوں سے پنہاں ہی رہا

آگے ان لیلیں بستی تھیں اور اب آنکھیں تری
مدتوں دل اپنا ہمیشہ کافرستاں ہی رہا

مجھ میں اُسمیں ربط ہے گویا بہ رنگ بو و گل
وہ رہا آغوش میں لیکن گریزاں ہی رہا

دین و ایماں ڈھونڈتا ہے ذوق کیا اس وقت میں
اب نہ کچھ دیں ہی رہا باقی نہ ایماں ہی رہا

طلسم طرفہ تر آنسو نے میرے مہرباں باندھا
کہ ہے ایک ایک گرہ میں حاصل صد بحر و کاں باندھا

تیرے جوڑے کے کھلنے نے میرا دل بستاں باندھا
عجب تقدیر نے عقدہ وہاں کھولا یہاں باندھا

یہ بتاں کرنے فشاے محبت کا یہاں باندھا
جو بعد از مرگ تو نے منہ کو میرے بدگماں باندھا

ہوئی تشہیر اس ناتواں کی جب تو پاؤں میں
کوئی تار نگاہ مو رہ جائے ریسماں باندھا

کیا مجنوں مجھے آشفتگی زلف نے کس کی
کہ میرے سر پہ مرغ شانہ سر نے آشیاں باندھا

تیرا ہنسنا جو یاد آیا برنگ قہقہہ مینا
تو میں نے تار اک رونے کا لے لے ہچکیاں باندھا

تڑپ کر دامن زیں کو نہ آلودہ کرے خوں سے
بھلا فتراک سے کیوں تو نے صید نیمجاں باندھا

نہ جھاڑا غیر کو تو نے کہ ہو کر جھاڑ لپٹا تھا
مجھے پر گالیوں کا جھاڑ تو نے بدزباں باندھا

وہ ہوں ناکام سمجھا نامرادی جو مراد اپنی
میرے مرقد پہ چلہ دشمنوں نے دوستاں باندھا

اڑا دینگے دھوئیں کی آنیں اس چرخ گرداں کے
اگر چکر دھوئیں نے دل کے زیر آسماں باندھا

فلک دا رستہ پھرنے دے ہے کوئی پر خر و شو کو
گیا ہی آخرش زنجیر سے پیل دماں باندھا

بلا ہوں مضطرب میں بھی مجھ سی برق نے دیکر
حصار ایک گرد اپنی شعلۂ جوالہ ساں باندھا

میرا دل آگے ہی سینہ میں ایک پھوڑا سا پکتا ہے
خیال خط سبز اس نے کیوں برگ پاں باندھا

دل مجروح پر میرے سمجھو داغ حسرت کا
پر طاؤس اس زخمی نے ہے دستاں باندھا

کہاں دل بھاگ کر جاوے کہ تیرے خط نے اے سرو دواں
عجب اک گرد نامہ خط نے اے سرو دواں باندھا

تپ عشق محبت کے لئے چارہ نہیں قمری
پھنڈیلوں گردن پہ کیوں اے تفتہ جاں باندھا

سمجھ کر موج دریائے فنا کو خنجر براں
کفن مثل حباب اے ذوق ہم نے سر سے یہاں باندھا

بھڑکنا کیا کہوں سینہ میں اپنے آتش غم کا
کہ جائے تپہ ہے ہر داغ پر شعلہ جہنم کا

جہاں میں عرصہ عشرت سے سوا دہ چند ہے غم کا
کہ ہے گر عید کا ایک دن تو عشرہ ہے محرم کا

تیرے عاشق کو ہے یوں خوشگوار آب دم خنجر
مسلماں کو لگے جس طرح شیریں آب زمزم کا

برنگ طوق قمری کوئی نکلے ہے نکالے سے
کمند گردن دل ہے جو حلقہ زلف پرخم کا

تیرے رخسار کا پرتو پڑے گر عارض گل پر
کرے چشمک زنی خورشید پر ہر قطرۂ شبنم کا

سے جاتے ہیں کس سے زخم اُس تیغ تبسم کے
کہ یہاں کھلتا ہے بخیہ سوزن عیسےٰ مریم کا

دلیران محبت کو خلش سے اسکی مژگاں کے
پس مردن لحد میں بھی ہے عالم چاہ رستم کا

خراش سینہ میں ایک آبگسا ہے ٹوٹ کر ناخن
غلط ہے جو سمجھتے ہیں کہ یہ پھاہا ہے مرہم کا

اگر آتش مزاجوں کو حسد ہو خاکسار و پر
تعجب کیا کہ ابلیس لعیں دشمن ہے آدم کا

خط اسکا وصل کی دولت کا ہے پیغام اے قاصد
لگا قسمت سے نسخہ ہاتھ یہ اکسیر اعظم کا

شہیدانِ ذوق سینہ میں ہوئی ہیں حسرتیں لاکھوں
میری جو آہ ہے گویا وہ ہے ایک نخل ماتم کا

یہ گلدستہ تیس ہزاری باغ میں بنایا تھا سنہ ۱۲۶۰ ہجری

گل اس نگہ کے زخم رسیدوں میں مل گیا
یہ بھی لہو لگا کے شہیدوں میں مل گیا

لذت کو تیغ عشق کی سن سُنکے بُلہوس
آکر بلخ سا حلق بریدوں میں مل گیا

گر بعد فقر پھر سگِ دنیا ہوا فقیر
کمبخت پاک ہو کے پلیدوں میں مل گیا

آخر کو فیض بیعت دستِ سبوسی آج
پیر مغاں کے میں بھی مریدوں میں مل گیا

دکھلا کے کہکشاں سے فلک چاک سینہ اپنا
اُس ماہوش کے سینہ دریدوں میں مل گیا

آتش مثل ہے ہوا وہ طلبگار دید یار
صاف آئینہ کا نقشہ ندیدوں میں مل گیا

حب حسینؑ ذوق وہ شے ہے کہ جس سے حُر
تھا گرچہ اشقیا میں سعیدوں میں مل گیا

سنہ ۱۲۶۰ھ کی چمن بندی ہے۔

وہ کون ہے جو مجھ پہ تاسف نہیں کرتا
پر میرا جگر دیکھ کہ میں اُف نہیں کرتا

کیا قہر ہے وقفہ ہے ابھی آنے میں اُنکے
اور دم میرا جانے میں توقف نہیں کرتا

کس لطف سے ہے آیا طلبگار دیدار

تا صاف کرے دل نہ مئے صاف سے صوفی
کچھ سودِ صفا علم تصوف نہیں کرتا

دل فقر کی دولت سے میرا اتنا غنی ہے
دنیا کے زر و مال پہ تاسف نہیں کرتا

پڑھتا نہیں خط غیر میرا واہ کسی عنواں
جب تک کہ عبارت میں تصرف نہیں کرتا

کچھ اور گماں گذرے نہ دل میں تیرے کافر
یاد اس لئے میں سورہ یوسف نہیں کرتا

اے ذوق تکلف میں ہے تکلیف سراسر
آرام سے وہ ہے جو تکلف نہیں کرتا

یہ غزل ہے جو شاہ نصیر مرحوم سے سلسلہ تلمذ قطع ہو گیا تھا (دیکھو صفحہ ۶)

ہر گام پر رکھے ہے وہ یہ ہوشِ نقشِ پا
ہو خاکِ عاشقاں نہ ہم آغوشِ نقشِ پا

افتادگاں کو بے سر و ساماں نہ جانیو
دامانِ خاک ہوتا ہے روپوشِ نقشِ پا

اعجاز پا سے تیرے عجب کیا کہ راہ میں
بول اٹھے مُنہ سے ہر لبِ خاموشِ نقشِ پا

اس رہگذر میں کس کو ہوئی فرصت مقام
بیٹھے ہے نقش پا پہ سرِ دوشِ نقشِ پا

جسم نزار خاک نشینان کوئے عشق
یوں ہے زمیں پہ جیسے تن و توشِ نقشِ پا

فیض برہنہ پائے مجنوں سے دشت میں
ہر آبلہ بنے ہے دُرِ گوشِ نقشِ پا

پابوس درکنار کہ اپنی تو خاک بھی
پہنچی نہ ذوق اس کے بآغوشِ نقشِ پا +

اب ردیف الف کی وہ غزلیں لکھتا ہوں جنکا حال دیباچہ کے صفحہ ۲۸ میں لکھ چکا ہوں ایسے اشعار اپنے کبھی کسی سے سنتے یا خود یاد آجاتے تو سناتے اور عجب محبت سے فرماتے یہ ہمارا بچپن کا کلام ہے نظر ثانی کرینگے پھر دیوان میں داخل کرینگے اور کچھ کچھ اصلاح کرتے بھی جاتے تھے مگر والد مرحوم کے تقاضوں سے اور میری حاضر باشی سے جس مسودے کو درست کر دیتے تھے نئی غزل مرصع ہو جاتی تھی

ہائے وقت تھا کہ گذر گیا۔ یاد کرتا ہوں اور روتا ہوں۔ اور نہیں پاتا۔ اب جو کچھ ہے یہی غنیمت ہے۔ جیسے ہیں نقل کر دیتا ہوں۔ ضائع ہوئے تو یہ یادگار بھی نہ رہیگی۔ موئی مٹی کی نشانی اسے کہتے ہیں۔ انتہائے کلام تو سب سے سُن چکے! ابتدا کلام آزاد سے سنو۔

جل اٹھا شمع نمط تار رگِ جاں میرا
آہ روشن نہ ہوا کلبۂ احزاں میرا

ہلتے دیکھے جو لبِ زخم تو بولا قاتل
آج تیرا ہے دہن اور نمکداں میرا

کر کے بسمل مجھے کس ناز سے کہتا ہے وہ شوخ
دیکھ تڑپے تو نہ خوں سے کہیں داماں میرا

اے جنوں! دن ہے سوا رات کو روشن کر دے
مہر گردوں ہو جو داغ دل سوزاں میرا

خار وحشت سے کہو چھیڑ دے دامن دل کا
ہے خط جادہ ترا چاک گریباں میرا

دھیان میں آئینہ رخ کے گئی جان نکل
رہگیا ہائے کھلا دیدۂ حیراں میرا

اے جنوں تو بھی ہو دنیا میں یونہی خانہ خراب
خاک در خاک کیا خانۂ ویراں میرا

نظم معنی کا بکھیڑا ابھی حرفے سے حرف
باندھیں گر اہل سخن حال پریشاں میرا

خندۂ جام کو مینا کے لبوں پر رکھدو
دیکھو پھر ہنستا ہے کیا کیا لب خنداں میرا

اپنا رونا مجھے ہنسنے سے مبارک ہو ذوق
دیکھ خنداں ہو جو وہ دیدۂ گریاں میرا

آغاز شباب کی غزل ہے۔ شاہ نصیر مرحوم کا ایک قلمی دیوان کتب خانہ آزاد میں موجود ہے اُن کی بھی ایک غزل اسی طرح میں درج ہے۔

رکھتے تھے جو کشور سر و قیصر زیر پا
ہے اُنہی کا آج سر تاج و افسر زیر پا

اے جنوں! ہم پا برہنہ۔ گرم پتھر زیر پا
دوپہر ہے۔ سایہ بھی بیٹھا ہے چھپکر زیر پا

تم چلو رکھکر جو میرا دیدۂ تر زیر پا
پُل ہوں بحر اشک پر مژگاں سراسر زیر پا

خاکساری کو ہماری مل گئی اکسیر عشق
اب تو پارس ہو گا جو آئیگا پتھر زیر پا

میری آنکھوں کو ملو تم لیکے تلووں کے تلے
کیوں نشے میں تو تے ہو رکھکے ساغر زیر پا

ہے نماز کشتہ قامت بجائے جانماز
اے قیامت لا بچھا دامان محشر زیر پا

زیر دستی پر بھی ہے موقوف سے لازم احترام
جب دبے گا سانپ کاٹے گا مقرر زیر پا

ہیں ترے مجنوں کے مژگاں وادیٔ وحشت کے خار
راہ آنکھوں کے نکل آئے ہیں چھکر زیر پا

بوئے گل سیدھی کے گلبن ریشک گل گھلوں میں تو
آکھڑا ہو کھلکے میرا کاسہ سر زیر پا

فاتحہ عاشق کا دیتا ہے تو واجب ہے ادب
اپنے کفش پا کو رکھلے پا سے باہر زیر پا

میں ہوں وہ کشتی شکستہ بحر الفت میں صبا
ایک تختہ رہگیا ہے جسکے بچ کر زیر پا

قصر تن کو ذوق سب غارت کریگا ایک دن
چیونٹیوں کا پھر ہے یہ جو لشکر زیر پا +

اُسی عالم میں یہ غزل ایک[1] مرشد زادہ کی فرمایش سے کہی تھی اُنھیں گانے بجانے کا بہت شوق تھا۔ اُسی کیلئے غزل کہوائی تھی۔ نظر ثانی اس پر بھی نہیں ہوئی۔

دشمن جاں یک بیک سا رازدانہ ہو گیا
ہائے تاثیر محبت یہ ستم کیا ہو گیا

تم میں تھا یا مجھ میں تھا دل پھر کہو کیا ہو گیا
دل کے جانیکا تو عالم کو اچنبھا ہو گیا

جسکو اے ظالم تری مژگاں کا کھٹکا ہو گیا
سو کھکرا ایسا ہوا دلا کہ کانٹا ہو گیا

ہم نے اُن سے دوستی کی وہ ہیں کرتے دشمنی
دیکھو کیا سوچا تھا ہم نے اور کیا کیا ہو گیا

یاد گلگوں نے جو رنگ رخ کو روشن کر دیا
پہلے تھا گلرنگ مکھڑا پھر بھبوکا ہو گیا

جب تھا تابوت تیرے کشتہ حسرت کا آہ
شور ماتم تھا کہ ایک عالم میں برپا ہو گیا

[1] مرشد زادہ اہل قلعہ کے محاورہ میں عموماً شہزادہ کو کہتے تھے اور جو شہزادے قرابت قریبی کے لحاظ سے ایک وقت دعوے فرمانروائی سلطنت کے ہو سکتے تھے وہ سلاطین کہلاتے تھے مثلاً شاہ موجود کا چچا۔ بھائی۔ وغیرہ وغیرہ +

تم نے کل عزم سفر کا ہم کو تھا بھیجا پیام
لو سفر یہاں آج دنیا سے ہمارا ہو گیا

پھر چلو اے حضرت دل ہو چکا منا بس اب
آج گھر میں غیر کے پھر اُن کا رہنا ہو گیا

مرزا جینا ایک جھانکے ہے نگاہوں پر تری
جس نظر سے آنکھ بھر کر تو نے دیکھا ہو گیا

خط لکھا مجھکو تو اس میں نام بھی پورا نہ تھا
کیا کہوں قسمت کا لکھا آج پورا ہو گیا

وہ تو خود شعلہ تھا جب میں نے کہا ہو شعلہ خو
اس طپیفہ سے بھڑک کر آگ دونا ہو گیا

غیر کے گھر ہم سے تو اُڑ کر اگر پہنچا تو کیا
تیرے جانیکا تو اک عالم میں چرچا ہو گیا

گرم ہو کر آتا ہے منہ پر مرے طفل سرشک
دیکھ کیا اے چشم تر ابتر یہ لڑکا ہو گیا

کر دیا تیغ نگہ نے ایک عالم کا ہے خوں
نام بدنام اے صنم ناحق قضا کا ہو گیا

یا دو زلف عنبریں میں رات یہ آہیں بھریں
گنبد گردوں سیہ سارا کا سارا ہو گیا

ذوق نے ہو زلف کو چھیڑا تو لے مجھ سے قسم
تو نے خود چھیڑا اُسے اور برہم اتنا ہو گیا

یہ بھی ابتدائی مشق تھی نظر ثانی نہیں ہوئی -

کوہ کے چشموں سے اشکوں کو نکلتے دیکھا
اے صنم پر ترا پتھر نہ پگلتے دیکھا

ضعف سے سینہ میں آتا ہے میرا دم جسطرح
ریگ کو شیشۂ ساعت میں چلتے دیکھا

تھا میں اس باغ میں نخل گل آتش بازی
پھولتے دیکھا مگر آہ نہ پھلتے دیکھا

اُس رخ و زلف کے آگے نہ ہوا مہ کو دوغ
آگے کالے کے دیا کس نے ہے جلتے دیکھا

اے صبا جنبش سنبہ کے سوا کس کو بھلا
موچھل گو نہ غزالاں پہ ہے جھلتے دیکھا

جو چڑھا اوج فنا پر وہ گرا سایہ نمط
پانو اس کو نہ ٹھہرتے ہے بکا پھسلتے دیکھا

کوئے جانا میں ہے دل جیسا گیا قابو سے
ہم نے بچہ کو بھی ایسا نہ مچلتے دیکھا

زلف کہتی ہے درگوش سے کھلا دے کوئی
گر سویدا سے ناگن کو ہوٹلتے دیکھا

کج ادائی گئی کب ہم سے ترے ابرو کی
شاخ آہو سے ہے خم کس نے نکلتے دیکھا

اشک کو لیتا نہ دامن میں تو کیا کرتا میں
گاہوارہ میں یہ لڑکا نہ سنبھلتے دیکھا

جا چھپا شرم سے ظلمات میں جو آب حیات
تجکو ذلتوں پہ بسی ہے کبھی ملتے دیکھا

کوئے جاناں سے ہم اور خلد سے آدم نکلے
انکو دیکھا نہیں پر ہم کو نکلتے دیکھا

خانہ دل کے سوا آتش غم سے اے ذوق
سامنے آنکھوں کے گھر کس نے ہے جلتے دیکھا

برنگ گل صبا سے کب کھلا دلگیر دل میرا
کہ ہے باغ جہاں میں غنچہ تصویر دل میرا

خط و عارض کا تیرے رات دن جو دھیان رکھتا ہے
تلاوت کرتا ہے قرآن با تفسیر دل میرا

ورق پر سینہ کے کھینچا ہے تار اشک سے سطر
کریگا شرح درد عشق کچھ تحریر دل میرا

سنبھالے رکھ فرائے سماں دیکھ اپنے دامن کو
زمیں پر کھینچتا ہے نالہ شبگیر دل میرا

بتونکی سرد مہری نے کھلا دی زعفراں لیکن
کرے کیا گر مجوشی ہو گیا کشمیر دل میرا

تری چشم فسوں گر نے کہاں سیکھا تھا یہ جادو
کیا ہے ایک نگہ میں اے پری تسخیر دل میرا

تصور میں کسی تیغ نگہ کے کشتہ الفت
ہوا تسخیر کر کے صاحب شمشیر دل میرا

بتو! گر حسن کی دولت سے تم ہو بیگئے پارس
ہوا ہے کیمیائے عشق سے اکسیر دل میرا

کبھی منت کی زنجیر انکو پہنے اس نے دیکھا تھا
ہے اب تک پہنے تار اشک کی زنجیر دل میرا

نشاں تو رہنے دے قاتل ذرا ساخوں لگا دونمیں
قیامت میں ترا تا ہو دامنگیر دل میرا

بتوں کا عشق ہے گر ذوق تو ساری خدائی میں
کریگا شہر شہر ایک دن مجھے تشہیر دل میرا

یہ بھی ابتدائی مشق تھی۔ شاہ نصیر مرحوم اپنی غزلوں میں کبھی کبھی ایک قطعہ بھی کہدیتے تھے۔ اندونکی غزلوں میں انہوں نے بھی ایک ایک قطعہ لگا دیا ہے۔ بات یہ ہے کہ جب جوشِ طبع عالم طفولیت میں ہوتا ہے تو ایسے ذوق وشوق پیدا کر دیتا ہے۔ یہ اسی عہد کے خیال ہیں۔

اُن سے کچھ وصل کا ذکر اب نہیں لانا اچھا
وہ جو کچھ کہویں تو تم بھی کہے جانا اچھا

تم نے دشمن ہے جو اپنا ہمیں جانا اچھا!
یار ناداں سے تو ہے دشمنِ دانا اچھا

پھول گل سیدھی کے لالا کے نہ ہاتھو نہیں لو
خونِ عاشق نہیں مرقد پہ بہانا اچھا

طائرِ جاں کے سوا رکوچہ جانا کی طرف
نامہ بر کون ہے جو کیجیے روانہ اچھا

طاقِ ابرو کے تصور میں دلا کھینچ نہ آہ
سمتِ کعبہ پہ نہیں تیر لگانا اچھا

بدگماں دیکھو کچھ اسمیں بھی ڈالیں رخنہ
روزن در سے نہیں آنکھ لڑانا اچھا

آتشِ عشق ہے سینہ میں دبی دیکھ ہی چشم
اب نہیں دامنِ مژگاں کا ہلانا اچھا

بیٹھ رہ کر کے قناعت۔ کہ بشکل میرِ نو
چھوڑ ئے آدھی تو نہیں سیری کو جانا اچھا

مرغِ دل نے نگہ یار سے پوچھا اُڑ کر
پھر بھی کہنا کہ لگاتے ہیں نشانہ اچھا

یہاں تو دم میں نہیں دم اور وہ لئے تیغ دودم
کہتے ہیں دیکھو نہیں دم کا چرانا اچھا

طرۂ شمشاد دکھاتا ہے تری زلفو نکو
لاؤ آرہ کہ یہی اسکو ہے شانہ اچھا

ساقیا اب ہے آیا تو بڑھا خم پر ہاتھ
ق
کہ گھٹا میں نہیں ہمت کا گھٹانا اچھا

جلکے گر قطرۂ خوں دل کا ہوا اشک آلود
تو نہیں نیچہ مژگاں سے گرانا اچھا

گردشِ عمر میں تسبیح سلیمانی کا
آج ایک ہاتھ لگا ہے مے دانا اچھا

سامنے یار کے اے ذوق بہانا آنسو۔
ہے تو چاہت کے جتانے کو بہانا اچھا

چاہے عالم میں فروغ اپنا تو کچھ ہو سے جدا
دیکھ چمکے ہے شرر ہوتے ہی پتھر سے جدا

کیجو مشاطہ نہ سنبرہ گوشِ دلبر سے جدا
بدنما ہے گر رکھیں مینا کو ساغر سے جدا

دل مرا یار نے ہو زلفِ معنبر سے جدا
سر جدا ہو تن سے یہ سودا نہو سر سے جدا

لکھے شرحِ سوزشِ ہجراں جو تیرا بیقرار
ہوں تڑپ کر جوں شررِ نکتہ دفتر سے جدا

فندقِ پائے نگاریں کا ہو نیں سودا زدہ
قطرہ خوں بھی نہ ہو گا نوکِ نشتر سے جدا

شیشہ دل میں ہے کیا چمکا شرارِ عشقِ یار
شیشہ گر رکھ تو بھی شیشہ کو نہ اخگر سے جدا

خطِ شرخِ ناتوانی ہو گیا اٹھتے ہی آہ
جوں پرِ کمزور بازوئے کبوتر سے جدا

حضرتِ آدم کو شیطاں نے نکالا خلد سے
غیر نے ہم کو کیا ہے کوئے دلبر سے جدا

ذوق ہے ترکِ وطن میں صاف نقصِ آبرو
بکتے پھرتے ہیں گہر ہو کر سمندر سے جدا

نظر ثانی سے نور نہیں پایا۔

لختِ دل اور اشکِ تر۔ دونو ہم دونو جدا
ہیں رواں دوشِ سفر۔ دونو ہم۔ دونو جدا

میں چکھوا ہوں نہ وہ چکھی پھر آخر کسلئے
رہتے ہیں شب تا سحر۔ دونو ہم۔ دونو جدا

وصل کی شب نگہت و گل کی طرح ہم آغوش
رہتے ہیں باہم دگر۔ دونو ہم۔ دونو جدا

شکلِ عکس و آئینہ۔ تیرا خیال اور میرا دل
آئینے ہیں سیمبر۔ دونو ہم۔ دونو جدا

ذوق ہیں سینہ میں اوراقِ جلا جل کی طرح
دل جگر باشور و شر۔ دونو ہم۔ دونو جدا

اُسی عالم کا کلام ہے۔

لعلِ لب و دندانِ صنم کا دل نے جب سے خیال کیا
صمّ بکمٌ کہتے ہے گویا ہم نے زباں کو لال کیا

لیگا دلا اس عشق سے کیا تو جس نے کیے ہے وہ صحرا میں
مجنوں کا وہ حال کیا فرہاد کا ہے وہ حال کیا

پھرتا ہے تو اے چاند کے ٹکڑے بسکہ شب و روز آنکھوں میں
دل نے روشن ہو کے شب فرقت کو ہے روز وصال کیا

آتش گل ہوئی روشن واں یہاں چمکا ہمارے دل کا جنوں
موسم گل نے کیا ہنگامہ گرم ہے اب کے سال کیا

سادہ رخوں سے کی جو محبت تیری ہی تھی یہ دل
منہ چڑھا اس شوخ کے اپنا کالا منہ اے خال کیا

مومن ایسا لاؤں کہاں سے جو یہ کرے تحریر انہیں
حال تو دیکھو تم نے مجھے ہر موئے تن ہے بال کیا

نامہ یار کو رکھیے بچو تو ہمدم میرے زیر کفن
نامہ جواب نامہ ہے اپنا وہاں جو کسی نے سوال کیا

شمع نمط ہر خار جنوں کی انگلی پگلی جاتی ہے
آبلو نہیں تیرا تھا گر تو ناحق کیوں پامال کیا

آگ ہے دل میں۔ درد جگر میں۔ آنکھ میں آنسو۔ لب پہ فغاں
عشق نے اس کے ذوق ہمارا دیکھ لو ہے یہ حال کیا

ایضاً از عالم بالا۔

ہجر میں کیا کیا مرض ہے سنگدل پیدا ہوا
حول دل پیدا ہوا۔ آزار سل پیدا ہوا

تیرہ بختی تھی اسی دن اپنی روشن ہو گئی
روتے تاباں پر تمہارے جب تھا تل پیدا ہوا

یا الٰہی کیا کہوں تیری عنایت کے سوا
میں نے کیا ایسا کیا جو ایسا دل پیدا ہوا

غیر کے چھلے ہے ہاتھ تو نے جو کل کھائے تو یہاں
داغ تازہ داغ دل کے متصل پیدا ہوا

اس لب لعلیں سے پیہم جلوۂ رنگ مسی
یا کہ نافرمان و لالہ مشتعل پیدا ہوا

کر کے وعدہ رات کو جو راہ سے تو پھر گیا
وہم کیا دل میں یہ اے پیماں شکن پیدا ہوا

خاکساری نے اسی دن روشنی پائی تھی ذوق
آدم خاکی کا جس دن آب و گل پیدا ہوا

رکھ دل جلوں کی خاک پہ تو بافراغ پا
سوز درون ہی ہے پہ ہونگے نہ داغ پا

تو باغ میں رکھے اگر اے شاکِ باغ پا
پھر آئی وہاں خزاں تو وہیں ہو وہیں داغ پا

وہ آوے میرے گھر میں رقیبوں کو لیکے آئے!
بلبل کے آشیاں میں رکھے حیف زاغ پا

گر کوے یار میں نہیں ملتا پتا تو پھر +
تو کوے زلف یار میں دل کا سراغ پا

روئینگی پھوٹ پھوٹ کے ہر چشم کبلہ
جوشِ جنوں میں رکھ نہ سوئے کوہ و راغ پا

ہم دل جلوں کی خاک پہ رکھیو نہ تو قدم
اِس سے تو ڈالیو بیابان اجاغ پا

اس گل سے گر اجازت پابوس ہو نصیب
ہو جائے چوم چوم کے دل باغ باغ پا

اُچھلے ہے شیخ وجد میں اسطرح بار بار
جس طرح بدلگام ہو گھوڑا چراغ پا

ساقی کا دو چشم ہو گر برکنار آب
پائے حباب آبِ رواں سے ایاغ پا

ہے جی میں آج نمط اے سرو خوش خرام
دھو دھو پیا کریں ترے بے داغ پا

اے ذوق کیوں چمن میں وہ گل جائے جسکے ہوں
رنگ حنا سے غیرتِ صد پائیں باغ پا +

تجھ کو یوسف سے کیا حسن میں برتر پیدا
گر کیا اس کو پیمبر تجھے کافر پیدا

ہو جہاں کشتۂ مژگاں کا تمہارے مدفن
عوض سبزہ ہو وہاں خاک سے نشتر پیدا

عاجزی سے رہے۔ آئے نہ ہوا میں کمزور
موت ہی چیونٹی کی ہو دیں اگر پر پیدا

قصد پرواز کرے کیوں نہ مرا طائرِ روح
تیرے خنجر سے جو پہلو میں ہو نشتر پیدا

خط ترے شعلۂ رخسار پہ ہے معجزِ حسن
ورنہ ہو سبزہ بھلا آگ پہ کیونکر پیدا

خاکِ دل سوختہ یک مشت ہو گر صرفِ چمن
ہوویں غنچوں کی جگہ باغ میں اخگر پیدا

رخ روشن پہ عیاں ہیں جو عرق کے قطرے
کیا تماشا ہے کہ دن کو ہوئے اختر پیدا

دُرفشاں وقتِ سخن ہیں لبِ نگیں تیرے
ہوتے گویا ہیں یہاں لعل سے گوہر پیدا

اشک گرم ایک بھی دریا میں جو ٹپکے میرا	جائے ماہی ہو تہِ آب سمندر پیدا
آسماں سخت مزاجوں کو ہنر دیتا ہے	دیکھ لو ہوتے ہیں فولاد میں جوہر پیدا
سر کٹانے میں مزا وہ ہے کہ جی چاہتا ہے	سر ہر مو مجھے بدن ہو مجھے جدا سر پیدا

بے کلیں ہوتی نہیں ریب مکاں کی اے ذوق
خانۂ دل ہے تو کر لو رخ دلبر پیدا

غزل مذکورہ بالا بھی تیس ہزاری باغ میں کہی تھی۔ مجھے یاد ہے مقطع کا مصرع ثانی کئی طرح کہا۔ اور پسند نہ آیا۔ پھر فرمایا۔ خیر جب صاف کرینگے تو سمجھ لینگے۔ اب آگے چلو۔ کیکاؤس غزل شروع کر دی۔

لکھنؤ میں ایکدن میں اور مولوی سید علیخاں ارسطو جاہ کے دونو صاحبزادے میر انیس مرحوم کے پاس گئے۔ اور پہلی ہی ملاقات تھی۔ اثنائے گفتگو میں ایک موقع پر میں نے مطلع پڑھا۔

کوئی آوارہ تیرے نیچے اے گردوں ٹھیر یگا	ولیکن تو بھی گر چاہے کہ میں ٹھیروں۔ نہ ٹھیر یگا

میر مرحوم نے پھر پڑھوایا۔ اور کہا کیا خوب کہا ہے یہ مکسا ہے۔ میں نے کہا شیخ ابراہیم ذوق کا۔ کچھ گفتگو کے بعد پھر کہا کہ وہ مطلع ذرا پھر پڑھئے گا۔ میر شریف حسن خاں صاحب نے کہا۔ اُنکے شعر آپکو بھی پسند ہیں؟ اور کچھ تعریف کے لفظ کہے۔ میر صاحب نے کہا کہ جی ہاں۔ دلی میں میاں خواجہ میر کے بعد یہی ہوئے اور شاعر کون ہوا؟ تھوڑی دیر کے بعد ہم رخصت ہوئے۔ کھڑے ہو کر انہوں نے پھر کہا کہ ذرا وہ شعر پڑھدیجئے گا۔ میر شریف حسن صاحب نے کہا کہ آپکو یہ شعر اتنا پسند کیوں آیا۔ اُنہوں نے کہا دوسرے مصرع میں قافیہ ایسے پہلو سے بیٹھا ہے۔ کہ وہ اُسکا حق ہے۔ میر شریف حسن صاحب بولے کہ آپکو کیا حاجت ہے وہ نہ ہوا اور لگا لیا۔ فرمایا۔ نہیں۔ وہ استاد تھے۔ جو اُنہوں نے کہا وہی لفظ ہو تو ہو۔ اور ہو تو نہیں ہوتا۔

ترے تھوں کوئی آوارہ اے گردوں ٹھیرے گا	ولیکن تو بھی گر چاہے کہ میں ٹھیروں نہ ٹھیرے گا

جو تھک کر نا قہ لیلیٰ سر راہ نہ ٹھیرے گا
اگر سو کوس ہو گا نجد تو مجنوں نہ ٹھیرے گا

وہ دولت کا طلب جس سے کہ دل ہو جائے مستغنی
اگر ہاتھ آئیگا گنجینہ قارون نہ ٹھیرے گا

گرا ہوں چشم ساقی سے مری تصویر میں بھی مے
بنا دیگا کوئی جام مے کلگوں نہ ٹھیرے گا

سر بالیں سے ہمدم کوئی دم تو ٹھہرنے دے
ابھی سے کیا کہوں حال دل محزوں نہ ٹھیرے گا

بتاتے ہو علاج اشک جو اُس خال کا بوسہ
طبیبو آب نزلہ ہے یہ کہ بے افیوں نہ ٹھیرے گا

یہی ہے دل کی بیتابی تو بعد از مرگ بھی قاتل
نہ ٹھیرا ہے زمیں پر عاشق محزوں نہ ٹھیرے گا

قتل کرتی ہے نگہ شہرہ نگاہ یار کا
سچ کہا ہے باڑ کاٹے نام ہو تلوار کا

گرد کھاؤں عالم اپنے نالہائے زار کا
کام لوں ہر تار مو سے تار مو سیقار کا

کوچہ زلف بتاں میں دل پڑا ہے گلہیں
پوچھتے ہو کیا ٹھکانا اُس خدائی خوار کا

کعبہ کے دیوار و در سے نور کے جلوے اُٹھیں
گر پڑے سایہ مرے بتخانہ کی دیوار کا

آنسوں میں شمع بالیں سے برستے ہیں جو پھول
میں شہید ناز ہوں کس آتشیں رخسار کا

استخواں اس سوختہ جاں کی نہ کھانا زینہار
اے ہما یہ رزق ہے مرغان آتش خوار کا

نالۂ بلبل میں گر پیدا اثر ہو جائے گا
خندۂ گل خندہ زخم جگر ہو جائے گا

کشتی بحر شہادت ہے ترے بسمل کو تیغ
اب اُدھر سے دیکھنا دم میں اِدھر ہو جائے گا

ہم نے جانا تھا کہ قاصد جلد لائیگا خبر +
کیا خبر تھی جا کے وہاں خود بے خبر ہو جائے گا

شکل تو دیکھو مصور کھینچیگا تصویر یار
آپ ہی تصویر اُسکو دیکھکر ہو جائے گا

آدم دوبارہ سوے بہشت بریں گیا
دیکھو جہاں خراب ہوا پھر وہیں گیا

+ ہم نے جانا تھا کہ قاصد جلد لائیگا خبر

دنیا گئی کہ عشق میں ایمان و دیں گیا
وہ مل گیا تو جانئے کچھ بھی نہیں گیا

خورشید وار چرخ پہ چمکا کوئی تو کیا
آخر کو پھر جو دیکھا تو زیر زمیں گیا

دیکھا کہیں نہ اسکو جو دیکھا تو اپنے پاس
میں دور دور جوں نگہ دور بیں گیا

کیا کیا مزا نہ تیرے ستم کا اُٹھا لیا
ہم نے بھی لطف زندگی اچھا اُٹھا لیا

یوں لائے ہاں سے ہم دل سیپارہ کرکے جمع
دیکھا جہاں پڑا کوئی ٹکڑا اُٹھا لیا

جو بار آسمان و زمیں سے نہ اُٹھ سکا
تو نے غضب کیا دل شیدا اُٹھا لیا

سر ہم نے جب سے پائے صنم پر ہے رکھدیا
دونو جہاں سے دست تمنا اُٹھا لیا

مرض الوفات سے تین دن پہلے غزل کہی اور مجھے سُنائی۔ پھر ملازم کو دی کہ اندر کے طاق میں احتیاط سے رکھدے۔ میں اکثر اُسی وقت اپنی کتاب میں نقل کر لیتا تھا۔ بدترین اتفاق یہ کہ اس وقت خیال نہ آیا۔ دوسرے دن بیمار ہو گئے۔ پھر نقل کا کسے ہوش تھا۔ انتقال کے بعد ہر چند ڈھونڈی۔ نہ ملی۔ ۴ شعر یاد رہ گئے وہی لکھدیتا ہوں۔

کیا کہیں اُس سے جو ہو ہم سے زیادہ جانتا
وہ ارادہ ہے ہمارا بے ارادہ جانتا

بولتا بڑھ بڑھ کے اتنا کیوں بشر مست غرور
گر بڑا بول اپنا قاضی کا پیادہ جانتا

کرتا ہے جب نالہ اپنا عالم بالا کی سیر
ہے فلک پر کہکشاں کو خط جادہ جانتا

آفتاب حسن کو کیا خاکسار و نکا ہو درد
پا فتادہ کا ہے در دازپا فتادہ جانتا

کروں درد آشنا کیونکر دل احباب اپنا سا
بلا سے جیسا میں ہوں ڈھنڈولوں پیتاب اپنا سا

ملک سجدہ کریں آدم کو کیا ذرہ نوازی ہے
دیا بندہ کو اپنے اُسنے خود آداب اپنا سا

از مرتبہ شیدا نے کر اٹھا یا ورنہ کو
از بندہ

آنا تو خفا آنا ۔ جانا تو رُلا جانا
آنا ہے تو کیا آنا ۔ جانا ہے تو کیا جانا +

کیا طبع میں جودت ہے چٹ دل کی اُڑا جانا
ہونٹوں کا یہاں ہلنا ۔ وہاں بات کا پا جانا

اے دل نہ راہ عشق کشادہ سمجھ کے جا +
یہاں اژدہا ہے ہر خط جادہ سمجھ کے جا

عیاریوں سے یار کی نالاں ہے کیوں دلا
اَور اُس کو اپنا دوست زیادہ سمجھ کے جا

اگر رقصاں نہ سرپا سان یار پر دیکھا
تو سرفرازی کا اپنے کیا تماشا اپنا سر دیکھا

جہاں باریک بین و نا تواں ہیں اسقدر دیکھا
ہلال انتیسویں کا سب کو منظور نظر دیکھا

رہیگا تشنہ لب ۔ سیراب یہ سیل نہو دیگا
میسّر جبتک آنخجر قاتل نہ ہو دیگا

کوئی اے لالہ رو اس حسن کا قائل نہو دیگا
اگر مُہر گواہی میرا داغ دل نہ ہو دیگا

چاندنی نے شب تجھ بن یہ پیچ دکھایا تھا
مجھ کو ماہتابی پر ۔ دھوپ میں بٹھایا تھا

بعد فراق کوئی دن ایسا نہ وصل کا ہوا
وہ کہیں تمکو کیا ہوا ۔ ہم کہیں تمکو کیا ہوا

آدمی گر ہو مکدر کیا قصور ادراک کا
خاک کا پتلا ہے یہ کچھ تو اثر ہو خاک کا

کیوں کہکے مکرتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
کر جو تجھے کہنا ہے ۔ کہ میں کچھ نہیں کہتا

+ کوئی رو سے کتابی کا تیرے فال ہو دیگا۔

وہ دیکھیں کس طرح سے روز فرقت دیکھکر جیتا
کہ جو عاشق ہو تیرا تیری صورت دیکھکر جیتا

جب قیامت قد ترا اے شاخ گلشن بنگیا
اختر صبح قیامت خال گردن بنگیا

نشۂ پندار سے ابلیس رہ گم کردہ تھا
ورنہ آدم میں دھرا کیا تھا وہی پردہ تھا

بعد فراغ عشق تھا جو درس مکتب خانہ تھا
کاف کہ کے ہا سبق کیا جانے کیا تھا کیا نہ تھا

مژہ پیکاں کا ہے ٹکڑا کہ سری کا ٹکڑا
مکھڑا ہے چاند کا ٹکڑا کہ پری کا ٹکڑا

بل بے گریہ گل زمیں ہو کر قدم گڑنے لگا
اور قدم اکھڑے تو کیا دیکھا بھنور پڑنے لگا

دل کی طپش سے زخم جگر کا رات جو ٹانکا ٹوٹ گیا
طائر جان جو پختہ بپا تھا فرصت پاکر چھوٹ گیا

ضبط گریہ نے تماشا طرفہ تر دکھلا دیا
چشم کے کوزہ میں دریا بند کر دکھلا دیا

ہاتھ آکر دل وحشی جو کوئی چھوٹ گیا
ہوس صید سے صیاد کا بھی جھوٹ گیا

لگا ہے تیر دل پر آہ کس کافر کی مژگاں کا
نشاں سوفار کا معلوم ہوتا ہے پیکاں کا

دل کہاں جس پر گماں ہو غنچہ تصویر کا
ہے کوئی سینہ میں خوں آلودہ پیکاں تیر کا

چشم و نگہ کو تیرے بدنام کیوں کریگا
مرگ و قضا کو تیرا عاشق نہ لے مریگا +

عہد پیری نے بھلایا دوڑ چلنا کودنا
اے طفلی کھیلنا کھانا اچھلنا کودنا

مسجد میں اُس نے ہم کو آنکھیں دکھا کے مارا
کافر کی دیکھو شوخی گھر میں خدا کے مارا

ہوئے انساں ہم درد محبت کے لئے پیدا
فرشتے ہوتے گر ہوتے عبادت کے لئے پیدا

یارب اِس زمانہ کے لوگوں کو کیا ہوا
جس کا برا ہو انکو یہ کہنا بھلا ہوا

آج غصہ سے ادھر کو دست قاتل اُٹھ گیا
بس بھر و ساز زندگی کا ہم کو ایدل اُٹھ گیا

آخر گل اپنی خاک در میکدہ ہوئی +
پہنچی وہیں یہ خاک جہاں کا خمیر تھا

ہو گیا نامہ شوق اُن کو سب از بر میرا
کھا لئے ذبح جو وہ کر کے کبوتر میرا

کچھ راز نہاں دل کا عیاں ہو نہیں سکتا
گونگے کا سا ہے خواب بیاں ہو نہیں سکتا

سبزۂ خط ای خضر طریقت یہ کتاب رسم الخط ہے جدا | خط بتاں ہے خط الٰہی لکھیے سیکھے پڑھے خدا

ردیف با موحدہ

پی بھی جا ذوق نہ کر پیش و پس جام شراب | لب پہ تو بہ ترے دل میں ہو من جام شراب
لب تک اُسکے جو ہوئی دست رس جام شراب | بن گیا خال لب سکا مگس جام شراب
جھجکا مستی میں وہ صاحب ہوس جام شراب | عکس خال اپنا جو سمجھا مگس جام شراب
دل جو ہے جام شراب ہوس جام شراب | اس میں ہے خال سویدا مگس جام شراب
ساغر دل کو جو ہو دسترس جام شراب | دست ساقی میں ہو وقت ہوس جام شراب
بازگشت اپنی ہے یوں جانب قسام ازل | جیسے ساقی کی طرف بازپس جام شراب
دست بدست سے کی ٹوٹ کے فریاد بہت + | نہوا کوئی بھی فریاد رس جام شراب
جوش مستی ہے عجب قافلہ جس میں کہ نہیں | بے شکست ایک صدائے جرس جام شراب
محتسب شعلۂ آواز سے جل جائے گا | ٹوٹا گر اک دل آتش نفس جام شراب
رات میخانہ میں ساقی جو نشے میں بہکا + | خس شیشہ کو لگا کہنے خس جام شراب
مرغ دل زرگس میگوں کی ہے ترگاں میں اسیر | تازہ مضموں ہے جو باندھوں قفس جام شراب +
دل شکستہ ہوں وہ میں ٹوٹ کے ہو سو ٹکڑے | نام لکھدے جو کوئی میرا پس جام شراب
ساقی اس دور میں کب آنکھ چرا سکتا ہے | رات بھر گشت کرے ہے عسس جام شراب
نوشدارو سے بھی بہتر ہے دم رنج خمار | ساقیا شربت فریاد رس جام شراب
بے خبر قافلۂ عیش گذر جاتا ہے + | بے زباں ہے جو دہان جرس جام شراب
ابلق چشم سیہ مست کو تیرے دیکھا | ورنہ اب تک نہ سنا تھا فرس جام شراب

سمجھے میخانہ کی عظمت تو نہ مینھے ہرگز
سر جمشید پہ اُڑ کر مگس جام شراب

نخل مینا سے خدا جانے کہ ساقی کسکو
پہلے پہنچے ثمر پیش رس جام شراب

بادۂ صاف میں آیا ہے کہاں سے تنکا
عکس مژگاں ترا سیکش ہے خس جام شراب

مجھ کو اُس بوسۂ مداں نے پس از بوسہ لب
دئے نقل نمکیں چند پس جام شراب

ذوق جلدی مئے گلرنگ سے بھر ساغر مل
لب نازک کو ہے اُس کے ہوس جام شراب

ہو ہجر مہ توں جو ہو وصل یا یک دم نصیب
کم ہوگا کوئی ہمسا بھی الفت میں ہم نصیب

ہوں میری خاک کو جو تمہارے قدم نصیب
کھایا کریں نصیب کی میرے قسم نصیب

بہتر ہیں لاکھ لطف و کرم سے ترے ستم
اپنے نہ ہے نصیب کہ ہوں یہ ستم نصیب

ماہی ہو یا کہ ماہ۔ وہ وے ایک یا ہزار
بے داغ ہو نہ دست فلک سے درم نصیب

ہے خوش نصیب عشق میں اے بلہوس وہی
جسکو کہ غم ہے غم سے الم پر الم نصیب

غافل جو دم کی آمد و شد سے نہ وے تو
ہر دم ہے تجھ کو سیر وجود و عدم نصیب

سو بار جوں قلم ہو زباں شمع کی قلم
ایک حرف ہو نہ مثل زبان قلم نصیب

مجنوں سیاہ خیمہ لیلی کے گرد پھر
اے خوش نصیب تجھ کو یہ طوف حرم نصیب

دے جسکو اپنے ہاتھ سے تو ایک جام مئے
ساقی وہ ہے خدا نے اُسے مثل جم نصیب

ایماں ہے تیرا شوق لقا جسکو یہ نہ ہو
دیدار سے خدا کا نہ ہوے صنم نصیب

جلتے ہیں کوے یار کو جو اس میں ہو سو ہو
آئے ذوق آج ملتے ہیں آج اپنے ہم نصیب

سے چرانا اور جنت کی طلب
کام جو پر اس کام پر کس منہ سے اُجرت کی طلب

حشر تک دل میں رہے اُس سرو قامت کی طلب
یہ طلب ہے اپنی یارب کس قیامت کی طلب

دل سلگ جائے نہ جب تک اور بھڑکے نہ جاں
کم نہو قلیاں کشِ سوزِ محبت کی طلب

واسطے نظارۂ قاتل کے فرصت چاہئے
اور یہاں فرصت کہاں جو کیجئے فرصت کی طلب

ہو مبارک خضر کو سرچشمۂ آبِ بقا +
ہے ہمیں آبِ دمِ تیغِ شہادت کی طلب

دور رہ اور دیر مت رہ ۔ سامنے مثلِ ہلال
شہر میں تجھکو اگر ہے اپنی شہرت کی طلب

بڑھ گئی ہے عشق میں حرص اسقدر اپنی کہ ہے
غم پہ غم کی آرزو حسرت پہ حسرت کی طلب

جو حلاوت زندگی کی چاہتا ہے چرخ سے
کاسۂ زہراب سے کرتا ہے شربت کی طلب

ہو کے دل غمزہ کا بسمل ناز پر دیتا ہے دم
کرتا ہے آفت طلب ۔ آفت پہ آفت کی طلب

یاد ہیں صلب و شکم کی پہلی دو نو منزلیں
یہاں کہاں وسعت کہ تو کرتا ہے راحت کی طلب

گر گلستانِ جہاں میں تنگ ہے تو غنچہ وار
کر کشادہ دل سے اپنے ذوقِ وسعت کی طلب

کرے ہے شرع کا پاسِ نمک مدام شراب
حرام ہے ۔ نہیں لیکن نمک حرام شراب

یہ ایسا ماہِ مبارک ۔ وہ ایسا کارِ سعید
شروع دیکھ کے کیجے نہ صیام شراب

عوض ہے نشۂ دنیا کا ذوقِ عقبےٰ پر +
دوام بکتی ہے اس میکدہ میں وام شراب

اس بت نامہرباں کو ہے پسند اتنا رقیب
ورد اسمائے الٰہی میں بھی ہے تو یا رقیب

تمثناۃ

معلوم جو ہوتا ہمیں انجامِ محبت
لیتے نہ کبھی بھول کے ہم نامِ محبت

ہیں داغ محبت درم و دام محبت
مژدہ تجھے اے خسرو شیریں انعام محبت

ہر روز اُڑا دیتا ہے وہ کر کے تصدق
دو چار اسیرِ قفس و دام محبت

مانند کباب آگ پہ کرتے ہیں ہمیشہ +
دلسوز ترے بسترِ آرام محبت

کاسہ میں فلک کے رہی ایک بوند نہ زہراب
دھر کھینچے اگر تشنہ لب جام محبت

خاکستر پروانہ دکھا دوں میں اُڑا کر
پوچھے کوئی مجھ سے اگر انجام محبت

شوقِ حرم کوچۂ قاتل میں کفن کو
ہم جانتے ہیں جامۂ احرام محبت

کی جس سے رہ و رسم محبت اُسے مارا
پیغام قضا ہے ترا پیغام محبت +

مے سے ہمیں ہے کام نہ زاہد سے کہ ہم تو
ہیں بادہ کش عشق و مے آشام محبت

ایماں کو گرو رکھئے اگر کفر کو لے مول
کافر نہ ہو گر دیدۂ اسلام محبت

کہتی تھی وفا نوحہ کناں نعش پہ میری
سونپا کسے تو نے مجھے ناکام محبت

معراج سمجھ ذوق تو قاتل کی سناں کو
چڑھ سر کے بل اس زینہ سے تا بام محبت +

مجنوں نے دی لگا جو سر خارزار پشت
پشت اب ہجوم خار سے ہے پشت خار پشت

حوروں کے گر ہو پنجۂ مژگاں سے پشت خار
کھجلائے پر پری نہ کبھی زینہار پشت

ماہی ہے تا بماہ ہیں دست فلک سے داغ
واں داغدار سینہ ہے یہاں داغدار پشت

پیدا فلک سے ایک نہ ہو تجھ سا ماہوش
نہ پشت تک تو کیا کہ نہ تا نہ ہزار پشت

بارِ زمانہ پشت پہ لیکر شتر کی طرح
سیدھی نہ کی فلک نے کبھی ایک بار پشت

ہو جاتی ہے زیادہ گرانبار ئے گناہ
پیری میں ہو خمیدہ نہ کیوں زیر بار پشت

سینہ سپر جو منہ پہ ہیں تیغ نگاہ کی
دکھلائے وہ کبھی نہیں آئینہ وار پشت

ڈھب یہی کہ ایسا نہ ہو بعد مرگ بھی | لگنے نہ دے زمیں سے دلِ بیقرار پشت

رہتا سخن سے نام قیامت تلک ہے ذوق
اولاد سے تو ہے یہی دو پشت ۔ چار پشت

چیم عربی +

ہے وہ آزار محبت سے دلِ زار کو رنج | جس سے خود رنج کو آزار ہے آزار کو رنج
دیدۂ آبلۂ پا کا یہی ہے رونا | کہ نہ پہنچا ہو کہیں مجھ سے کسی خار کو رنج
جا بجا کوہ کے چشموں سے رواں ہیں آنسو | ہے جو ناکامی فرہاد کا کہسار کو رنج
کبھی کرتی ہے قدم رنجہ جو گلشن سے صبا | اور ہوتا ہے سوا مرغ گرفتار کو رنج
شربتِ خضر بھی دے ہے روش تلخی مرگ | تیری اس زہر بھری آنکھ کے بیمار کو رنج
راحت و رنج زمانہ میں ہیں دونو لیکن | یہاں اگر ایک کو راحت ہے تو ہے چار کو رنج
سخت جانی سے ہوں لاچار و گرنہ مجھ سے | نہ تو خنجر کو ہے آزار نہ تلوار کو رنج
سنکے فریاد قفس میں مری خوش ہوں صیاد | یہ نہ پوچھیں کہ ہے کیا مرغ گرفتار کو رنج

ہوش کو بیچ کے لے دار و دے بیہوشی تو
ذوق بیہوش کو آرام ہے ہشیار کو رنج

مرتا ہوں انتظار میں کوئی بشر تو بھیج | خط بھیج یا نہ بھیج ۔ زبانی خبر تو بھیج

بیمار عشق کا جو نہ تجھ سے ہوا علاج | کہہ اے طبیب تو ہی کہ پھر تیرا کیا علاج

جیم فارسی

اُس کی پی کو تو نہ لے حیف اے دل بیتاب کھینچ
آ ور لیوے آدمی کو چاہ میں سیماب کھینچ

یوں گلوئے تشنہ میں وہ آب خنجر ہو فرو
جیسے تفسیدہ زمیں لے ایکدم میں آب کھینچ

وہ شکل ہے ناؤ یہ کس نے ڈبوئی ؟ خضر نے
لے گیا خط ذقن دل کو سوے گرداب کھینچ

عاشقِ رسوا کے خط میں کیا تکلف چاہیے
چار حرف ایک چہ پردہ یوں ہیں اے القاب کھینچ

حائے حُطّی

فرقت کی رات جی چکے ہم تا زمانِ صبح
ہوگی اذان گور ہماری اذانِ صبح

پر نور ہے ترا خِ سیمیں بسانِ صبح
آنکھیں ہیں تیری مست صبوحی کشانِ صبح

تارِ شعاعِ مہر بھی رنگ شفق میں روز
ماتم میں ہیں مرے مژۂ خوں چکانِ صبح

اب میکدہ میں شام کو ناقوس پھونکئے
مسجد میں مدتوں سے ہے تسبیح خوانِ صبح

پیسے دانت رات نے مجھ پر کہ گھس گئے
انجم کے بھتنے دانت تھے زیبِ دہانِ صبح

ریشِ سفید شیخ میں ہے ظلمتِ فریب
اس مکر چاندنی پہ نہ کرنا گمانِ صبح

گم کردہ رہ ازل سے بھٹکتے ہیں رات دن
یہ میرے نالۂ شب و آہ و فغانِ صبح

یوں پہنچے اُسکی زلف میں عارض سے جانِ عدل
منزل پہ پہنچیں رات کو جوں رہروانِ صبح

اے ذوق کچھ نہ پایا شب وصل کا مزہ +
یا آج صبح ہم نہیں یا طائران صبح

ٹھیری ہے اُن کے آنے کی اب کل پہ جا صلاح
اے جان برلب آمدہ تیری ہے کیا صلاح

منظورِ چشمِ یار ہے سب عین مصلحت
پوچھے بلا کشوں کی کسی سے بلا صلاح

سیدھے ہی جائیں کعبہ کو بیت الصنم سے ہم
گر پھیرے نہ وہ صنم کج ادا صلاح

اُس چشمِ مست کے ہیں خرابا تیوں میں ہم
تقوے کجاؤ زہد کجاؤ کجا صلاح

کیا جان میری جان کے درپے وہ ہو سکے
غمزہ سے تیرے پوچھے نہ جبتک قضا صلاح

اُس بدمعاملہ سے بھلا کیا معاملہ
کس بدصلاح نے تجھے دی یہ دلا صلاح

رہتا ہے اپنا عشق میں یوں دل سے مشورہ
جس طرح آشنا سے کرے آشنا صلاح

زاہد یہ کیا کہا کہ نہ مل اِن بتوں سے تو
دیتا ہے ایسی کوئی بھی مردِ خدا صلاح

کرتی خراب اُسی کو ہے تیری نگاہِ مست
جسکو کہ دیکھتی ہے بکو کار و با صلاح

یارب ہو دلکی خیر کہ کچھ کر رہے ہیں آج
چشم و نگاہ مشورہ۔ ناز و ادا صلاح

منظور اگر ہے قتل مرا غیر سے نہ پوچھ
ہے تو صلاح نیک میں کیا پوچھتا صلاح

قُلّابے آسمان و زمیں کے ملا نہ تو +
اُس مہروش سے ملنے کی ناصح بتا صلاح

یہ ہی مرا رفیق ہے۔ یہ ہی مرا شفیق +
لوں کس سے وہاں کے جانے کی دل کے سوا صلاح

اے ذوق جا نہ ہوش و خرد کی صلاح پر
جو عشق دے صلاح۔ وہی ہے بجا صلاح

خاءِ معجمہ +

اس غزل کا باعث تحریر یہ ہوا تھا کہ خواتین رامپور میں سے نواب عبداللہ خاں ایک امیر دلی میں رہتے تھے۔ پھر میرٹھ میں صدر الصدر ہو گئے تھے شعر و سخن کے شیدا تھے۔ اور خود بھی اچھا کہتے تھے۔ اُستاد مرحوم کا عالم جوانی۔ اور شاعری بھی جوان تھی۔ اکثر شعرا کی

نشست نیو ایکے ہاں ہوتی تھی اُستاد کی اُن سے شناسائی تھی مگر وہ اُنہیں اُستاد مانتے تھے شہیدی مرحوم بہ لباس فقیری دلی میں آئے۔ اور مناسبت طبع نے نواب سے بھی ملایا۔ اپنے شعر سنائے اور ثنائے گفتگو میں کہا کہ مبصران سخن کے نزدیک آج فن شعر میں تین شیخ ہیں شیخ ناسخ لکھنو میں شیخ حفیظ دکن میں۔ شیخ ابراہیم ذوق دہلی میں ✤

نواب صاحب نے کہا کہ شیخ ابراہیم ذوق کو تیسرا درجہ دینے کا کیا باعث۔ شہیدی نے شیخ ناسخ کی بہت تعریف کی۔ اور شاخ کی غزل سنا کر کہا کہ اس غزل پر آج کون قلم اُٹھا سکتا ہے۔ نواب با اخلاق اُس وقت تو چپ ہو رہے مگر پھر اُستاد کو بلایا حال بیان کیا۔ اور غزل کی فرمایش کی۔ اُستاد نے کہا کیا حاصل؟ عبث کاہش ہے۔ اور انجام کاوش ہے۔ جب نواب نے اصرار کیا تو اُستاد نے غزل لکھکر معہ قصیدہ جلسۂ خاص میں سُنائی۔ اور خلوۃ میں اعتنا بھی کہا کہ ان قوافی کو اور اُن کے مضامین کو دیکھئے جو ان سے بڑھ کر کہیگا تو میں پھر دیکھونگا ✤

نواب نے کہا۔ ایک مشاعرہ کرتے ہیں۔ اُس میں پڑھئے۔ یہ سُن کر شہیدی مرحوم دہلی سے روانہ ہو گئے۔ نواب نے سُن کر آدمی دوڑایا۔ وہ بریلی جا پہنچے تھے۔ آدمی نے جا کر پیغام پہنچایا۔ اور ناکام پھر آیا۔ قسمت سے اُس زمانہ کا ایک مسودہ میرے ہاتھ آگیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس پر نظر ثانی نہیں ہوئی۔ خیر یادگار تو ہے ✤

تھی زلف تیری سنبل صحن چمن کی شاخ	قطروں سے پر عرق کے بنی یاسمن کی شاخ
اُس تن کو کیونکہ کہئے نہال چمن کی شاخ	لائیگی وہ کہاں سے ادا بانکپن کی شاخ
ابرو پہ اُسکی خال ہے کیا زاغ شوخ چشم	سمجھا ہے اپنی شاخ نشیمن ہرن کی شاخ
دکھلائی اُس کے سرمۂ دنبالہ دار نے	آنکھوں سے ہم کو نرگس دست فن کی شاخ

ناف اس صبح کی ہے کوئی نسترن کا پھول — تا نافہ سیلی سینہ پہ ہے نسترن کی شاخ

دل باغ و عشق نخل کہ جس میں ہزار ہا — حسرت کے برگ۔ الم کے ثمر ہیں حزن کی شاخ

بے بہرہ انتفاع سے رہتے ہیں پر جفا — ممکن نہیں کہ لائے ثمر کرگدن کی شاخ

کہتی تھی چوب تیشہ مری طرح ایک دن — سوکھے گی نخل آرزوے کوہکن کی شاخ

جب سے پڑا ہے باغ میں جھولا ترے لئے — ممنون باغ میں ہے نہایت رسن کی شاخ

لچکے ہے یوں کمر تری وقت خرام ناز — جنباں ہو جوں نسیم چمن سے سمن کی شاخ

حیراں ہوں دیکھ خال کو ابروے یار پر — گل نیلوفر کا لائی ہے کیونکر ہرن کی شاخ

ہے جوش پارہ پارۂ دل ہر شرہ پہ یوں — لائے نکال کوپلیں جسطرح گھن کی شاخ

مسواک نے بڑھایا ہے زاہد کا اعتبار — ہے یہ بھی اسکے ایک شجر کرو فن کی شاخ

دیتی ہے سر پہ بلبل آتش نفس کو جا — رکھتی ہے کیا چمن میں ہوس سوختن کی شاخ

ہے نقش تیرے کشتہ بیکس کی دشت میں — گویا کہ ایک نشیمن زاغ و زغن کی شاخ

جز شمع استخوان صفا کیش زیر خاک — دیکھی نہ ہے سنی گل صبح کفن کی شاخ

نے برگ ہے نہ غنچہ۔ نہ گل ہے۔ نہ ہے ثمر — میں خشک طالبی سے ہوں گویا ہرن کی شاخ

ریشم کا لچھا ہاتھ میں اسکے نہیں دلا — یہ یاسمن کا سانپ ہے وہ یاسمن کی شاخ

چھوٹے جلانیوالوں سے وحشی نہ مرکے بھی — انجن کے کام آئے اگر ہے ہرن کی شاخ

تشبیہ کیونکہ دوں مژۂ خونفشاں سے میں — مرجاں کی شاخ کب ہے بھلا اس پھبن کی شاخ

صیاد میں چمن سے ہوں یا یوس۔ چاہئے — چوب قفس بھی ہو تو نہال چمن کی شاخ

باریک میں بتاتے ہیں جس کو تری کمر — یا کوئی موے تن ہے یا مہ کے تن کی شاخ

گل خورد تن مرا دم رویدگی مو — ہے آشیان بلبل گلشن وطن کی شاخ

ویسے خراش دل کو نہ کیونکر وہ نازنیں
رکھتی ہے خار سینکڑوں نازک بدن[1] کی شاخ

دکھلائے باغمیں قدِ رعنا جو اپنا تو
قمری کے حق میں وا رہو سروِ چمن کی شاخ

موذی کو سرکشی سے میسّر ہو اعتبار
نکلے ہے طول عمر سے مار کہن کی شاخ

ہوتی ہے وحشیوں پہ پس از مرگ بھی شکست
زور آزمائیوں کے لئے ہے ہرن کی شاخ

شاخ نبات کو نئے قلیاں نہ منہ لگائے
ایسی مصاحبت سے لگی اُس دہن کی شاخ

ہے فیض سے وقار کے میری نگاہ میں
جس شاخ میں ثمر ہے وہ ہے لکھ من کی شاخ

آخر یہ دستگیری تیشہ نے پھل دیا
کی قطع نخل آرزوئے کوہکن کی شاخ

بذ خصلتوں کو کرتا ہے بالانشیں فلک
اونچی ہے آشیانہ زاغ و زغن کی شاخ

رہتے ہیں کشمکش میں پس از مرگ پر جفا
آخر کو زیرۂ کٹی کرگدن کی شاخ

بیمار چشم دلبر آہو نگاہ کو +
شاخیں بھی گر لگائیں تو لیکر ہرن کی شاخ

ہر صید کی کمر سی گئی ٹوٹ جس گھڑی
ٹوٹی کمان ابروئے دلبر فگن کی شاخ

تاثیر بیکسی سے ہو سارا درخت خشک
ڈالے جو سایہ نعش پہ اس بے کفن کی شاخ

ہے نسیب باغ خلد کو کیا کیا نہ سرکشی
جب سے مشابہت سے لگی اس ذقن کی شاخ

سوفار کا دہن جو ہوا خون دل سے سُرخ
تیر اُسکا بن گیا ہے گل خنده زن کی شاخ

لکھ ذوق اسکی مدح کہ جس کی ثنا سے ہے
سرسبز تیرے گلشن باغ سخن کی شاخ

وہ کون؟ شاہ اکبر ثانی کہ جسکو روز
مجرا کرے ہے جھک کے نہال چمن کی شاخ

اُس کی دعائے حرز پڑھے جوش غنچہ سے
تسبیح ایک لیکے عقیق یمن کی شاخ

[1] نازک بدن ایک قسم کا بیر ہوتا ہے اُس کے درخت کو بھی نازک بدن کہتے ہیں ۱۲

+ یہ شعر باغ خلد کو اسی واسطے قدر + لیکن مشابہت سے لگی اُس دہن کی شاخ

کردے جو وہ نہال تو لائے ابھی نکال + پروین کا خوشہ گاؤ سپہر کہن کی شاخ
بہر تصدق آئے زر گل کو لے صبا کرنے لگے نثار گہر یاسمن کی شاخ
پہنچائے اُسکا مژدۂ صحت جو باغ میں سجدہ میں بہر شکر جھکے نارون کی شاخ
ہمسر ہے آج خضر ارم سیر سے شجر + ہم قد ہے آج یوسف گل پیرہن کی شاخ
گرمیٔ عدل اُسکی اگر ہو ستم گداز پگلے بزنگ شمع ابھی کرگدن کی شاخ
مطلع وہ پُر بہار لکھوں اس کی مدح میں مصرع کو جس کے سن کے کٹے نسترن کی شاخ

تیرے بہار فیض سے نخل کہن کی شاخ
سرسبز یوں ہے جیسے کہ سرو چمن کی شاخ

تیرے سحاب لطف سے سیراب ہو اگر ہمسر ہو شاخ نخل ارم سے ہرن کی شاخ
شاہا یہ تیرا دست سخا باغ دہر میں گویا کہ نکلی ہے کرم ذوالمنن کی شاخ
گر تیرا حفظ ہو چمن بند روزگار آب مژہ سے سبز ہو سرو چمن کی شاخ
صرصر کا سارا خاک میں ملجائے زور شور چھیڑے گر آشیانۂ مرغ چمن کی شاخ
دیکھے جو تیرا قوت بازو تو ٹوٹ جائے وقت کشش کمان سپہر کہن کی شاخ
تیرے عصا کو اُس سے میں تشبیہ کیونکہ دوں ہے شاخ صدرہ ایک کنار کہن کی شاخ
تاثیر تیرا زور ضعیفوں کو دے اگر + ٹوٹے نہ پہلتن سے بھی نازک بدن کی شاخ
بلکہ کمند مار کے ہاتھی کو کھینچ لے + خرطوم سے لپٹ کے بصوت رسن کی شاخ
منظور گر نہ زانہ نہیں ہو تجھ کو شاخ زر طیار رہو وہیں زرخور سے کرن کی شاخ
ہاتھی کو تیرے چاہئے لکڑی تو دشت میں خرطوم سے اُکھاڑ لے وہ کرگدن کی شاخ
دانتوں کو اسکے دیکھ ہو لرزاں بہ مثل بید صد دیو کوہ پیکر و البرز تن کی شاخ

گلگوں سے تیرے بڑھ نہ سکے یک قدم صبا
نشو و نما زیادہ سے ہے نہال چمن کی شاخ

ہو تیرا فیض اگر چمن آرائے باغ دہر
آب تبر سے سبز ہو نخل کہن کی شاخ

نالاں ہیں تیرے عدل سے خونریز اسقدر
مانند نے ہو گرم فغاں کرگدن کی شاخ

برسائے جبکہ لعل و گہر تیرا دست جود
محتاج ابر ہو نہ نہال چمن کی شاخ

شاداب آب لعل یمن سے ہو مثل گل
سیراب ہووے آب سے در عدن کی شاخ

یہانتک ہے پاس شرع ترے عہد میں کہ اب
ساغر بکف نہووے گل خندہ زن کی شاخ

پیدا ہو بادہ خوار کی تعذیر کے لئے
نخل کدو سے تاک ہیں صورت رسن کی شاخ

یہ ذوق کی دعا ہے کہ تا باغ دہر میں
سرسبز شعر ترے سے ہو نخل سخن کی شاخ

جبتک کہ ہووے گردن مینا کی طرح سے
نخل نشاط ساقی پیماں شکن کی شاخ

نخل حیات تیرا تر و تازہ ہو مدام
جوں موسم بہار میں نخل چمن کی شاخ

دال مہملہ

پہلے بادشاہ نے اس طرح میں غزل کہی تھی۔ اُن کی غزل لکھکر بیٹھے تھے۔ دل لگ گیا اور چند قافئے خوشنما پہلوؤں پر بیٹھتے نظر آئے۔ فرمایا۔ ہم بھی اس طرح میں غزل کہتے ہیں۔ دوسرے دن میں گیا تو غزل سُنائی۔

کیا آئے تم جو آئے گھڑی دو گھڑی کے بعد
سینہ میں ہوگی سانس اڑی دو گھڑی کے بعد

کیا رو کا ہم نے گریہ کو اپنے کہ لگ گئی
پھر وہی آنسوؤں کی جھڑی دو گھڑی کے بعد

گر دم کے دم وہ ہم سے ملائم ہوئے تو کیا
کہہ بیٹھینگے پھر ایک گھڑی دو گھڑی کے بعد

اُس لعل لب کے ہم نے لئے بوسے اسقدر
سب اُڑ گئی مسی کی دھڑی دو گھڑی کے بعد

اللہ رے ضعف سینہ سے ہر آہ بے اثر
لب تک جو پہنچی بھی تو چھڑی دو گھڑی کے بعد

کل اُس سے ہم نے ترک ملاقات کی تو کیا
پھر اُس بغیر کل نہ پڑی دو گھڑی کے بعد

کہتا رہا کچھ اُن سے عدد دو گھڑی تلک
غمازنے پھرا اور جڑی دو گھڑی کے بعد

تھے دو گھڑی سے شیخ جی شیخی بگھارتے
ساری وہ شیخی اُنکی جھڑی دو گھڑی کے بعد

پروانہ گرد شمع کے شب دو گھڑی رہا
پھر دیکھی اُسکی خاک پڑی دو گھڑی کے بعد

تو دو گھڑی کا وعدہ نہ کر۔ دیکھ جلد آ
آنے میں ہوگی دیر بڑی دو گھڑی کے بعد

گو دو گھڑی تک اُس نے نہ دیکھا ادھر تو کیا
آخر ہمیں سے آنکھ لڑی دو گھڑی کے بعد

کیا جانے دو گھڑی وہ رہے ذوق کس طرح
پھر تو نہ ٹھیرے پاؤ گھڑی دو گھڑی کے بعد

ایک قدیم الخدمت محمد بخش نام اُستاد مرحوم کے پاس ملازم تھا۔ بڈھا بھی تھا مسخرا بھی تھا۔ سامنے بورچی خانہ میں سب کا آتا لیق بنا بیٹھا رہتا تھا۔ اور باتیں بنایا کرتا تھا۔ اور حق یہ ہے کہ اُستاد مرحوم کی۔ اور اُنکے والد کی خدمتیں کرتے کرتے وہ بھی ایک قسم ہو گیا تھا۔ سب کے کاموں کو اصلاح دیتا تھا میں حد شباب میں پہنچ لیا تھا۔ پھر بھی اسی طرح باتیں کیا کرتا تھا جسطرح بچپن میں مجھے کھلاتا تھا اور ہنساتا تھا۔ اُستاد کا وہ عالم اب تک آنکھوں کے سامنے ہے کہ خاموش اپنے شغل میں مصروف ہیں۔ کوئی بات اُسکی بھی کان میں جاتی ہے تو مسکرا دیتے ہیں۔ کبھی خوش ہوتے تھے تو ایک دو گالیاں بھی دیدیا کرتے تھے۔ اور ٹہلتے ٹہلتے ایک آدھ ٹھول بھی لگا دیتے تھے۔ اُسے پرانے اُستادوں کے بہت شعر یاد تھے اُستاد مرحوم کے بھی لڑکپن کے شعر یاد تھے جوانی میں سوجھی پر شعر پڑھا کرتا تھا ؎

نے مطبع میں چرچا سُنا کہ رات کو فلاں بازار میں سورج مکھی پر استاد ذوق کے
ی شعر پڑھے۔ بڈھا تھا پھر بھی خوب پڑھا۔ اور شعر بھی خوب تھے۔
بولا آخر استاد کا نوکر تھا صاحب۔ خوب کیوں نہ پڑھتا ✤

میں حسب معمول شام کو اُستاد کے پاس گیا۔ وہ حرم سرا میں گئے تھے۔ میں نے پوچھا۔
محمد بخش! کل سورج مکھی پر شعر پڑھے تھے؟ پہلے تو مکر گیا۔ پھر بڑی مشکلوں سے قبولا۔
میں نے پوچھا۔ کیا کیا پڑھے تھے؟ بڑے غزوں سے سودا کی ایک غزل سنائی۔
میں نے کہا اُستاد کے شعر بھی تو پڑھے تھے! کہا یہ تو اب شعر کہنا بھول گئے۔
میں نے کہا۔ کون؟ کہا۔ یہی میاں ابراہیم۔ میں نے کہا۔ بھول کیونکر گئے۔ کہا۔ پہلے
اچھے کہتے تھے۔ اب تو کچھ اَور ہی ڈھب کے کہتے ہیں۔ میں نے کہا خیر جو شعر تو نے وہاں
پڑھے وہ سُنا دے۔ کہنے لگا۔ لڑکوں کے سامنے شعر نہیں پڑھا کرتے۔ میں نے کہا اچھا
ایک ہی پڑھ دے۔ بڑی خوشامدوں سے یہ مطلع پڑھا۔

ماتھے پہ ترے چمکے ہے جھومر کا پڑا چاند	لا بوسہ چڑھے چاند کا وعدہ تھا چڑھا چاند

اتنے میں اُستاد آئے۔ میں نے یہ مطلع سنایا۔ فرمایا۔ تمہارے ہاتھ کہاں سے آیا۔ میں نے کہا محمد بخش نے
ابھی پڑھا ہے۔ حضرت! آج رات کو سورج مکھی پر اس نے شعر پڑھے تھے۔ مسکرا کر بولے۔
کیوں بے گنجے فلاں فلاں تو ہمارے شعر سورج مکھی پر پڑھا کرتا ہے۔ میں نے کہا۔ آپ کو
کوئی شعر اسکا یاد ہے۔ فرمایا۔ مدتوں کی باتیں ہیں۔ اب کہاں یاد۔ پھر کہا۔ یادداشت
کے جز میں لکھ لو۔ کتاب میں نہ لکھنا۔ میں نے کہا حضرت! کیوں؟ فرمایا۔ لڑکپن
کی باتیں ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کی فرمایش سے کہدیتے تھے۔ فرصت میں بیٹھیں گے
تو اپنے رنگ میں لے آئینگے۔ میں نے وہی لکھ لیا۔

ہے آئینہ خانہ بھی گذرگاہ بد و نیک
دیکھا نہ کبھی ہم نے دل اہل صفا بند

دم گھٹتا ہے سینہ میں دم شدت گریہ
باراں کی علامت ہے جو ہو جائے ہے الجھند

ایکدن والد مرحوم کے پاس گئے۔ ترتیب دیوان کی تجویز ہونے لگی۔ ایک ان میں سے یہ کہ ہر ردیف میں کچھ غزلیں ہونی چاہئیں۔ جن میں نہیں ان کے لئے طرحیں تجویز ہوں۔ ردیف دال کے لئے یہ مصرع بھی طرح ہوا۔ ع

پنبہ داغ دل پہ اندک سرخ ہے اندک سفید

ذال معجمہ

۱۸۵۱ء میں ایک مشاعرہ ہوا۔ اس میں یہی طرح ہوئی تھی۔ شاگرد آئے اصلاحیں لگے۔ مشاعرہ کے بعد اور غزلیں بھی آئیں۔ دیکھکر فرمایا۔ دیکھو قافیہ کا پہلو نہیں بچا سکتے۔ زمین ہاتھ سے چلے جاتے ہیں۔ پھر فرمایا۔ ہم بھی غزل لکھدیں بھلا یاد تو رہے کہ یوں نشست دیتے ہیں۔ زمین ٹھنڈی ہے تو ہو۔ کلام بے اصول تو نہ ہوں ✤

فرد قتل سے اس عہد شکن کا کاغذ
ہے مری روح کو آزادی تن کا کاغذ

گور میں پیش ہو جب دفتر تن کا کاغذ
ہو سیاہہ کو سفیدی کفن کا کاغذ

بن گیا عکس سے اس شوخ گلستاں رو کے
صفحہ آئینہ۔ تصویر چمن کا کاغذ

کیا کرے خانہ گیتی کا کوئی دعوے ملک
نام پر کسکے ہے اس قصر کہن کا کاغذ

لکھیں اس چشم کے وحشی کے لئے گر تعویذ
اہل تکسیر کریں۔ پوست ہرن کا۔ کاغذ

رقعہ شادی شہادت کا ہو خوں سے رنگیں
ایسی شادی کو ہو ایسی ہی پھبن کا کاغذ

سینہ صافو نکو زمانہ کے ہاتھوں سے شکست
ہے صفائی سے سزاوار شکن کا کاغذ

ورق چرخ ہو گو نسخۂ آشوب نہ ہو
سرمۂ چشم مہ سیم بدن کا کاغذ

یوں قفس میں کوئی ہم تک سے پہنچتا گلبرگ
جیسے غربت میں شفیقان وطن کا کاغذ

ظاہر آرا نہ کتابوں سے ہو۔ ڈر دوزخ سے
کرنہ آتش میں لباس اپنے بدن کا کاغذ

جعلسازی پہ زمانہ کی گواہی دے ہے
مُہری و سادہ، مہ چرخ کہن کا کاغذ

مُہر وہ کرتا ہے نامہ پہ مجھے آئے ہے رشک
ہائے یوں چوسے لعاب اسکے دہن کا کاغذ

ذوق دل سوختہ دیواں لکھے اپنا کیا خاک
متحمل نہیں گرمیِ سخن کا کاغذ

حلِ دل کا مجھے کیا دیتے ہو لاکر تعویذ
اسکا خط لاؤ کہ رکھوں میں بناکر تعویذ

جو تری چشم کے دیوانوں کا کرتے ہیں علاج
لکھتے ہیں پوست کا آہو کے بناکر تعویذ

تمنے تعویذ نشانی جو دیا تھا اپنی
لے گیا کوئی موکل وہ اُٹھاکر تعویذ

ابتلک جوش میں ہے خون شہید غم عشق
دیکھ لو تم سر مرقد سے اُٹھاکر تعویذ

جلتوائی نہ پڑی یار ہیں اور غیروں میں
سینکڑوں خاک کئے ہم نے جلاکر تعویذ

راء مہملہ

نگہ نہیں۔ حرف دلنشیں تھا۔ دہن کی تنگی سے تنگ ہوکر
نکل کے رستہ سے چشم فتاں کے دل میں بیٹھا خدنگ ہوکر

پھر آیا لوہ نگار خونی اِدھر کو سرگرم جنگ ہوکر
کہ جسکے ہاتھوں سے اُڑ گئے سر ہزاروں میدہی کا رنگ ہوکر

وہ چشم مخمور ایک نظر سے چبھوے لاکھوں جو نیشتر سے

دنگل کے کرتا حرارت دادا کھوا

تو ہو رواں ہر رگ جگر سے لہو ۔ مئے لالہ رنگ ہو کر
جو رنگ الفت سے آشنا ہیں ۔ وہ گریے بھی ہیں خوشنما ہیں
کہ رنگ ہی سے گراں بہا ہیں عقیق و یاقوت سنگ ہو کر
جو سمجھیں حسن بتاں کو ایماں ۔ انہیں رہ کفر و دیں ہے یکساں
پہنچتے کعبہ ہیں وہ مسلماں ہمیشہ چین و فرنگ ہو کر
صفائے دل کی یہی ہے صورت ۔ کہ دل میں آنے نہ دے کدورت
کہ بیٹھ جائینگے بالضرورۃ ۔ اس آئینہ میں یہ زنگ ہو کر
غزالِ رم دیدہ بنگیا ہے ۔ جو خواب آنکھوں نہیں ۔ تو بجا ہے
کہ پھاڑ کھانے کو دوڑتا ہے ۔ پلنگ تجھ بن ۔ پلنگ ہو کر
ہوے جو یکرنگ ۔ انکو زیبا ۔ نہیں جہاں میں رعونت اصلا
کہ پایا گل نے ہے نام رعنا تو اس چمن میں دو رنگ ہو کر

حلاوت شرم و پاسداری جہاں میں ہے ذوق بیخ و خواری
مزے سے گذری اگر گذاری کسی نے بے نام و ننگ ہو کر

خوب وقت ہے رات ہم سخنان ہاموں دیکھکر
یاد آیا ہم کو مجنوں ۔ بید مجنوں دیکھکر
اڑ گئے ایک آن میں جادوے بابل کے دھوئیں
سرمہ آلودہ تری چشم پر افسوں دیکھکر
دیکھکر غیروں میں مہتابی پر اس مہوش کو رات
آہ کی ایک دل سے ہم نے سوے گردوں دیکھکر
سچ کہا ہے ۔ آگے کالے کے نہیں جلتا چراغ
چھپ گیا مرغ پہ تیرے زلف شبگوں دیکھکر
دل بے سیر سا نخچیر سرشار وحشت کا نشا
چھپ گیا خم میں میری صورت فلاطوں دیکھکر
آگئیں تم کو لگانی انگلیوں پر فندقیں
نوک مژگاں پر مرے اشک جگرگوں دیکھکر

جو ہے نالا اپنا وہ ایک مصرع برجستہ ہے
قتل کو کسکے چڑھائی تیغ تو نے سان پر
ہم جو نالاں ہیں کسی کا قد نمووں دیکھکر
اُترا آنکھو نہیں جو زخم نخچیر دیکھکر

لیگیا دل کون میرا۔ ذوق کس کا نام لوں
سامنے آجائے تو شاید بتادوں دیکھکر

کہا تنگ نے یہ داغ شمع پر چڑھ کر
مرے خیال پہ وہ چشم فتنہ گر چڑھ کر
دکھا نہ جوش و خروش اتنا زور پر چڑھ کر
ستمگروں کی کشاکش میں آبرو ہو سوا
الٰہی خیر ہو یا نند شعلۂ سرکش
ہنر شناس کو دکھلا ہنر کہ خوبی زر
کہیں فلک پہ چڑھے جا چاند جھومر کا
تیرا مکاں تو ہے کیا۔ لامکاں کو پٹریں
جو بارے نفس کو اور کرلے اپنی غصہ کو زیر
عجب مزا ہے جو مرلے کسی کے سر چڑھ کر
یہ خانہ جنگ بنی آئی لٹنے گھر چڑھ کر
گئے جہان میں دریا بہت اتر چڑھ کر
کہ ہوتی سان پہ تیغ تیز تر چڑھ کر
پھر آیا باد کے گھوڑے پہ وہ ادھر چڑھ کر
اگر کھلے تو صراف کی نظر چڑھ کر
کہ دو رآ کو کھینچے ہے تیری سر چڑھ کر
امید وصل میں ہم بام عرش پر چڑھ کر
بنائے سانپ کا کوڑا وہ شیر پر چڑھ کر

ہماری خاک پہ پا ہے ذوق فتنہ حشر +
سمند ناز پہ کون آیا فتنہ گر چڑھ کر

جاں ہوا یوں ہوئی اُس خال کا بوسہ لیکر
جیسے اٹھ جائے دہن میں کوئی گنگا لیکر
میرا بیمار نہ سنبھلا جو سنبھالا لیکر
چپکے ہی بیٹھ رہے دم کو مسیحا لیکر

سنبھالا لینا۔ بعض دفعہ بیمار۔ قریب المرگ ہوتا ہے تو مرنے سے ایک دو دن پہلے ایسا سنبھل جاتا ہے گویا اچھا ہوگیا۔ سب کو صحت کی امید ہو جاتی ہے۔ پھر دفعۃً حالت بگڑکر پہر دو پہر میں کام تمام ہو جاتا ہے اسوقت کہتے ہیں کہ جو صحت معلوم ہوئی تھی وہ سنبھالا لیا تھا ۱۲

شرط ہمت نہیں مجرم ہو گرفتار عذاب
تو نے کیا چھوڑا اگر چھوڑ یگا بدلا لیکر

ذبح کرنے کو میرے پوچھتے کیا ہو تکبیر +
تم چھری پھیر بھی دو نام خدا کا لیکر

کھینچتی روز قیامت سے بھی ہے آپ کو دور
تیری زلفوں کی بلائیں شب یلدا لیکر

مجھ سا مشتاق جمال ایک نہ پاوگے کہیں
گرچہ ڈھونڈوگے چراغ رخ زیبا لیکر

جبکہ دیکھا نہ ملا مجھ مین کہیں میرا پتا +
پھر گیا نامہ بر یار خط اُلٹا لیکر

رہ گیا اپنا سا منہ لیکے وہ آئینہ رو
تیری تصویر کو یوسف نے جو دیکھا لیکر

تیرے پرزے نے کئی خط کی طرح اے قاصد
شکر کر چھوڑ دیا اُس نے نوشتہ لیکر

میرے قدموں ہی میں رہ جائینگے جائینگے کہاں
دشت میرے قدم ۔ آبلۂ پا لیکر

وہاں سے یہاں آئے تھے اے ذوق تو کیا لائے تھے
یہاں سے تو جائینگے ہم ۔ لاکھ تمنا لیکر

دیوان چندو لعل مدار المہام دربار حیدرآباد نے کئی ہزار روپے بھیجکر بلا بھیجا ۔ اور مصرع اپنی طرح مشاعرہ کا بھیجا حضرت مرحوم نے زمین مذکور میں دو غزلہ کہکر بھیجدیا ۔ اور رُپیہ نہ لیا ۔ میں نے ایکدن نہ جانے کا سبب پوچھا ۔ فرمایا ۔ پتھر اپنی ہی جگہ بھاری ہے ۔ میاں ۔ وہاں جاتے ۔ خدا جانے کیا ہوتا ۔ اور کیا کیا نہ ہوتا ۔ اپنی دلی اور حضور کا دربار کیا تھوڑی نعمت ہے ۔ خدا کا شکر کیا اور یہیں بیٹھے رہے +

کل گئے تھے تم جسے بیمار ہجراں چھوڑ کر
چل بسا وہ آج سب ہستی کا ساماں چھوڑ کر

طفل اشک ایسا گرا دامان مژگاں چھوڑ کر
پھر نہ اُٹھا کوچۂ چاک گریباں چھوڑ کر

کیونکہ نکلے تیر سا دل میں پیکاں چھوڑ کر
جائے بیضہ کو کہاں یہ مرغ پرّاں چھوڑ کر

کام یہ تیرا ہی تھا ۔ رحمت ہے اے ابر کرم
ورنہ جائے داغ عصیاں میرا داماں چھوڑ کر؟

جس نے ہو لذت اُٹھائی زخم تیغِ یار کی
کب وہ مرہم داں کو ڈھونڈے ہے نمکداں چھوڑ کر

صیدِ دل کو کیونکہ چھوڑے جبکہ دکھلاتے ہے تو
مچھلیاں دستِ حنائی میں مری جاں چھوڑ کر

سرمہری سے کسی کے آگے ہی دل سرد ہے
یہاں سے ہٹ جا دھوپ اے ابر بہاراں چھوڑ کر

دیکھئے کیا ہو۔ کہ ہے اب جان کے پیچھے پڑی
دل کو اے کافر تری زلفِ پریشاں چھوڑ کر

اے دل اُس کے تیر کے ہمراہ سینہ سے نکل۔
دیکھ پچھتائیگا تو یہ ساتھ ناداں چھوڑ کر

کیونکر رم کر جائیں آہو ایسے وحشی سے ترے
شیر بھاگیں جس کے نالوں سے نیستاں چھوڑ کر

سرخی پان دیکھ لے زاہد جو دنداں پر ترے
اٹھ کھڑا ہو ہاتھ سے تسبیح مرجاں چھوڑ کر

پیش خیمہ لیکے نکلا گردبادِ دودِ آہ +
ہے جو سرگرم سفر تن کو مری جاں چھوڑ کر

گر خدا دیوے قناعت ماہ یک ہفتہ کی طرح
دوڑے ساری کو کبھی آدھی انساں چھوڑ کر

ساغرِ دل ہیچ تا آیا ہوں کھومت ہاتھ سے
چوکتا ہے کیوں یہ جنبش دست گرداں چھوڑ کر

طرز میں اپنی غزل لکھ ذوق لیکن اب نہ جا
عالم مضموں میں طرز تفتہ جاناں چھوڑ کر

جب چلا وہ مجھکو بسمل خوں میں غلطاں چھوڑ کر
کیا ہی پچھتاتا تھا میں قاتل کا داماں چھوڑ کر

میں وہ مجنوں ہوں جو نکلوں کنج زنداں چھوڑ کر
سیب جنت تک نہ کھاؤں سنگ طفلاں چھوڑ کر

پیوے میرا ہی لہو آتی جو لب اُس شوخ کے
کھینچے تو شنگرف سے خونِ شہیداں چھوڑ کر

میں ہوں وہ گمنام جب دفتر میں نام آیا مرا
رہگیا بس منشیِ قدرت جگہ وہاں چھوڑ کر

سایۂ سروِ چمن تجھ بن ڈراتا ہے مجھے
سانپ سا پانی میں اے سروِ خراماں چھوڑ کر

ہو گیا طفلی ہی سے دل میں ترا وہ تیرِ عشق
بھاگے ہیں مکتب سے ہم اوراقِ میزاں چھوڑ کر

اہل جوہر کو وطن میں رہنے دیتا گر فلک
لعل کیوں اس رنگ سے آتا بدخشاں چھوڑ کر

شوق ہے اسکو بھی طرز نالۂ عشاق سے
دمبدم دیکھے ہے منہ سے دو دو قلیاں چھوڑ کر

دل تو لگتے ہی لگے گا حوریانِ عدن سے
باغ ہستی سے چلا ہوں ہائے پریاں چھوڑ کر

گھر سے بھی واقف نہیں اُسکے کہ جسکے واسطے
بیٹھے ہیں گھر بار سب ہم خانہ ویراں چھوڑ کر

وصل میں گر مجھکو ہو رویت ماہ رجب
روئے جاناں ہی کو دیکھوں میں تو قرآں چھوڑ کر

گرچہ ہے ملک دکن میں انکے نوں قدر سخن
کون جاے ذوق پر دلی کی گلیاں چھوڑ کر

بندہ آزاد بھی انکے نوں حاضر خدمت ہونے لگا تھا۔ ایکدن مومن خاں صاحب استاد کے پاس آئے۔ اثنائے گفتگو میں کہا۔ آج کل کا کوئی شعر سناۓ۔ اُستاد نے فرمایا کہ حضور کی غزلیں کہاں فرصت دیتی ہیں۔ جو اپنی فکر کروں۔ جب کئی دفعہ کہا تو غزل مرقوم الذیل کا مطلع انہی دنوں کہا تھا۔ یہی سنایا۔ وہ ہنسے اور کہا اس پر کوئی مطلع کیا کیگا۔ رستہ بند ہے

بلبل ہوں صحن باغ سے دور اور شکستہ پر
پروانہ ہوں چراغ سے دور اور شکستہ پر

کیا ڈھونڈے دشت گمشدگی میں مجھے کہ ہے
غنقا مرے سراغ سے دور اور شکستہ پر

اس مرغ ناتواں پہ ہے حسرت جو رہگیا
مرغان کوہ و راغ سے دور اور شکستہ پر

ساقی بط شراب ہے تجھ بن پڑی ہوئی
خم سے الگ ایاغ سے دور اور شکستہ پر

خود اڑکے پہنچے نامہ جو ہو مرغ نامہ بر
اُس شوخ خوش دماغ سے دور اور شکستہ پر

کرتا ہے دل کا قصد کماندار تیرا تیر
پر ہے نشان داغ سے دور اور شکستہ پر

اے ذوق میرے طائر دل کو کہاں فراغ
کوسوں ہے وہ فراغ سے دور اور شکستہ پر

غزل مرقومۃ الذیل کے مطلع کے باب میں بعض اشخاص سے میں نے سنا کہ اسمیں شاہ نصیر مرحوم کی اصلاح ہے

استاد مرحوم سے پوچھا۔ انہوں نے فرمایا عالم شباب میں میں نے فقط مطلع کہا تھا۔

نرگس کے پھول بھیجے ہیں بٹوے میں ڈالکر	ایما ہے یہ کہ بھیجدے آنکھیں نکالکر

یہ فقرہ مشہور ہوگیا۔ تم دیکھتے ہو کہ میں ہمیشہ اپنے کلام کو زیر نظر رکھتا ہوں۔ میں نے خود اس میں اصلاح کی۔ کہنے والوں نے کہدیا کہ شاہ صاحب نے اصلاح کی۔ دلکو سخت رنج ہوا مگر ضبط کر گیا۔ اور تدارک یہی سمجھ میں آیا کہ غزل پوری کی۔ اللہ نے داد دی کہ وہ اس سے بھی زیادہ مقبول خلائق ہوئی۔ پھر سب چپ چاپ ہو کر بیٹھ گئے۔

بادام دو جو بھیجے ہیں بٹوے میں ڈالکر	ایما ہے یہ کہ بھیجدے آنکھیں نکال کر
دل سینہ میں کہاں ہے، نہ تو دیکھ بھال کر	لے آہ۔ کہدے تیر کا نامہ[1] نکال کر
ہوں سرد ہو چکا۔ نہ دوبارہ جلال کر	میں! اور دم چراؤنگا۔ یہ تو خیال کر
عاشق کے خوں سے اپنا پر تیر لال کر	دکھلائے شاخ خشک میں کونپل نکال کر
تیرے مریض نے کئی نقل مکاں کئے	آخر کو روح تن سے گئی انتقال کر
شہرگ پر اپنی زندگی و موت میں لگ	آ تیغ یار! قصہ یہ تو انفصال کر
اتریگا ایک جام بھی پورا نہ چاک سے	خاک دل شکستہ نہ صرف کلال کر
لیکر بتوں نے جان جب ایماں پہ ڈالا ہاتھ	دل کیا کنارہ ہو گیا سب کو سنبھال کر
سینہ ہمارا وادی وحشت سے اے جنوں	ہر داغ پر تصور چشم غزال کر

[1] نامہ نکالنا وہی مشہور عمل ہے جسمیں نام لب بھی ناداں نکالنا کہتے ہیں۔ پہلے جب کچھ چیز کھوئی جاتی تھی کسی عامل سے چور کا نام۔ کبھی صورت۔ کبھی اور اتا پتا معلوم کر لیا کرتے تھے۔ چھ کبھی کاغذ کے پرزوں پر نام لکھکر۔ کبھی پانی میں اور کبھی آئینہ میں صورت دیکھکر۔ کبھی تیر کے ذریعہ سے ہوتا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ تیر میں بھی یہ اشارہ ہوتا تھا۔ کہ یہی چور کے کلیجہ میں لگے گا۔ مطلب یہ ہے کہ اے یار۔ دل سینہ میں کہاں ہے دیکھ بھال نکر۔ ہاں اے آہ دل تو تیرا ناداں نکال کریگا تو کہدے کہ تیرے ہی تو پاس ہے (اے یار) +

گر چاہتا ہے مثل مہ چاردہ فروغ	آ پھر کے شہر شہر میں کسب کمال کر
پوچھو چلے ہیں کونسے کعبہ کو اہل درد	ملک فنا ہے۔ جائیں ذرا دل سنبھال کر
تصویر ان کی حضرت دل کھینچ لائی گر	رکھدینگے ہم بھی پاؤں پہ آنکھیں نکال کر
قاتل ہے کس مزے سے نمک پاش زخم دل	بسمل ذرا تڑپ کے نمک تو حلال کر

دل کو رفیق عشق میں اپنا سمجھ نہ ذوق
مل جائے گا یہ اپنی بلا تجھ پہ ٹال کر

استاد مرحوم بادشاہ کے سامنے اپنا شعر یا غزل پڑھتے نہ تھے۔ طبیعت سے واقف تھے۔ اہل دربار میں سے کوئی سنا دیتا تو جو پسند آجاتا خوشی حضور کی تھی کہ یہ ہمارے نام سے مشہور رہو۔ چنانچہ اس پر خود غزل کہتے۔ اور بموجب معمول کے ٹوٹا پھوٹا مسودہ استاد کے پاس بھیجدیتے کہ اصلاح دیدیں۔ اس حالت میں استاد کو واجب تھا کہ اپنے اشعار کے پہلو بچاکر اُن کے شعر درست کریں۔ چنانچہ جب غزل مرتب کرکے حضور میں لیجاتے تو بادشاہ ہاں سے کچھ نہ کہتے مگر کئی دن کے بعد اسی طرح میں پھر ایک اور مسودہ بھیجدیتے۔ ابتدا میں ۲ ۳ دفعہ ایسا ہوا۔ استاد سمجھ گئے آخر یہ ہوگیا کہ جب ایسا موقع ہوتا۔ تو اپنی غزل میں اُنکا تخلص ڈالکر بھیجدیتے۔ وہ خوش ہوجاتے تھے جب بادشاہ کا پہلا دیوان چھپکر آیا۔ تو مجھے یاد ہے والد مرحوم نے غزل مرقوم الذیل دیکھکر مجھ سے کہا۔ دیکھو یہ غزل بھی بادشاہ کو دیدی۔ لڑکپن کی ہے۔ والد کو پہلے سے ساری یاد تھی۔

مزا چکھا یا ہے کوہکن کو۔ جو عشق آیا ہے امتحاں پر	
کہ لایا تو جوے شیر لیکن چھٹی کا دودھ آگیا زباں پر	
خدنگ و نالہ کھایا لیکن نہ لایا شکوہ کبھی زباں پر	

کر بوسہ اُس چشم سرمہ سا کا ہے مُہر گویا مری زباں پر
لگا کے باتوں میں ان کو لائیں جو حرف مطلب کا کچھ زباں پر
تو ایسی کہدیں کہ ناجس کا لگے زمیں پر نہ آسماں پر
تپ محبت میں سخت جانی کا یہ اثر ہے دل طپاں پر
کہ شکل سوہان پڑ گئے ہیں ہزاروں کانٹے مری زبان پر +
اٹھائے سو زخم ہر نمط ہیں۔ یہ خوں کے دعوے کوئی غلط ہیں
کہ مثل قط گیر خط پہ خط ہیں۔ ہنوز باقی ہر استخواں پر
خلش یہی خار خار غم کا رہا۔ تو مرقد پہ میرے سبزہ
یقیں ہے مانند برگ خرما اُگے گا نشتر لئے زباں پر +
کہا یہ سو بار دل کو روکر۔ حریف مت ترک چشم کو کر
سو آخرش ٹکڑے ٹکڑے ہو کر۔ بہا ہے مژگاں کی ہر سناں پر
وہ چشم ابرو تمہارے زیبا کہ۔ قاب قوسین جسنے ادنے
یہ خال پیشانی کیوں تمہارا۔ نہ فرق لیجائے فرقداں پر
کیے ہے داغ جنوں کہ چمکوں۔ جو تیری سر پر دشت وہاموں
چراغ وحشت سرائے مجنوں۔ کروں میں روشن چراغداں پر
بنا بگولے کو برج آسا۔ قریب ناقہ کے قیس پہنچا +
پر اُترے محمل سے کیونکہ لیلےٰ۔ کہ پردہ کھلتا ہے ساربان پر

کہاں رہی مجھ میں جاں ہے باقی کہ ہے دھواں ہو کے لب پہ آنی
جو ذوق آنسو کی بوند ٹپکی۔ ہمارے داغ دل طپاں پر

جب وہ پوچھے ہے غش کون میرے حتوں پر
میں کہوں میں تو کہے میں کے چھری گی

جو ترے دوست پہ تجھ سے ہے گذرتی ظالم
وہ مصیبت نہو دنیا میں کسی دشمن پر

تیرے دندان مسی لب کی دیکھی جو بہار
پڑ گئی اوس سی گلشن میں گل سوسن پر

اے دل وہ سر غمزہ پنہاں عیاں نہ کر
آنکھوں سے دیکھ اور زباں سے بیاں نہ کر

آہوں میں دود دل جو نکالوں تو وہ کہے
او تفتہ جاں! ہوا ہو یہاں سے دھواں نہ کر

ایک غزل کے دو مطلع مجھے ایک مجہول آدمی نے سنائے اور کہا کہ اُستاد کے ہیں۔ میں نے یاد کر لئے اور استاد سے جا کر پوچھے۔ فرمایا۔ اُہو۔ لڑکپن کے ہیں بھی۔ بلکہ بچپن کے۔ اب تو سنتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ لکھ لو۔ کبھی درست کرینگے۔ وہ بھی عجب دن تھے۔ ہم مشاعرہ میں گئے۔ یہ غزل پڑھی۔ بڑی تعریفیں ہوئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد حکیم شمار اللہ خاں فراق۔ برہان الدین خان زار۔ میر غالب علیخان سید تشریف لائے۔ یہ بزرگ اُس زمانہ میں اراکین مشاعرہ بلکہ اراکین شہر شمار ہوتے تھے۔ لوگوں نے اُن سے کہا۔ اُنہوں نے پھر ہمیں پاس بلایا۔ دل بڑھایا۔ اور فرمائش کر کے دو اور غزل پڑھوائی۔ کیا لوگ تھے۔ اللہ مغفرت کرے۔

نامۂ شوق کو مرے باندھے تو جو بال پر
کیوں نہ مرغ نامہ بر تجھکو ہو وبال پر

مصحف روے یار میں دیکھا ہے موجو خال پر
لکھتے ہیں قل ہو اللہ ہم ایک چنے کی دال پر

ہیں ہما کے سر پہ افسر اُن ہوا گیروں کے پر
لگ گئے جن طائروں کو ہیں ترے تیروں کے پر

اُنکو بے پر عرش اعظم پر اُڑاتے ہیں مرید
کیا غضب لائیں خدا جانے جو ہوں پیروں کے پر

ساقیا بت برگشتہ گر گردوں قسم پھر کر +	تیرہ بازگشتی ہو۔ ہاتھ میں قلم پھر کر
رکھ لیا اُس نے چمن میں گل جو سر پر توڑ کر	میں بھی حاضر ہوں کہا غنچے نے یوں منہ پھوڑ کر
بعد مردن آچکے رونے کو سُنکر گور در	جیتے جی کتنے ہو چل صورت تری در گور در
دل شوریدہ سے خاک اڑا کر	بیاباں رکھ لیا سر پر اُٹھا کر
خفا تو ہو نہ وقت ذبح میرے تلملانے پر	کہوں کیا لوٹتا ہوں میں تیرے بازو دبانے پر

سین مہملہ

یہ دو غزلہ انہی مسودوں سے نقل ہوا ہے جن پر نظرِ ثانی نہیں ہوئی تھی۔

کونسا ہمدم ہے تیرے عاشق دلدم کے پاس	غم ہی اُسکے پاس ہمدم آ ذرہ ہی دم کے پاس
ہمکو کیا ساقی جو تھا جامِ جہاں بیں جم کے پاس	تیرا جامِ بادہ ہو اور تو ہو اِس پُرغم کے پاس
خط کہاں آغا ہے پشتِ لب دلدار پر	ہیں جنابِ خضر آئے عیسیٰ مریم کے پاس
مرگ کے پاس ہے یہ اشک خونیں کا ہجوم ؟	یا دھرے یاقوت ہیں یہ دانہ نیلم کے پاس
روح اس آتش بجاں کی بعد مردن جوں پتنگ	آئیگی اڑکر چراغِ خانہ ماتم کے پاس
کسکی قسمت ہے کہ زخم تیغ قاتل ہو نصیب	جان سے جائیں نہ جائینگے مگر مرہم کے پاس
اک غزالے ایسکے گا کھائیں اگر آجائے ہاتھ	یہ جو چھلا آپکی انگلی میں ہے خاتم کے پاس

+ ساقیا ہے کہ جو قفا مارو

زلف سے بے وجہ خط سبز ہم پہلو نہیں
ہے کہکشاں عشق بچاں سنبل پرچم کے پاس

واہ صیاد اجل اور وہ صیادی کا پیچ
کھچکے ہے اسفندیار آیا کہاں رستم کے پاس

دیکھو فیاض ازل نے کیا دیا آنکھوں کو فیض
کاسہ در کف ہو کے یم آتے ہیں انکی نم کے پاس

ہے جو قسمت میں تو دریا بھی کبھی ہو جائیگا
آ لگا ہے اپنا قطرہ بھی کنار یم کے پاس

کر کے بحر و قافیہ تبدیل لکھ اور ایک غزل
بیٹھ کوئی دم تو اے ذوق اور اس غم کے پاس

تیر و کماں ہے گربت ناوک فگن کے پاس
آہ و قد خمیدہ ہے اس خستہ تن کے پاس

شب جان زار رک گئی لب پر دہن کے پاس
پھر اٹھکے لگیا یہ مسافر وطن کے پاس

یہ جوئے خوں رواں نہیں دیکھو ہے رو رہا
تیشہ سر اپنا رکھکے سر کوہکن کے پاس

اس آرزو میں جان ہوں دیتا کہ لیکے جام
پہنچوں کبھی لب بت پیماں شکن کے پاس

انگشت شمع کیوں نہ اٹھے بہر فاتحہ
یہ ڈھیر ہے پتنگ کا پائے لگن کے پاس

میں تو اسی جھپک پہ فدا ہوں کہ کان کو
شب کیا ہٹا لیا مرے لاکر دہن کے پاس

چمکے گی تا بہ حشر ہماری لحد میں آگ
چاک جگر میں دیکھنا چاک کفن کے پاس

میں نے کہا کہ بوسہ تنہی دو ادا سے میں
لاسکتا اپنا منہ نہیں چاہ ذقن کے پاس

ہنسکر کہا کہ جاتا ہے پیاسا کوئیں پہ آپ
یا جاتا ہے کواں کسی تشنہ دہن کے پاس

اے ذوق صدقے جائیے پیک خیال کے
کیا لیگیا اڑا کے بت سیم تن کے پاس

سمجھیں کیا باقی ہے جو دیکھے ہے تو آنکے پاس
بدگماں وہم کی دارو نہیں لقمان کے پاس

چین سے بعد ہمیں جیسے سین و قاف قفس | قفس میں بند ہیں ہم جیسے قاف قفس

نرگسین کی غزل ہے۔ والد مرحوم کی اُس عہد کی بیاض میں لکھی تھی۔ دو شعر مجھے یاد رہگئے۔

لب شیریں کو ترے جان کے سرچشمہ مگس | بیٹھی نظر و نہیں تجھے جا ہے ہی لبِ چشمہ مگس
بلہوس جیفۂ دنیا سے بھرا دل نہ ترا | تو مگس اور تری چشم ہوس چشمہ مگس

صاد مہملہ

سب مذاہب میں یہی ہے، نہیں اسلام میں خاص | کہ جہاں عام ہی ہوتا ہے وہاں عام میں خاص
ساغر دل کی تو واقف نہیں کیفیت سے | دیکھ عکس رخ ساقی ہے اسی جام میں خاص
حضرا! باتیں ہیں کہ ہے چشمۂ حیواں جاں بخش | ہے یہ خاصیت اُسی کے لب دشنام میں خاص
شیخ صاحب کے ہیں نزدیک وہ خاصان خدا | خدمتی اُنکے ہیں جو مُرد خدام میں خاص
کام دن رات ہے عاشق کا تڑپنے ناکامی | کر دیا تو نے لگا اسکو اسی کام میں خاص
عشق کا جوش ہے جبتک کہ جوانی کے ہیں دن | یہ مرض کرتا ہے شدت انہیں ایام میں خاص

ذوق اسمائے الٰہی ہیں سب اسم اعظم
اس کے ہر نام میں عظمت ہے نہ ایک نام میں خاص

ضاد معجمہ

پر کترنے کو جو صیاد نے چاہی مقراض | ہاتھ ملتی تھی مرے حال پہ کیا ہی مقراض
بحر و بر میں نہیں کس کو ہوس قطع و برید | ناخن شیر ہے خنجر دم ماہی مقراض
گل کترتی ہیں ہزاروں تری آنکھیں کافر | ہے عجب طرح کی ایک تیز نگاہی مقراض

کب زباں چلتی ہے اُس رزم میں بدگویوں کی
اُنکے منہ میں یہ زباں ہے کہ الٰہی مقراض

محضرِ خوں مرا سارا ہے کتر کر پھینکا +
دیگی اس ظلم کی محشر میں گواہی مقراض

پاس کیا قطع تعلق میں کہ یکساں سمجھے
قطع میں جامہ درویشی و شاہی مقراض

رشتۂ عمر کیا قطع سرائے ذوق
کھوسکی شمع کے دل کی نہ سیاہی مقراض

اس غزل میں ایک شعر اور بھی کہا تھا

اڑتے پرزے ہیں جگر کے کبھی پھٹتا ہوں جو آہ
ہو تا حقیر ہے مرے مطلع آہی مقراض

اسے میں نے لکھکر تامل کیا۔ فرمایا کیا سوچتے ہو؟ میری ابتدا تھی۔ کچھ نہ بولا۔ فرمایا۔ آہی سبزواری۔ بڑا شاعر ہوا ہے۔ پھر آپ ہی کہا۔ کاٹ دو۔ شاید اور لوگ بھی نہ سمجھیں۔ ہم تو سب ہی کے لئے کہتے ہیں"۔

عین مہملہ

ذوق کیونکر ہو اپنا دیواں جمع
کہ نہیں خاطر پریشاں جمع

قاف

پھر کر ادھر اُدھر بھی نہ اپنا گیا قلق
لفظ قلق کی طرح سے یوں ہی ہے قلق

کاف

جو کھلکر اُنکی زلفیں بال آئیں سر سے پاؤں تک
بلائیں آکے لیویں سو بلائیں سر سے پاؤں تک

ہم اُنکی چال سے پہچان لینگے اُن کو برقع میں
ہزار اپنے کو وہ ہم چھپائیں سر سے پانوں تک

یہ جتنے سرو ہیں۔ سب اُنکے قد پر زہر کھاتے ہیں
چمن میں سبز کیونکر ہو نہ جائیں سر سے پانوں تک

مزا دل ایک۔ دوں اُس خوش ادا کی کس ادا کو میں
کہیں وہ ہاں تو ادائیں ہی ادائیں سر سے پانوں تک

سراپا شوق جائیں سر کے بل ہم جنکے جلسے میں
مثال شمع وہ ہمکو جلائیں سر سے پانوں تک

نہوں بے پردہ۔ تو بھی کھڑے ہو کے شوخی سے
پھبن جلپن سے پردہ دکھائیں سر سے پانوں تک

بنایا اسلئے اس خاک کے پُتلے کو تھا انساں
کہ اسکو درد کا پتلا بنائیں سر سے پانوں تک

سپر پاک ہیں دھوے جنہوں نے ہاتھ دنیا سے
نہیں حاجت کہ وہ پانی بہائیں سر سے پانوں تک

مزا اتنا ہی ذوق افزوں ہو۔ جتنے زخم افزوں ہوں
نہ کیوں ہم زخم تیغ عشق کھائیں سر سے پانوں تک

پھر تو آنے سے ہم جا کے اُس مغرور تک
پر اُچھلتا ہی ہا اپنا کلیجہ دور تک

صفحۂ دہر پہ یکدل نہوا ایک سے ایک
دل کے دو حرف ہیں سو بھی ہے جدا ایک سے ایک

گ

پرانی غزل ہے۔ ۷ شعر تھے۔ دو یاد رہگئے۔ وہی لکھدیتا ہوں۔

بینی و عارض و ابرو سے ہیں شاخ و گل و برگ
یوں عیاں اس چمن رو سے ہیں شاخ و گل و برگ

بینی او روہ دہن خندہ زن او تارک لب
لکھے گویا قلم مو سے ہیں شاخ و گل و برگ

لام

پھنسے نہ حلقہ گیسوئے تابدار میں دل
بلا سے گر ہو نوالہ دہانِ مار میں دل

بغل میں جیسا مرا دل بغل کا دشمن ہے
نہ ایسا ہو کسی دشمن کے بھی کنار میں دل

نکل نہ جائے دمِ اضطراب سینہ سے
برنگِ شعلہ کہیں۔ آہ شعلہ بار میں دل

ہمیشہ رہ درِ سینہ سے کیوں ہے چشم براہ
اگر نہیں کسی مہوش کے انتظار میں دل

ترا سنگار یہی ہے وہ بلا کہ جائے گھر۔
پرے زلف مسلسل کی تار تار میں دل

خدا بچائے مجھے اس بغل کے دشمن سے
کہ میرا دشمن جاں ہے مری کنار میں دل

بغیر مارے نہ چھوڑیگی دل کو کافر زلف
کہو یہ دل سے کہ جائے نہ مار مار میں دل

اگر نہ جبر کروں اختیار اے ناصح
تو کیا کروں کہ نہیں میرے اختیار میں دل

اڑیگا مثلِ شرر ٹکڑے ہو کے سنگ مزار
رہا اگر یوہیں گرمِ تپش مزار میں دل

برنگ غنچۂ پیکان و غنچۂ تصویر
ہوا شگفتہ نہ اپنا کسی بہار میں دل

فلک کے رنگ سے ظاہر ہیں ماتمی آثار
خوشی نہ پاکینوکہ ہو اس نیلگوں حصار میں دل

برنگ بیضۂ نوروز۔ توڑے دل اس نے
ہزاروں۔ ایک ہما ما ہے کس قطار[1] میں دل

ہزار دشمن جاں سے ہے ایک دوست بُرا
جو پوچھو کون ہے وہ؟ میں کہوں ہزار میں دل

نہ تیں خلد میں حوریں تو رہتا خلد میں کون؟
لگے ہے صحبتِ خوبانِ گلعذار میں دل

یہ جسم زار ہے میرے پیرہن میں ہے تار
کہ ہے تار میں؟ یا میرے جسم زار میں دل

اٹھا بھی لائے اگر ہنستیں مجھے اے فوق
رہیگا میرے عوض میرا کوئے یار میں دل

---

[1] قطار۔ بہار نوروز میں لوگ باجیت پر انڈے لڑاتے تھے۔ اسکے کئی طریقے تھے۔ ایک یہ بھی تھا کہ دو آدمی ۲۰، ۲۰ تا ۳۰، ۳۰ انڈے لیکر اپنی اپنی قطار باندھتے تھے۔ ہر ایک اپنی قطار سے ایک ایک انڈا لیتا تھا اور حریف سے لڑانے جاتا تھا جسکا انڈا اخیر کو ٹوٹتا۔ اُسکی ہار ہوتی تھی۔ حریف ٹوٹے ہوئے سب انڈے لے لیتا تھا۔ اسے قطار لوٹنا کہتے تھے۔ یہ رسم ایران توران افغانستان سے ہو کر ہندوستان میں آئی تھی۔

(۱) انتظار لے مجھے میرے نشیمن سے فلک زار
(۲) نہ خار رنگ کسی انداز رنگ سے زار

ازل سے یوں دلِ عاشق ہے نور کی قندیل
کہ جیسے عرشِ خدائے غفور کی قندیل

سمجھ وہ دُرِ بنا گوشِ نور کی قندیل
خجل ہے اخترِ صبحِ نشور کی قندیل

ہمارے کعبۂ دل میں ہمیشہ روشن ہے
کسی کے بابِ کمالِ ظہور کی قندیل

جہاں ہے خانۂ عشرت! ابھی ہوا اس کا فروغ
کہ لٹکے اس میں سرِ پرغرور کی قندیل

رہے ہے جوں قمر منخسف سدا بے نور
سیاہ بختوں کے بالینِ گور کی قندیل

پڑے جو عکس ترا جام میں تو ہو روشن
حبابِ بادہ تجلی سے طور کی قندیل

عیاں ہے یوں مرے روزِ سیاہ میں خورشید
کہ جیسے شبکو نظر آئے دور کی قندیل

سوائے دل کے ہو نا رنجِ باغِ خلد سے بھی
کبھی پسند نہ اُس شاکِ حور کی قندیل

اڑے جو آہ کے ہمرہ نکل کے پارہ دل
ہوئے ہوا میں وہ صورت طیور کی قندیل

وہ تیر ہیں یہ مرے نالہ قیامت زا
کہ اُن کے رکھنے کو لازم ہے صور کی قندیل

نسیم کیا ہے۔ کہ روضہ میں تفتہ جانوں کے
نہ گل ہو باد سے آوازِ صور کی قندیل

سمجھتا قدر ہے ناقص کہاں غزل کی ذوق
یہ روشن آپ نے کیوں پیش کور کی قندیل

یہ غزل لڑکپن کی ہے۔ نظر ثانی نہیں ہوئی۔

دیوانہ ہوں نیرا مجھے کیا کام کہ لوں گل
زیبائش سر کو ہیں مرے داغِ جنوں گل

ہوں بر قدمِ خار۔ بہ سر داغِ جنوں گل
چاہے ہے جنوں بوسۂ اخارِ چنوں گل

میں کشتہ ہوں لعلِ لبِ پاں خوردہ کس کے
نکلے ہیں مری خاک سے آغشتہ بخوں گل

سوکھڑے ہیں اڑی کے برنگِ گلِ صد برگ
کیا دشتِ نوردی میں کرتا ہے جنوں گل

اُس گل میں نہ پایا اثر بوئے محبت +
سو بار سنگھائے اُسے پڑھ پڑھ کے فسوں گل

ہے روشنی خانۂ دل سوزِ محبت
زاہد تو بتا شمعِ حرم کیونکہ کروں گل

پیکاں تو ہے دلدوز سرِ سینۂ ہر سوفار
اُس تیر سے ہے دل میں مرے غنچہ بروں گل

اے ذوق محبت میں کسی غنچہ دہن کے
گلدستہ سے بھی ہیں مرے ہاتھوں پہ فزوں گل

آئینۂ فلک میں ہے عکس چراغ دل
خورشید ہو نمود ہوا بل بے داغ دل

میر

عالم نوجوانی کی غزل ہے۔ فرماتے تھے کہ ایک مشاعرہ میں زمین مرقومہ الذیل طرح ہوئی۔ آغاز شباب تھا۔ ہم نے کہا کہ زمین تو گرم ہے۔ مگر تاثیر ٹھنڈی ہے۔ میر مشاعرہ نے کہا کہ خیر اب تو ہو گئی۔ ہم نے کہا۔ اچھا ہم تو دو غزلیں کہدینگے۔ مگر دیکھنا سب کیا کہینگے۔ جب مشاعرہ ہوا تو جو جلسہ میں آہ و نالاں آیا۔

شمع ناداں نہ ہوا ایک رات بہا آنسو گرم
برسوں یہاں آنکھ سے ٹپکا ہے مرا لو ہو گرم

اے جنوں! ہے خبر موسم گل ہر سو گرم
دم تو لے لینے دے مجھکو۔ نہ کر اتنا تو گرم

آتش رشک سے اُس کاکل مشکیں کے صبا
جل گیا نافہ ہیں اس درجہ ہوا لو ہو گرم

آبلے سینہ دریا میں ہوئے جل کے حباب
دیدۂ تر نے بہائے یہ غضب آنسو گرم

اے صبا نکہت گل لیکے چمن کو پھر جا
کیا کروں سر کو مرے کرتی ہے یہ خوشبو گرم

آتش حسن کا پتلا ہے تو اے رشک پری
تا بہ رخ تیری بھبوکا ہے بلا ہے تو گرم

تو سن ناز ترا ہر قدم اے رشک غزال
کیوں نہ ہو تیز کہ کہتا ہے مزاج آہو گرم

فاختہ سوز محبت سے ہوئی جلکے ہے خاک
کھینچے ہے دل سے پر اب تک نفس کو کو گرم

مشعل افروز جنوں کون ہو مجنوں کے لئے
گر نہو گرمیٔ وحشت سے دل آہو گرم +

سرد مہری کا تری ہو جو خنک دل کشتہ
ق ہووے گلگشت سے کیا اسکا دل اے گلرو گرم

تابشِ نارِ جہنم سے سوا اس کو لگے +
ہمرہ بادِ سحر بوئے گل شب بو گرم

سرد مہری سے رکھا اپنی خنک دل تو نے
ق گر مجوشی سے کیا تو نے بت دلجو گرم

اپنے کشتے کی کرامت کو ذرا دیکھ آکر
ایک پہلو ہے اگر سرد تو ایک پہلو گرم

ذوق دل میں یہ تپِ عشق۔ کلام ایسا خنک
عاشقانہ سی غزل اور کوئی پڑھ تو گرم

دل بے اے آتشِ غم۔ دل کو کرے تو گرم
کر زمیں پشت سمک تک ہو تہ پہلو گرم

لطف بوسہ رہا۔ ہم پہ ہوا جب تو گرم
شربت قند دیا۔ کر کے پر آتش خو۔ گرم

تن ہا یوں ہی تپِ غم سے اگر گرم مرا
سیخ آہن کی طرح ہونگے بدن پر مو گرم

نیشتر جلکے وہیں کشتہ فولاد ہوا +
نکلا یہ آتشِ سودا سے مرا لو ہو گرم

کٹ سکا صید محبت کا نہ قاتل سے گلا
اُس نے پتھر پہ یہ رگڑا کہ ہوا چاقو گرم

آتشِ دل سے پس از مرگ بر نگ شعلہ
خاک عاشق سے نکلتا ہے گل خودرو گرم

مہر وش بل بے ترے حسن جہانتاب کی تاب
کج سے گرم آئینہ ہو۔ آئینہ سے زانو گرم

کیا کہوں نامہ جانسوز کی اپنی تاثیر
جلگیا بس۔ یہ کبوتر کا ہوا بازو گرم

سرِ مجروح کو کھرچا کئے گیا وہ۔ اور میں
چونکا اُسوقت کہ جب منہ پہ بہا لو ہو گرم

دستِ خورشید کی۔ رعشہ سے سپر جا چھوٹ
کھینچکر تیغ کو جب ہو وہ ہلال ابرو گرم

دل عاشق کے جلانیکا ہے سارا ساماں
بینی شعلہ ہے تری۔ رنگ بھبوکا ریو گرم

کر زما سوختہ جاں صبح ہے گرم فغاں
کہ ہوا آتی ہے کوچہ سے ترے گلرو گرم

ہم تو سنتے تھے سدا کُلُّ حَمُوْمٍ بَارِدٌ
ذوق ہوتا ہے وہ کیوں ہو کے ترش ابرو گرم

پابند جوں دخاں ہیں پریشانیوں میں ہم
یارب ہیں کسکی زلف کے زندانیوں میں ہم

ہوتی نہ یاد زلف تو خطِ شکستہ میں
لکھتے الف خطوں کی نہ پیشانیوں میں ہم

زنجیر میں بھی نالہ زنجیر کی طرح
جوشِ جنوں سے رہتے ہیں جولانیوں میں ہم

پائی نہ تیغ عشق سے ہم نے کہیں پناہ
قربِ حرم میں بھی ہیں تو قربانیوں میں ہم

دوزخ بھی جائے نعرۂ ھَلْ مِنْ مَزِید بھول
لائیں جو آہ کو شرر افشانیوں میں ہم

پاکوبیوں کو شردہ ہو زنداں کو ہو نوید
پھرہیں جنوں کے سلسلہ جنبانیوں میں ہم

نم بھی نہیں جگر پہ ہی - اسقدر رہے
سرگرم سوز عشق کی مہمانیوں میں ہم

مطلب سے اپنے کون ہے آگاہ جز خدا
جو خطِ سرنوشت ہیں پیشانیوں میں ہم

ہیں آئینہ میں صورت تصویر آئینہ +
آئینہ رو کے سامنے حیرانیوں میں ہم

ہو وہ عزیز سورۂ یوسف سے بھی سوا
رکھدیں تری شبیہہ جو کنعانیوں میں ہم

کیا جانیں ہم زمانے کو حادث ہے یا قدیم
کچھ ہو - بلا سے اپنی کہ ہیں فانیوں میں ہم

کیوں جی کے ہجر میں ہوئے شرمندۂ بقا سے
اب رہ رہے ہیں اُسکی پشیمانیوں میں ہم

پردہ میں چشم مست کے سرخوش جو ہیں مدام
شرب الیہود[1] کرتے ہیں نصرانیوں میں ہم

[1] شرب الیہود - یہودی لوگ کئی ہزار برس سے ایسی حالت میں ہیں کہ جس ملک میں ہوں کمزور رہتے ہیں ماوراسی واسطے خواہ عیسائیوں خواہ مسلمانوں کے ماتحت ہوں خوشحالی نہیں ظاہر کرتے - عیسائیوں سے زیادہ تر جیے رہتے ہیں - شراب بھی کم پیتے ہیں اور چھپکر پیتے ہیں - اہل ایران نے شرب الیہود اصطلاح مقرر کردی یعنے کم پینی اور چھپکر پینی - شعر کا مطلب ہے کہ ہم شراب نہیں پیتے چشم مست کی یاد میں در پردہ خوش رہتے ہیں - گویا ہماری میخواری یہودیوں کی شراب خواری ہے ۱۲

اُس خالِ رخ پہ جمع ہوئے قطرۂ عرق +
ہندو اسیر دیکھیں ہیں دُرانیوں میں ہم

سینہ کا چاک سینے کی فرصت کہاں کہ ہیں
مصروف زخمِ دل کی مگس رانیوں میں ہم

بیم کدورتِ دلِ صیاد گر نہ ہو +
کیا کیا اُڑائیں خاک پر افشانیوں میں ہم

دکھلائیں روزِ حشر کو مِن السطور سے
اپنے سیاہ نامہ کی طولانیوں میں ہم

جا سکتے ضعف سے نہیں کوچہ میں اس کے ذوق
بہجائیں کاش گریہ کی طغیانیوں میں ہم

نون

بے یار روزِ عید شبِ غم سے کم نہیں
جامِ شراب دیدۂ پرنم سے کم نہیں

دیتا ہے دورِ چرخ کسے فرصتِ نشاط
ہو جام جسکے ہاتھ میں وہ جم سے کم نہیں

اُس زلفِ فتنہ زا کے لیئے اے مسیح دم
کچھ دست شانہ پنجۂ مریم سے کم نہیں

زیبا ہے روئے زرد پہ کیا اشک لالہ گوں
اپنے خزاں بہار کے موسم سے کم نہیں

سرعت ہے نبض کی رگِ سنگ مزار میں
دل کی تپش کچھ اب بھی تپِ غم سے کم نہیں

وحشی کو تیری چشم کی مژگانِ ہر غزال
صحرا میں تیزِ ناخنِ ضیغم سے کم نہیں

ہوتی ہے جمع زر سے پریشانیِ آخرش
درہم کی شکل صورتِ درہم سے کم نہیں

ساقی ملے ہزار خلاطوں میں خاک میں
جو خم بنے ہے قالبِ آدم سے کم نہیں

اُس حور وش کا گھر مجھے جنت سے ہے سوا
لیکن رقیب ہو تو جہنم سے کم نہیں +

شورابۂ سرشک میں ڈوبا ہوا ہے دل +
تیزاب میرے زخم پہ مرہم سے کم نہیں

آنکھوں سے تیرے پارہ الماس زخمِ دل
مجھکو تو جلوہ گل و شبنم سے کم نہیں

(نہ ہو جسکے پاس جام وہ اب جم سے کم نہیں)

اے ذوق کس کو چشم حقارت سے دیکھیے
سب ہم سے ہیں زیادہ کوئی ہم سے کم نہیں

ہاں تائل دم ناوک فگنی خوب نہیں
ابھی چھاتی مری تیروں سے چھنی خوب نہیں

تشنۂ دشتِ محبت کے لئے اُس لب سے
کوئی دنیا میں عقیق یمنی خوب نہیں

گل پریشاں ہوا ہنس ہنس کے چمن میں آخر
دیکھ اے غنچہ یہاں خندہ زنی خوب نہیں

خوبیاں یوں تو ہیں اُس عالم تصویر میں سب
ایک مگر ناز سے یہ کم سخنی خوب نہیں

چشم کہتی ہے تری جنبش مژگاں سے کہ دیکھ
سر پہ بیمار کے یہ سینہ زنی خوب نہیں

یہ نہیں شیشۂ مے۔ ہے کسی میخوار کا دل
محتسب دیکھ۔ نہ کر دشکنی خوب نہیں

تابِ نداں نہ دکھا بزم میں تو ہنس ہنسکر
کوئی کھا جائے جو ہیرے کی کنی خوب نہیں

بات تو ہم نے بنائی تھی وہاں خوب۔ مگر
تھی جو بگڑی ہوئی قسمت۔ تو بنی خوب نہیں

خلش خار کا کھٹکا ہے بغل میں موجود
دیکھ گل دعوئے نازک بدنی خوب نہیں

اٹھ تو جائیگا اس دل سے دھواں آہ کے ساتھ
جبتلک جلنے کا یہ سوختنی خوب نہیں

کون آتش نفس اے ذوق چمن سے گذرا
آج جو سرو نسیم چمنی خوب نہیں

۱۸۵۲ء میں مرزا خدا بخش ایک مغرز شاہزادہ نے قلعہ میں مشاعرہ شروع کیا حضور سے بھی غزل کا وعدہ لیا۔ استاد مشاعرہ میں نہ جاتے تھے۔ اُن سے بھی بہت کہا اور اقرار لیا مطلب یہ تھا کہ آئینگے تو سینکڑوں آدمی سُننے کو آئینگے مشاعرہ کو رونق ہوجائیگی شاہزادہ مذکور مومن خاں کے شاگرد تھے مگر اُستاد کو مانتے تھے غرضکہ مشاعرہ میں گئے غالب مرحوم۔ مولوی امام بخش صاحب صہبائی۔ وغیرہ وغیرہ اچھے اچھے اشخاص تھے

حضور بالا بالا تشریف لائے۔ اور پس پردہ بیٹھے۔

حکیم احسن اللہ خاں طبیب خاص بڑے شایق سخن تھے۔ اور سخن شناس تھے۔ انہوں نے اُستاد سے کہا۔ کیوں حضرت مشاعرہ شروع ہو؟ اُستاد نے کہا۔ بسم اللہ۔ چنانچہ بموجب آئین مشاعرہ پہلے شمع مشاعرہ وسط مجلس میں رکھی گئی۔ ایک خواص خاص حضور کا شمع کے پاس باادب بیٹھا اور حضور کی غزل سُنائی۔ (اکثر مشاعروں میں یہ غزل خلیفہ اسمٰعیل مرحوم پڑھا کرتے تھے)۔

اُستاد جب حضور کی غزل مشاعرہ کیلئے کہتے تھے تو اپنی غزل اُس طرح میں نہ کہتے تھے۔ اور کبھی کہنی بھی پڑتی۔ تو اپنی غزل کے ایسے شعر پڑھتے کہ حضور کی غزل بھیکی نہ پڑ جائے اب بھی نہ لکھی تھی۔ شمع سامنے آئی تو کہا۔ مجھے تو فرصت نہیں ہوئی۔ کیا کہوں۔ غالب مرحوم۔ مولوی امام بخش صاحب اور اور اشخاص نے فرمایش کی کہ کوئی غیر طرح کی غزل ہی پڑھئے۔ سب نے بہت کہا تو میرا ایک بیاض لیتا گیا تھا۔ وہ لیکر غزل مرقومۃ الذیل پڑھی۔ تعریفوں کا غل تھا کہ دوسرا مصرع سنائی نہ دیتا تھا۔ در و دیوار بول رہے تھے۔ ع

ہفتاد و دو فریق حسد کے عدد سے ہیں +	

حضور کی غزل جو اُس مشاعرہ میں پڑھی گئی تھی۔ ایک شعر اُسکا مجھے اب تک نہیں بھولا۔ اور نہ بھولے گا۔

شاہوں کے مقبروں سے الگ دفن کیجیو	ہم بیکسوں کو گور غریباں پسند ہے

لہ غزل مذکور بادشاہ کے کسی دیوان میں نہیں لکھی گئی۔ مذکورہ بالا شعر سکاب مجھے یاد آتا ہے۔ دیدہ عبرت سے نمونہ کی پنج تاہے۔ دیکھو اخانہ برباد کا واقعہ بھی اُسی پسند پر ہوا۔ کابل میں مرا ہوا بابر دادا کا مقبرہ موجود تھا۔ دکن میں ہوتا تو اورنگ آباد میں عالمگیر کا مقبرہ تھا۔ اکبر آباد بھی دار السلطنت تھا۔ وہاں مرا تو شاہجہان کا مقبرہ تھا۔ سکندرہ پاس تھا وہاں تا

دلی میں تو پشت خاندان زیر زمیں آباد ہے - سکندرہ میں اکبر - آگرہ میں شاہجہان اورنگ آباد میں عالمگیر - اس غریب کو کوئی جگہ پسند نہ ہوئی - پسند کہاں ہو رنگون جل شانہ جل جلالہ

ہنقاد و دو فریق حسد کے عدو سے ہیں
اپنا ہے یہ طریق کہ یار حسد سے ہیں

مردار ہیں وہ طائر سدرہ ہی کیوں نہ ہوں
تیر نگاہ یار کی جو دور رو سے ہیں

خورشید وار دیکھتے ہیں سب کو ایک آنکھ
روشن ضمیر ملتے ہر ایک نیک و بد سے ہیں

وہ مست ہوں کہ رکھتے قدح کش تیمنا
بنیاد میکدہ مری خشت لحد سے ہیں

جانداد گان عشق سے پوچھو فنا کی راہ
اس میں جناب خضر بھی نابلد سے ہیں

چشم تمر ہے سرو سے انکو جو بے وقوف
مکتے امید وہ ستی اس سرو قد سے ہیں

دو گالیاں کہ بوسہ - خوشی پر ہے آپ کی
رکھتے فقیر کام نہیں رد و کد سے ہیں

بر میں خنک دلوں کے ہو گر خرقہ فقیر
سمجھو کہ کرتے برف کی پوشش نمد سے ہیں

وہ ایک دم کہ بس میں میسر ہو وصل یار
بہتر سمجھتے ہم اسے عمر ابد سے ہیں

جتنے مزے ہیں یہاں روش نشہ شراب
ہو جاتے بے مزہ ہیں جو بڑھ جاتے حد سے ہیں

ہر چند ناتواں ہیں - مگر رکھتے دل قوی
ہم عشق کی کمک سے جنوں کی مدد سے ہیں

جان لباسیوں کے نہ ظاہر لباس پر
عاری - عباے ہوش و قباے خرد سے ہیں

دل کے ورق پہ ثبت ہیں صد ہا داغ عشق
ہم کرتے ذوق عشق کا دعوے سند سے ہیں

ہے چشم تیری مست - قدح گیر باغ حسن
عارض پہ خط ہے طوطی تصویر باغ حسن

بقیہ حاشیہ اکبر کے دامن میں سوتا - لاہور میں آن مرتا - جہانگیر کی خوابگاہ حاضر تھی - ہوا تو کہاں ؟ رنگون میں - خدا مغفرت کرے استاد مرحوم نے کیا خوب کہا تھا -

لاشے کو دفن کیجے - میرے کہ پھینک دیجے
مردہ بدست زندہ جو چاہے سو کیجے

ہو جاتا دل ہے بیٹھ کے خود گلرخوں میں گل
تاثیر باغ خلد ہے تاثیر باغ حُسن +

تحریر سرمہ ہے تری آنکھوں میں وقت خواب
اے غیرتِ چمن - دروزنجیر باغ حُسن +

پانو سے سر تلک ہو رخ ہونگے لالہ زار
مشاطہ باغباں ہے بہ تدبیر باغ حُسن +

تبخالہ لب پہ گرمی بوسہ سے ہے کہاں
ہے گلرخو! یہ غنچۂ دلگیر باغ حُسن +

اے رشک باغ طاقِ دوابرو کا تیر ہے عکس
دریائے آئینہ میں ہے تعمیر باغ حُسن +

سیر خزاں جو چاہے تو اے ذوق دیکھ لے
اُس نازنیں کا جلوۂ تغییر باغ حُسن +

گئیں یاروں سے وہ اگلی ملاقاتوں کی سب رسمیں -
پڑا جسدن سے دل بس میں تیرے اور دل کے ہم بس میں -

کبھی ملنا - کبھی رہنا الگ مانند مژگاں کے +
تماشا کج سرشتوں کا ہے کچھ اخلاص آپس میں

توقع کیا ہو جینے کی ترے بیمار ہجراں کی +
نہ جنبش نبض میں جس کے - نہ گرمی جس کے لمس میں

دکھائے چہرہ دستی آہ بالا دست گر اپنی +
تو ہارے ہاتھ دامان قبائے چرخ اطلس میں

جو ہے گوشہ نشیں تیرے خیال بیتِ ابرو میں -
وہ ہے بیت الصنم میں بھی تو ہے بیت المقدس میں

کرے لب - آشنا حرف شکایت سے - کہاں یہ دم ؟
ترے محزونِ بے دم میں - تیرے مفتونِ بیکس میں

ہوائے کوئے جاناں لے اُڑے اسکو تعجب کیا۔
تنِ لاغر میں ہے جاں اسطرح جس طرح بوتحس میں

مجھے ہو کس طرح قول و قسم کا اعتبار اُن کے +
ہزاروں دیچکے وہ قول لاکھوں کھا چکے قسمیں

جو مضمون ذوق ایوان دو عالم میں ہوے مسدود
حواس خمسہ ہیں انساں کے وہ بند مخمس میں

بلائیں آنکھوں سے اُن کی مدام لیتے ہیں
ہم اپنے ہاتھوں کا مژگاں سے کام لیتے ہیں

ہم اُن کے زلف سے سودا جو دام لیتے ہیں
تو اہل ہو وہ سب دام دام لیتے ہیں

ترے خرام کے پئے رو ہیں جتنے فتنے ہیں
قدم سب آنکے وقت خرام لیتے ہیں +

شبِ وصال کے روز فراق میں کھایا کیا
نصیب مجھسے مرے انتقام لیتے ہیں

تیرے اسیر جو صیاد کرتے ہیں فریاد
تو پھر وہ دم بھی نہیں زیر دام لیتے ہیں

ہم انکے زور کے قائل ہیں زور بازو میں
جو عشق میں دل مضطر کو تھام لیتے ہیں

جھکائے ہے سر تسلیم ماہ نو پر وہ۔
غرور حسن سے کس کا سلام لیتے ہیں

ترے ہیں بتاتے نہیں تجھے قاتل
جب اُن سے پوچھو اجل کا ہی نام لیتے ہیں

قمر کا داغ بھلا آئے کس حساب میں وہاں
وہ مول ایسے ہزاروں غلام لیتے ہیں

ہمارے ہاتھ سے اے ذوق وقت مے نوشی
ہزار ناز سے وہ ایک جام لیتے ہیں

دو دل سے ہے تاریکی میرے غمخانہ میں
طمع ہے ایک شمع گم گشتہ اس کاشانہ میں

میں ہوں وہ خشت کہن مدت سے ہوں ویرانہ میں
برسوں مسجد میں رہا برسوں رہا بتخانہ میں

آشنائی وحشت بیگانگی — یا تیری آنکھوں نہیں دیکھی
میں وہ کیفی ہوں کہ پانی ہو تو بن جائے شراب — جوش کیفیت سے میری
ہوش کا دعوے ہے بیہوشوں کو زیر آسماں — خم نشیں ہیں مثل فلاطوں سب
پتھر و میں ٹھوکریں کھاتی ہے ناحق سیل آب — پوچھو کیا لیجائے گی آکر
عشق کو اے حسن اگر نشو و نما منظور ہو — سبز نخل شمع ہو خاکستر پر
برق خرمن سوز ہے عالم میں نافہمی تری — ورنہ کیا کیا لہلہاتے کھیت ہیں
کس نزاکت سے ہے دیکھو اتحاد حسن و عشق — زلف و ہاں شانے نے کھینچی دو رو ہے یہاں شا

ایک پتھر چومنے کو شیخ جی کعبہ گئے
ذوق ہر بت قابل بوسہ ہے اس بتخانہ میں

اس گلستان جہاں میں کیا گل عشرت نہیں — سیر کے قابل ہے یہ پر سیر کی فرصت نہ
علم جس کا عشق اور جسکا عمل وحشت نہیں — وہ فلاطوں ہے تو اپنے قابل صحبت
خواہ گردش ہے زمیں کو خواہ پھرتا ہے فلک — پر ہمیں زیر فلک سر منزا
بسمل تیغ محبت کا لب ہر زخم دل — ہوتا وا بے شور واویلا
منہ میں گر پانی چوآوے یار اپنے ہاتھ سے — مرگ کی تلخی سے شیر میں
دل وہ کیا جسکو نہیں تیری تمنائے وصال — چشم وہ کیا جسکو تیرے رخ کی حسرت نہیں
کہتے ہیں جائیں گر چھٹ جائیں غم کے ہاتھ سے — پر تیرے غم کی بھی رخصت نہیں
ایک حسرت تو برستی ہے کبھی برسی دن — ورنہ رہ مرتربت نہیں
ہے نوشتہ میں تجے بیمار کے صحت کہاں؟ — اسکے نسخہ میں دوا کے لفظ کو صحت نہیں
کھاکے زخم تیغ قاتل جو بجا لائے نہ شکر — زیادہ کافر نعمت نہیں

خاک ہو کر بھی فلک کے ہاتھ سے ہم کو قرار
ایک ساعت مثل یک شیشۂ ساعت نہیں

خانۂ ہستی کا اپنے صحن ہے دشت عدم
روز کر لیجے چہل قدمی مگر فرصت نہیں

مرئی دشت پانو پھیلائے تو پھر دو نو جہاں
ہوں اگر یک عرصہ میداں تو کچھ وسعت نہیں

ایک دل اور اُسپہ اتنے بار غم - اللہ رے دل
اور اس طاقت پہ ایسا کوئی بے طاقت نہیں

ذوق اس صورتکدہ میں ہیں ہزاروں صورتیں
کوئی صورت اپنے صورتگر کی بے صورت نہیں

از رخصت

وقت پیری شباب کی باتیں
ایسی ہیں جیسی خواب کی باتیں

پھر مجھے لے چلا ادھر دیکھو!
دل خانہ خراب کی باتیں -

واعظا چھوڑ ذکر نعمت خلد -
کر شراب و کباب کی باتیں -

حرف آیا جو آبرو پہ مری -
ہیں یہ چشم پر آب کی باتیں

مہ جبیں! یاد ہیں کہ بھول گئے؟
وہ شب ماہتاب کی باتیں -

تجھ کو رسوا کرینگی خوب ایدل
تیری یہ اضطراب کی باتیں -

جاؤ ہوتا ہے اور بھی خفقاں
سن کے ناصح جناب کی باتیں

جام مے لب سے تو لگا اپنے
چھوڑ شرم و حجاب کی باتیں

سُنتے ہیں اسکو چھیڑ چھیڑ کے ہم
کس مزے سے عتاب کی باتیں

دیکھ اے دل نہ چھیڑ قصۂ زلف
کہ یہ ہیں پیچ و تاب کی باتیں

ذکر کیا جوش عشق میں اے ذوق
ہم سے ہوں صبر و تاب کی باتیں

ایک موقع پر دو فرقوں میں اختلاف کا رنگ بگڑا - استاد نے ایک فرقہ کے لوگوں کو حق بجانب

از جائے مے کو ہوا ہے خفقاں

دیکھکر طرف ثانی کو سرگروہوں کو سمجھایا۔ مگر وہ اپنی جمعیت اور کارسازیوں کے گھمنڈ میں تھے۔ نہ سمجھے (قلعہ میں اُن نابکاروں کی کارروائیاں دیکھکر زمانہ کے اہل خرافت کہا کرتے تھے کہ ۱۲ ٹوپی جمع ہوگئی ہے یعنے قلعہ پر قیامت آئی) جب نصیحت کے نوشدار دونے مزاجوں کی اصلاح نہ کی۔ ناچار استاد نے بھی معمولی رفتار سے قدم بڑھایا۔ اور چند جملوں میں جوعطر مطلب تھا۔ بادشاہ سے عرض کیا۔ اثر بھی اسکا اتنا بڑا ہوا کہ حکماً قلم اور زبانیں بند ہوئیں۔ چند روز میں ایسی ہوا چلی کہ ساری ٹوپیاں اُڑ گئیں۔ اُنہی دنوں میں اُستاد نے یہ غزل کہی تھی۔ دیکھو ہمارے بزرگ کسی طلسم کو توڑتے بھی تھے۔ تو اتنے ہی دائرہ میں پھیلتے تھے۔ ایک وہ زمانہ تھا۔ ایک آج ہے۔

لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

ہے جی میں اپنے غرّہ جوہر کو توڑ دوں
آئینۂ خیال مکدر کو توڑ دوں

دنیا سے میں اگر دل مضطر کو توڑ دوں
سارے طلسم وہم مکدر کو توڑ دوں

میں کاٹ دوں پہاڑ کو۔ پتھر کو توڑ دوں
پر کیونکہ غیر سے بت کافر کو توڑ دوں

کیا دَور جام ہو۔ جو کہے سر پہ دورِ چرخ
گر چاک پر پھرے تو میں ساغر کو توڑ دوں

دشتِ جنوں میں میں جو اُٹھایا ذرا قدم
پائے رفیق وہمت رہبر کو توڑ دوں

کیا دشمنی ہے اہل کرم سے۔ کہ بہر چرخ
یہانتک جھکاؤں شاخ ثمردار کو توڑ دوں

ساقی لڑائیوں سے تری جا ہتا ہے جی
باہم لڑا کے شیشہ ساغر کو توڑ دوں

احسان ناخدا کے اُٹھائے مری بلا +
کشتی خدا پہ چھوڑ دوں لنگر کو توڑ دوں

ہر موج بحر عشق کو یہ بل ہے بل بے زور
کہتی ہے دست وپائے شناور کو توڑ دوں

نازک خیالیاں مری توڑیں عدو کا دل
میں وہ بلا ہوں شیشہ سے پتھر کو توڑ دوں

اے آشنا نپوچھ گرانباری گناہ | کشتی میں ہوں تو بوجھ ہے لنگر کو توڑ دوں

پھر اُس مژہ کو یاد کرے دل تو دل میں ذوق
نشتر چبھو کے میں سرِ نشتر کو توڑ دوں +

گذرتی عمر ہے یوں دَور آسمانی میں | کہ جیسے جائے کوئی کشتی دخانی میں
رکا وخوب نہیں طبع کی روانی میں | کہ بو فساد کی آتی ہے بند پانی میں
وفورِ اشک اگر سر بر اوج ہو اپنا | فلک بزنگ گل نیلوفر ہو پانی میں
لگائے تہمت گریہ ہیں دل جلو نکو تمے | یہ ہیں وہی جو لگاتے ہیں آگ پانی میں
کہوں میں اپنی کہانی تو وہ یہ کہتے ہیں | بغیر جھوٹ نہیں اور کچھ کہانی میں
نگاہ کسکی چڑھا دل کہ خوف سے دن رات | گذرتی ہے مجھے دل کی نگاہبانی میں
کہانیاں ہیں حکایات خضر و آب بقا | بر قا کا ذکر ہے کیا اس جہان فانی میں
نہیں خضاب سے مطلب۔ مگر یہ موئے سفید | سیاہ پوش ہوئے ماتم جوانی میں +
وہ سیدھے گھر کو سدھارے اور اُنکے کوچہ میں ہم | پھرے پھنسے کتے ہوئے کوئے بدگمانی میں
مبصّروں سے کہو۔ دیکھیں چیں ابرو ئے یار | کہ جوہر ایسے کہاں تیغ اصفہانی میں
مزا ہے تیغ محبت کے زخم کھانے کا | کرے جو صرفہ نہ قاتل نمک فشانی میں
نہیں جو ضعف سے دم دل سے یہ کہی ہے آہ | کہ بس مدد سے مجھے تکلیف ناتوانی میں
ہمیشہ ہے مجھے سرمایہ بقا میں فنا۔ | حباب دار ہوں میں آبِ زندگانی میں

بجز ثنا علی شاہ کون جانے ذوق
تری زباں کا مزا تری شعر خوانی میں +

تو کہے غنچہ کہ اُس لب پہ دھری خوب نہیں | چپ! کہ منہ چھوٹا سا اور بات بڑی خوب نہیں

سامنے میرے مرے ملتا نہیں ناصح جبتک
مغز کھاتا مرا دو چار گھڑی خوب ہے تو

فتنہ سرکش ہے جبھی تک کہ تری آنکھوں نے
دست مژگاں سے کوئی دھول جڑی خوب نہیں

منہ چڑھے تیغ غم عشق کی کیا منہ ہے ترا
بلہوس تجھ پہ کوئی ضرب پڑی خوب نہیں

خوبرویوں سے بہت آنکھ لڑی پر افسوس
قسمت اے ذوق کہیں اپنی لڑی خوب نہیں

مطلع مرقومہ حاشیہ کو استاد مرحوم نے بیاض خاص میں سے کاٹ دیا تھا۔ میں نے پوچھا فرمایا۔ "سودا کے ایک مطلع سے بہت ملتا ہے۔ لڑکپن میں خدا جانے کہہ گیا تھا"، دیوان سابق میں یہ مطلع چھپ گیا۔ اہل تالیف بیچارے معذور ہو گیا خدا مغفرت کرے۔

سلام کرتے ہیں اُنکو جدھر کو دیکھتے ہیں
اور اُنکو دیکھو ذرا وہ کدھر کو دیکھتے ہیں

وہ دیکھیں بزم میں پہلے کدھر کو دیکھتے ہیں
محبت آج ترے ہم اثر کو دیکھتے ہیں۔

یہ لوگ کیوں مرے عیب و ہنر کو دیکھتے ہیں
انہیں تو دیکھیں جو ہم وہ کدھر کو دیکھتے ہیں

وہ اپنی برش
ہم ان کو دیکھتے ہیں اور جگر کو دیکھتے ہیں

جب اپنے رونے میں سوز جگر کو دیکھتے ہیں
دھوئیں پہ اڑتا ہوا خشک و تر کو دیکھتے ہیں

نہ خیر و شر کو نہ عیب و ہنر کو دیکھتے ہیں
جدھر کو آپ نہوں ہم اودھر کو دیکھتے ہیں

میں چپکا دیکھ رہا ہوں جگر کے داغوں کو
کوچارہ گر انہیں وہ چارہ گر کو دیکھتے ہیں

اُن آہو وں سے کہو کہیں میری آنکھوں کو
جو آب جو میں گل نیلوفر کو دیکھتے ہیں

ہے اُن کی چشم کی گردش پہ گردش عالم
جدھر ہو اُن کی نظر سب اُدھر کو دیکھتے ہیں

گہر کو جوہری صراف زر کو دیکھتے ہیں
بشر کے دیکھنے والے بشر کو دیکھتے ہیں

ہماری وصل کی شب ہے و یا شب محشر
کہ اُٹھکے صبح قیامت سحر کو دیکھتے ہیں

ہوا کے گھوڑے پہ کس برق وش کو دیکھا تھا
کہ طمطراق پہ ہم کرّ و فر کو دیکھتے ہیں

پڑیگا سایہ لف اسپہ بھی ضرور کبھی
کہ پیچ و تاب تمہاری کمر کو دیکھتے ہیں

ہم اُن کے کوٹھے پہ چڑھکر ہیں ڈھونڈتے مرغید
کہ دھر کو چاند ہے اور دھم کدھر کو دیکھتے ہیں

خدا کا بندہ ہو زاہد خدا کو دیکھ ذرا
کہ زر کے بندے زمانہ میں زر کو دیکھتے ہیں

اُدھر شفق میں ہے شام اور ادھر ہمیں دیکھو
ابھی سے دمبدم اُٹھکر سحر کو دیکھتے ہیں

نہ پوچھو شغل اسیری میں ہم غریبوں کا
کبھی قفس کو کبھی بال و پر کو دیکھتے ہیں

وہ دن تو عید کا ہوتا ہے دن ہمارے لئے
تمہارا اُٹھکے جو مُنہ ہم سحر کو دیکھتے ہیں

یہ کسکو دیکھ فلک سے گرا ہے غش کھاکر
پڑا زمیں پہ جو نور قمر کو دیکھتے ہیں

سوال جو ہر آئینہ ہے چشم پُرآب
کہ مُنہ پہ خاک ملے کیوں ہنر کو دیکھتے ہیں

بہار کو ہیں دکھاتے ستارۂ سحری
تمہارے کان میں جب ہم گہر کو دیکھتے ہیں

فنا کی راہ میں پتھر جو بن کے بیٹھے ہیں
انہی کو دیکھکے ہنستے شرر کو دیکھتے ہیں

وہ خاک اڑائینگی بازار عشق میں آکر
کہ پہلے آن کے سودو ضرر کو دیکھتے ہیں

بنا کے چشم کے دنبالہ پر وہ خال سیاہ
سنان ترک نظر پر سپر کو دیکھتے ہیں۔

عرق کے قطرے نہیں دیکھتے ہیں اُس رخ پر
ستارے دھوپ میں ہم دوپہر کو دیکھتے ہیں

اٹھی آگ یہ سینہ میں ہے کہ آفت ہے
عرق کی جا پہ نکلتے شرر کو دیکھتے ہیں

بنا کے آئینہ ہیں دیکھتے جو آئینہ گر
ہنر و را پنے بھی عیب و ہنر کو دیکھتے ہیں

زیادہ سر ہو جو دشمن تو ہم سمجھتے ہیں
تڑپتا خاک پہ مارو دسر کو دیکھتے ہیں

نگیں کو دیکھ لیں چاہیں جو نام عالم میں
کہ سینہ کاوی میں یہاں نامور کو دیکھتے ہیں

خراش ناخن وحشت سے چارہ گر میرے
شکستہ بخیۂ زخم جگر کو دیکھتے ہیں

اُٹھائی آنسوں نے کس پہ آج ہے تسبیح
سفر ہے جانکا جو فال سفر کو دیکھتے ہیں

کسی کی کاوش مژگاں سے برسر مژگاں
ٹپکتا قطرۂ خون جگر کو دیکھتے ہیں

جہانکے آئینہ سے دل کا آئینہ ہے جدا
اس آئینہ میں ہم آئینہ گر کو دیکھتے ہیں

دکھا دو تم لب میگوں پہ خندۂ نمکیں
کہ یہاں تو ساغر مے میں شکر کو دیکھتے ہیں

عیار نقد محبت کا دیکھ سختی پر +
لگا کے ذوق کسوٹی پہ زر کو دیکھتے ہیں

کسی دوست نے فرمایش کی کہ زمین مرقوم الذیل آج کل طرح ہوئی ہے - آپ بھی غزل کہئے - آغاز شباب تھا اور طبیعت میں ذوق و شوق - غزل کہی - اس کا جا بجا چرچا ہوا - یہاں تک کہ اکبر شاہ جنت آرامگاہ اُندنوں بادشاہ تھے - اُنہوں نے فرمایش فرمائی کہ میاں ابراہیم سے کہو - ہمیں خوش آکر وہ غزل سنائیں - یہ ولیعہد یعنے مرزا ابو ظفر کے ملازم خدمت تھے لیکن حضور بھی ان کے کلام کو سنتے تھے اور خوش ہوتے تھے - ایک قصیدہ اُن کی مدح میں کہکر شامل کر دیا -

مے ملا کر ساقیان سامری فن آب میں
کرتے ہیں جادو سے اپنے آگ روشن آب میں

زلف افعی وش کو دھو دے گر وہ پُر فن آب میں
ہوں بجائے موج پیدا مار رہزن آب میں

چشمۂ آئینہ میں کب تر ہوا - پاے نگاہ
اسطرح جاتے ہیں دیکھا! پاک دامن آب میں

پھرتا ہے سیل حوادث سے کوئی مرد کامنہ
شیر سیدھا تیرتا ہے وقت رفتن آب میں

صحبت اہل صفا سے تیرہ دل کب صاف ہوں
زنگ سے آلودہ ہو جاتا ہے آہن آب میں

اب بھی گریہ سے مجھے فرصت نہیں فوارہ وار
گو کہ میں ڈوبا کھڑا ہوں تا بہ گردن آب میں

طائرِ قلزم میں رکھا ہے اُس نے ابرِ مردہ کو
ڈوب مر رو کے تو اے ابرِ بہمن آب میں

دیکھنا آبی دوپٹا منہ پہ اُسکے وقتِ خواب
برجِ آبی میں ہے مہ یا مہرِ روشن آب میں

میں ہوں وہ تفسیدہ دل کہ جائے ایک دریا کو جذب
گر پڑے گر ذرہ میری خاک مدفن آب میں

یوں رہا میں زندگی بھر تشنۂ دیدارِ یار
جیسے تشنگی کا دم ہوتا بہ مردن آب میں

سایۂ سروِ چمن نے کیا ڈرایا ہے مجھے
اژدہا بن بن کے شاخِ رشکِ گلشن آب میں

وعدے پہ آنیکا اُس کے ابر کھلجائے تو آئے
ڈالتا ہوں دمبدم اُٹھ اُٹھکے روغن آب میں

شب جو ہم لکھنے کو بیٹھے آنکھ سے اُمڈے یہ اشک
بہ گیا خط لکھتے لکھتے مشفقِ من آب میں

ذوق تو اس بحر میں ایسے گل مضموں بہا
جا بجا لگ جائے ایک پھولوں کا خرمن آب میں

ہووے تو اے مہرش جب پرتو افگن آب میں
ہو سراپا فلس ماہی ماہِ روشن آب میں

عکسِ زلفِ یار اور آئینۂ رخسارِ یار
کھینچے ہیں شام و سحر تصویرِ سوسن آب میں

تو جو دریا میں لڑا چھینٹے تو نیساں شرم سے
پانی پانی ہو گیا اے شوخ پرفن آب میں

مردمِ دیدہ ہیں اپنے زندہ آبِ اشک سے
مردمِ آبی ہیں انکا ہے نشیمن آب میں

بھول مت علمِ کتابی پر کہ آخر کب تلک
ناؤ کاغذ کی بھے اے طفلِ کودن آب میں

تو لبِ دریا ہنسے آکر جو اے رشکِ بہار
ڈالے بھر بھر کر صبا پھولوں کے دامن آب میں

لے لو اپنے روئے سیمیں پر ذرا آبی نقاب
نیلوفر دکھلا رہا ہے اپنا جوبن آب میں

کیا ہوا کیا سبزہ ہے کیا گل ہے کیا ابرِ بہار
لطف ہے گر ہو وہ فیضِ رب ذوالمن آب میں

مدح کر اس شاہ دریا دل کی اے دل جسکا فیض
لعل و گوہر ہے بہا تا وقتِ گفتن آب میں

شاہ اکبر خسرو غازی کہ آبِ تیغ سے
رکھے حاسد کو ہمیشہ تا بگردن آب میں

پڑھکے بسم اللہ مجریہا و مرسیہا دلا
جوش سنا و پھر ہوا میں مست پا زن آب میں

مطلع روشن لکھا جس سے کہ بحر نظم میں
صوت اختر دُر معنی ہیں روشن آب میں

ڈالے جوں روح القدس تو جبکہ تو سن آب میں
نور حق ہو اہل برہاں پر مبرہن آب میں

اے شہ الیاس رتبت۔ اے شہ خضر احترام
خشک و تر کو ہے سہارا تیرا دامن آب میں

نام حق لیکر جو مارے تیغ راہ حق میں تو
غرق جن و انس عنیاں ہو فوج دشمن آب میں

تو شہ دریا نوال۔ اور دل ترا موج کرم
ہے سخا و سے تیری دست قلمزن آب میں

تیرا نیسان عطا جسدم گہرباری کرے
گوہر تر سے بھریں موجوں کے دامن آب میں

حکم تیرا جستجو چاہے تو گم ہونے نہ پائے
مثل ابراہیم او ہم ایک سوزن آب میں

تیرے حکم شرع سے جب کفر دریا پر دہو
غرق ہو وے تا بہ انشائے برہمن آب میں

ہو ترے سینہ میں جب بحر معانی موج زن
قطرہ سے روشن ہو صد معنے روشن آب میں

ہو ترا فیض سخن گر معنے نطق فصیح
بلبلے مانند بلبل ہوں نوا زن آب میں

بھیجے آگے گر کریں اعدا سر عصیاں بلند
مثل قوم نوح ہو وے سب کا مدفن آب میں

تو صف آرا ہو جو دریا میں تو ایک ایک کرم آب
ہو عدو کے قتل کو سو سو تہمتن آب میں

روے دریا پر بناتے ہیں بہم موج و حباب
بہر سربازان لشکر خود و جوشن آب میں

نور ظلمت ہمدگر دشمن ہیں پر حیراں ہو نہیں
تیری خنجر میں ہے کیوں آتش بہ آہن آب میں

بادپا تیرا ہے یوں آتش قدم بر روے خاک
ہو وے جوں برق درخشاں سایہ افگن آب میں

عکس ابھی دریا میں ہے اور سن سے اڑ جاتا ہے یوں
روح گویا اڑ گئی اور رہ گیا تن آب میں

تیرا فیل کوہ پیکر بسکہ دریا سیر ہے
ڈالے وہ کوہ رواں جب اپنا دامن آب میں

مثل برآے ولیکن سرعت رفتار سے — اوپر اوپر جاے مثل ابر بہمن آب میں
نسر طائر نسر واقع چرخ پر تا ہوں شہا — اور زمیں پر ہووے تا ماہی کلمسکن آب میں
ہو ہوے اشوق میں سر پر سہا اقبال کا — ماہی دولت کا ہو تیرے نشیمن آب میں

طرح مشاعرہ کی غزل ہے جس کاغذ سے میں نے نقل کی ہے معلوم ہوتا ہے کہ مشاعرہ کو چلتے وقت صاف کیا تھا۔ بڑی مشکل سے پڑھا گیا۔ پوری ایک رات کی نشست اسپر صرف ہوئی۔

غمنامہ اپنا صفحہ محشر سے کم نہیں + — ہے شور الغیاث صریر قلم نہیں
وہ دن ہے کونسا کہ ستم پر ستم نہیں — گر یہ ستم ہیں روز تو ایک روز ہم نہیں
مضموں کے پیچ و تاب سے تاب رقم نہیں — ہے زلف یار ہاتھ میں میرے قلم نہیں
بعد از فنا بھی جوش جنوں میرا کم نہیں — کس وقت زلزلہ سر وحشت عدم نہیں
گو اضطراب دل کو عیاں کرتے ہم نہیں — پر جو نگاہ ہے رگ بسمل سے کم نہیں
جوش شگفتگی ہے محبت کا غم نہیں — یہ خوں خراش دل میں تبسم سے کم نہیں
آتش میں آ پڑا تو ہے میری طرح سپند — لیکن نکل بھی جائیگا ثابت قدم نہیں
یہ دل مجھے ڈبو کے رہیگا کہ سینہ میں — وہ کونسا ہے داغ جو گرداب نم نہیں
منظور دل کو کاوش غم کی ہے مشق اگر — بہتر مژہ سے یار کی کوئی قلم نہیں
ہیں آمد بہار سے بد لاے منہ میں خوں — یہ زخم دل تبسم غنچہ سے کم نہیں
ہم کافران عشق کو ہے یہ بڑا عذاب — دوزخ میں آتش آتش سنگ صنم نہیں
بعد از سجود سے کب نہوا سجدہ سر فرو — کب گردن خجالت محراب خم نہیں
مشکل ہے میرے عہد محبت کا ٹوٹنا — اے بیوفا یہ تیری خدا کی قسم نہیں

اہل صفا کا دیکھا نہ دامن کسی نے تر
گوہر ہے اپنی آب میں غرق اور نم نہیں

وحشی کو ترے دشت بھی ہے عرصۂ بہشت
آہو کی شاخ شاخ سے طوبےٰ کے کم نہیں

اللہ رے ضبط دل کہ مری برسر مزار
گیسوئے دود شمع میں بھی پیچ و خم نہیں

اے عہدیار ہے تو زمیں پر کہ اٹھ گیا
ڈھونڈوں کدھر سراغ کہ نقش قدم نہیں

منصور پر نے کا مرے کرتے ہیں حریف
اور مجھ میں مثل بازئ شطرنج دم نہیں

تو نے جو ہاتھ قتل سے کھینچا تو کیا ہوا
رکتی کسی طرح تری تیغ ستم نہیں

ہے میکشوں کے واسطے میخانہ تخت جم
یہاں جام مے ہے سامنے گر جام جم نہیں

چمکا یہ آتش دل پروانہ کا ہے رنگ
اے شمع رو عیاں شفق صبحدم نہیں

ہے لوث حب زر سے یہ دامن ہمارا پاک
گر چھینٹ بھی پڑے تو بحد درم نہیں

گر آب دیدہ شربت کوثر بھی ہے تو کیا
جبتک کہ اس میں چاشنی درد و غم نہیں

حالت ہے اب یہ زار ترے دلفگار کی
ہے چشم زخم منہ پہ کہ جو چشم نم نہیں

ہاتھ آئے کس طرح سے دل گم شدہ کا کھوج
ہے چور وہ کہ جس پہ کسی کا بھرم نہیں

ہاتھوں سے چرخ تفرقہ پرداز کے کبھی
کر سکتے آہ دست تاسف بہم نہیں

سربازِ عشق کے لئے دارالاماں کہاں
محفوظ قطع سے سر شمع حرم نہیں

جاتا ہے آنکھیں بند کئے ذوق تو کہاں
یہ راہ کوئی یار ہے راہ عدم نہیں +

عالم شباب کی غزل ہے۔ یہ بھی بادشاہ کو پسند آگئی تھی۔ (دیکھو صفحہ ۱۲۳) کشش کی مقناطیس بہت لگائی مگر استاد نے بھی نہیں ہی چھوڑی۔ حکیم احسن اللہ خاں طبیب شاہی تھے۔ اور بڑے مقرب تھے۔ انہی کے پاس بادشاہ کی غزلیں جمع ہوا کرتی تھیں

وہی دیوان ظفر ترتیب دیتے تھے اور مرتب کر کے چھپواتے تھے مطبع سلطانی انہی کے اہتمام میں تھا سخن کے جوہر شناش تھے۔ استاد کا کلام بھی شوق سے لکھوا لیتے تھے۔ انہیں یہ غزل بہت پسند تھی۔ حضور کے سامنے انہی کی زبان سے نکل گئی تھی حکیم کلام کی محبت سے استاد سے محبت رکھتے تھے مگر خلیفہ صاحب کے سبب سے کھٹکتے تھے۔ خیال تھا کہ حضور پھر انہیں خدمتیں سپرد نہ کر دیں۔ ان کے سامنے حکیم صاحب کے اعتقاد ضعیف ہو جاتے تھے۔ اسی لئے مرزا توشہ (غالب مرحوم) کو حضور میں پہنچایا تھا۔ حالانکہ استاد نے ترقی تنزل خلیفہ کے کسی معاملہ میں کبھی دخل ہی نہیں دیا۔

ہم سے ظاہر و پنہاں جو اُس عیار تر کے جھگڑے ہیں
دل سے دل کے جھگڑے ہیں نظر سے نظر کے جھگڑے ہیں
جیتے ہی جی کیا ملک فنا میں ساتھ بشر کے جھگڑے ہیں
مر کے اِدھر سے جیکہ چھٹے تو جا کے اُدھر کے جھگڑے ہیں
کیسا مومن کیسا کافر۔ کون ہے صوفی کیسا رند +
سارے بشر ہیں بندے حق کے سارے شر کے جھگڑے ہیں
ایک ایک جو روستم پر اس کے سو سو داغ دل ہیں گواہ
ہم جو اُس سے جھگڑے ہیں حق ثابت کر کے جھگڑے ہیں
غم کہتا ہے دلمیں رہوں میں! جلوہ جانا کہتا ہے میں!
کسکو نکالوں کسکو رکھوں! یہ تو گھر کے جھگڑے ہیں
بحر میں موتی پانی پانی۔ لعل کا دل خوں پتھر میں

دیکھو! لبِ دنداں سے تمہارے لعل و گہر کے جھگڑے ہیں
دوست کے گھر میں دشمن ہو جب سنگ ہمارے سینہ پر
دل کا ذکر رہا کیا باقی۔ پھر تو سر کے جھگڑے ہیں +
حضرت دل کا دیکھنا عالم ہاتھ اٹھائے دنیا سے +
پانو پسارے بیٹھے ہیں اور سر پہ سفر کے جھگڑے ہیں

ذوق مرتب کیونکہ ہو دیواں شکوۂ فرصت کس سے لیں
باندھے گلے میں ہم نے اپنے آپ ظفر کے جھگڑے ہیں

جن دنوں شاہ نصیر مرحوم سے معرکے ہو رہے تھے۔ منشی فیض[1] بارسا کی شاعری کو جوانی کے جنون نے چمکایا۔ لکھنو سے آکر مشاعرہ قایم کیا۔ وہ میرے والد مرحوم کے شاگرد تھے۔ انہی دنوں دلی میں سرکاری مدرسہ جاری ہوا تھا۔ انہوں نے اسے مدرسہ کے سلسلہ میں لے لیا۔ اور انشاے اردو کی ترقی کا جز واعظم قرار دیکر صاحب پرنسپل سے مدد لی۔ مدرسہ اجمیری دروازہ کے باہر تھا۔ رات کے ۹ بجے شہر کے دروازے بند ہو جاتے تھے۔ گڈھ کپتان صاحب سے اجازت لی کہ مشاعرہ کے دن دروازہ ۲ بجے رات تک کھلا رہا کرے۔ غرض مشاعرہ مذکور اس شان و شکوہ سے اُٹھا کہ پھر کوئی ایسا مشاعرہ دلی میں نہیں ہوا۔ شہر کے روسا اور تمام نامی شاعر اور علما موجود ہوتے تھے۔ مگر سب کی نگاہیں شاہ صاحب اور شیخ صاحب کی طرف ہوتی تھیں۔ چنانچہ ایک مشاعرہ میں شاہ صاحب نے غزل پڑھی۔

ہم چھیڑ کر تو توڑتے سارے قفس کی تیلیاں | پر نہیں اے ہم صفیر و اپنے بس کی تیلیاں

[1] مغفور میرے والد مرحوم کے شاگرد تھے۔ پھر ہی کالج سابق میں درس سیاق ہو گئے تھے۔ میں نے بھی اُن سے سیکھا تھا ۱۸۵۱ء میں مرے ۱۲

دوسرے مشاعرے کے لئے یہی طرح ہوگئی۔ اُستاد مرحوم نے دو غزلہ لکھا۔ اس میں کچھ تکرار ہوئی۔ اس پر جوش میں آکر اُستاد نے فرمایا کہ برس دن تک علاوہ غزل طرحی کے ایک غزل اسی زمین میں اَور ہوا کرے۔ دو مشاعروں میں ایسا ہوا۔ تیسرے جلسہ میں انہوں نے غزل پڑھی تو بعض شخصوں نے کچھ کچھ چوٹیں کیں۔ اُستاد مرحوم کے طرفدار سمجھے کہ شاہ صاحب کے اشارہ سے ہوئی ہیں۔ زیادہ تر یہ کہ شاہ جمیل الدین منیر یعنے شاہ صاحب کے صاحبزادہ نے یہ شعر بھی پڑھا۔

گرچہ قندیلِ سخن کو منڈھ لیا تو کیا ہوا	ڈھانچ میں تو ہیں ہی اگلے برس کے تیلیاں

اسپر گفتگو زیادہ ہوئی اور مشاعرہ بند ہوگیا۔ اُستاد کی سب غزلیں اس زمین میں نہ ملیں۔ پہلے مشاعرہ کی غزل بہت خوب تھی۔ دو سو دے ساتھ آگئے ہیں۔ ایک پر کچھ شعر قصیدہ کے بھی ہیں۔ مگر سب پڑھے نہیں جاتے۔ غزل کے شعر لکھتا ہوں۔ ۶۰ برس گذرے اب تک اس مشاعرہ کی باتیں زبان بزبان یادگار چلی آتی ہیں۔

آفتِ جاں دل کو ہیں تن کے قفس کی تیلیاں	ورنہ ہیں یہاں بال و پر تا نفس کی تیلیاں
استخواں ہیں اس تنِ لاغر میں خس کی تیلیاں	تیلیاں بھی وہ کہ جو ستر برس کی تیلیاں
رخصت پرواز گر دیویں قفس کی تیلیاں	جاکے دیکھ آئیں جو کچھ رکھی تھیں خس کی تیلیاں
دل کے شعلوں سے قفس کے پیش و پس کی تیلیاں	یوں جلیں اڑ جائیں جیسے خار و خس کی تیلیاں
گر سرِ بالیں رکھتے ہو خس کی تیلیاں	لیجئے غمگاں کی مجھ بے دسترس کی تیلیاں
گر رگِ گل سے ہوں بلبل کے قفس کی تیلیاں	کانٹے آنکھوں میں چبھوئیں اُسکے خس کی تیلیاں
طائرانِ رنگ گل کا فکر کیا اے باغباں	ہیں یہی رگہائے گل اسکے قفس کی تیلیاں

اے مہندس مرغ ساعت کو اگر کرتا ہے بند
لے ہوا میں اڑ کے آوازِ جرس کی تیلیاں

میں ہوں دیوانہ کسی کے سبزہ رخسار کا
مار و پھولو نکی جگہ تم مجھ کو خس کی تیلیاں

سوزِ غم سے ہیں سلگتے جسم و جانِ ناتواں
کب کا یہ کوڑا تھا یارب کے برس کی تیلیاں

کشتۂ مژگانِ کے گنبد کا ہے مرقد اے صبا
جا لگا اسپرِ عوض زریں کلس کی تیلیاں

طائرِ رنگِ حنا کا شوق اگر ہو اے پری
تیرے ہاتھوں کی لکیریں ہوں قفس کی تیلیاں

پنجۂ مژگاں جو پا روبِ سمندِ ناز ہے
تا پ کب لائیں لکد کوبِ فرس کی تیلیاں ؟

لیچلا دنیا سے دل یا کاسۂ روغن حریص
اسمیں کیوں رکھتا ہے جاروبِ عسس کی تیلیاں

چشمِ گریاں نے اگر کی اس برس برسات خوب
سبز ہو جائینگی سب سیرِ قفس کی تیلیاں

شیخ کی ڈاڑھی تو حاضر ہے لگا دے ساقیا
گر خسِ شیشہ کو ہیں درکار خس کی تیلیاں

ہے دوائی اس شجر کے واسطے تازہ خزاں
پتے پک کر رہ گئیں خالی ثمر کی تیلیاں

مغ مژگاں ہیں کہ رکھتے ہیں ترے شہباز چشم
آشیاں کیواسطے چن چن کے خس کی تیلیاں

ہے پے مرغِ دلِ بلبل پرِ گل کا قفس +
اس سے نازک اور کیا ہونگی قفس کی تیلیاں

گر ہے اے صیادِ ناداں تجکو آرایش کا شوق ق
مت بنا بیتل کی تاروں سے قفس کی تیلیاں

جو ہیں مرغِ تر دماغ اُن کے قفس کے واسطے
چاہئیں سنبل کی چوبیں اور خس کی تیلیاں

اُڑ کے جا پہنچے ہوائے شوق میں تنکے کی طرح
تھیں جو انگیں فاصدانِ زود رس کی تیلیاں

طرزِ نالہ مجھ سے گر سیکھیں جلا دیویں ابھی
صوت قفس بنکے آوازیں جرس کی تیلیاں

شیخ تل شکری جو لائے لعل لب کے سامنے
گل کا دونا تھا مگر شاخِ عدس کی تیلیاں

آگے ان نالوں کے ہیں یوں خار خس رہ تے قریب
جوں ہوں روکش اژدرِ آتش نفس کی تیلیاں

کارواں حیرت کا تھا شب تنکا تنکا دشت میں
رہگئیں بن بن کے آوازیں جرس کی تیلیاں

سلسلہ وابستہ تھا کچھ عالم معنی سے ذوق ورنہ تھیں یہ تیلیاں کب اپنے بس کی تیلیاں	

اس غزل کے ۵ شعر لڑکپن سے یاد تھے۔ ایک دن میں نے پوری غزل مانگی۔ فرمایا۔ عالم شباب تھا۔ ایک مکان ہمسایہ میں بکنے لگا۔ ہم نے لے لیا۔ بعض اشخاص رنجہ تھے۔ اُنھوں نے نالش کر دی۔ مولوی فضل حق عدالت میں شرشتہ دار تھے۔ بڑے با اختیار تھے۔ ہماری مشاعرہ کی شناسائی تھی۔ ضرورت لے گئی۔ کہ مقدمہ کا حال سنا دیں۔ خیال ہوا کہ وہ شعر کی فرمایش کرینگے۔ کچھ اُنہی کے رنگ میں کہنا چاہئے اللہ اللہ وہ زمانہ۔ اُن کی فضیلت فلسفی کا شہرہ۔ اور ہم بھی اندنوں یہی کتابیں دیکھ رہے تھے۔ عجب ولولہ طبیعت میں پیدا ہوا۔ وہ خود بھی شاعر تھے۔ عربی شعر کہا کرتے تھے۔ اُن کا گھرانہ شاعر تھا۔ بلکہ خیرآباد کے بہت لوگ شاعر تھے۔ اردو فارسی سب کہتے تھے۔ اُندنوں بہت لوگ دلی میں آ گئے تھے۔ مولوی فضل حق کا بھی شباب تھا مرزا نوشہ اُن کے بڑے یار تھے۔ غرض جبھی یہ غزل لکھی تھی۔ خدا جانے اب کہاں پڑی ہوگی۔ شکر ہے کہ آزاد کے لئے اللہ نے دو دو تین تین شعر کر کے ۱۹ شعر کر دئے

آج اُن سے مدعی کچھ مدعا کہنے کو ہیں	پر نہیں معلوم کیا کہو نگے کیا کہنے کو ہیں
وصف چشم و وصف لب اس رکا کہنے کو ہیں	آج ہم درس اشارات و شفا کہنے کو ہیں
ہیں دہن غنچوں کے وا کیا جانے کیا کہنے کو ہیں	شاید اُسکو دیکھکر صل علے کہنے کو ہیں
کہدے شبنم سے نہ بھر سیماب گل کے کانمیں	بلبلیں احوال دل کچھ اے صبا کہنے کو ہیں
دیکھے آئینے بہت۔ بن خاک ہیں نا صاف سب	ہیں کہاں اہل صفا اہل صفا کہنے کو ہیں
دمبدم رک رک کے ہے مُنہ سے نکل پڑتی زباں	وصف اسکا کہ چکے خوارے یا کہنے کو ہیں

اب تو رات آخر ہوئی میری طرف دیکھو ذرا
مسجدوں میں لوگ اذاں اے مہ تقا کہنے کو ہیں

میں ترے ہاتھوں کے قرباں واہ کیا ہاتھ ہیں تیرے
سب دہان زخم منہ سے مرحبا کہنے کو ہیں

میرے دل کے آبلے دیکھے تو منہ فق ہو گئے
زرد یوں ہی انہائے کہربا کہنے کو ہیں

دیکھ تو لے پہنچے کس عالم سے کس عالم میں ہیں
نالہائے دل ہمارے نارسا کہنے کو ہیں

گاہ دامنگیر بادو گہ بیاباں گرد خاک
اب تو تیرے عاشقوں کے دست و پا کہنے کو ہیں

وہ جنازہ پر میرے کس وقت آئے۔ دیکھنا
جبکہ اذن عام میرے اقربا کہنے کو ہیں

ہے جہاں مانند مجمر اور ہم مثل سپند
اب چلے جائینگے آئے ایک صدا کہنے کو ہیں

پوچھو قاتل سے کریگا قتل آخر کب تلک
اپنی تاریخ آج ہم پیش از قضا کہنے کو ہیں

میری سودا کا اطبا کر نہیں سکتے علاج
یونہی خبطی خبط و مالیخولیا کہنے کو ہیں

مٹ گئے جو ہر وفا کے اٹھ گئے سب اہل دل
اب وفا ہے نام اور باوفا کہنے کو ہیں

ہے صفائے دل وہی جسمیں عیاں ہو شکل یار
یوں تو آئینوں کے دل بھی باصفا کہنے کو ہیں

کیا تماشا ہے کہ انکے کان میں اٹھا ہے درد
ہم جو آئے درد دل اپنا ذرا کہنے کو ہیں

بے سبب سو فار اُن کے منہ نہیں کھولے ہیں ذوق
آئے ہیں پیک مرگ پیغام قضا کہنے کو ہیں

گر ترا نور نہیں چشم میں کیا ہے اس میں
کہنا فیہ نظر عین خطا ہے اس میں

دل کو کیا دیکھیگا تو چیر کے کیا ہے اس میں
اب تو قطرہ بھی نہیں خونکا رہا ہے اس میں

رسن انداز ہے چاہ ذقن یار میں زلف
نہیں معلوم کہ دل کس کا گرا ہے اس میں

عشق کی تلخی حسرت کے جو لے لے کے مزے
بے مزہ رہتے ہیں ہم کچھ تو مزا ہے اس میں

تو نگیں تو نہ دل کا کہ بڑی کاوش سے
اسم کو میں نے ترے کندہ کیا ہے اس میں

کبھی کرتا ہوں فریاد اور کبھی ضبطِ فغاں
نہیں معلوم وہ خوش اسمیں ہے یا ہے اس میں

خضر ساقی ہو تو میں جام نہ لوں گر جانوں
کہ نہیں جام میں مے آب بقا ہے اس میں

دیکھکے عشق میں جاں دادہ مقیس و فرہاد
اور ابھی دیکھیے کس کس کی قضا ہے اس میں

اُس جفاکیش کے نامہ کو پڑھوں کیا قاصد
جو کہ قسمت کا لکھا تھا سو لکھا ہے اس میں

شیشۂ سبزِ فلک سے نہ طلب کر مئے عیش
مے کہاں اسمیں ہے زہراب بھرا ہے اس میں

جا پڑا پانو پہ قاتل کے تڑپ کر کشتہ
سر دھنے پہ بھی گر مئی وفا ہے اس میں

کیا بگولے کی طرح خاک کا پتلا اے ذوق
اڑتا پھرتا ہے بھری جب سے ہوا ہے اس میں

کرے وحشت بیاں چشم سخنگو اسکو کہتے ہیں
یہ سچ کہتے ہیں سر چڑھ بولے جادو اسکو کہتے ہیں

سوال بوسہ کو ٹالا جواب چین ابرو سے
برات عاشقاں بر شاخ آہو اسکو کہتے ہیں

جگر اور دل کا جتنا حوصلہ تھا مل گیا سارا
نگہ کے تیر کا ہونا ترازو اس کو کہتے ہیں

عدوئے دنیش زن ہر دم ہے میرے درپے ایذا
یہ موذی زہر کی ہے گانٹھ بچھو اسکو کہتے ہیں

گوارا تلخی مے کیوں نہ ہو ہم خستہ جانوں کو
کہ دارو تلخ ہی بہتر ہے دارو اسکو کہتے ہیں

گرہ کھولی ذرا اُس نے جو اپنی زلف مشکیں کی
معطر ہو گیا آفاق خوشبو اسکو کہتے ہیں

جو پوچھے عقل دیوانہ سے بتا کیا نام ہے تیرا
کہوں دیوانۂ چشم پریرو اسکو کہتے ہیں

کبھی شیریں نہ دل سے کوہکن نے کوہ کو کاٹا
محبت یہ نہیں ہے زور بازو اسکو کہتے ہیں

اجل سو بار آئی ذوق پر جب تک نہ وہ آئے
نہ پایا دم نکلنے میرا قابو اس کو کہتے ہیں

عنقا کی طرح خلق سے عزلت گزیں ہوں میں
ہوں اسطرح جہاں میں کہ گویا نہیں ہوں میں

میں نہیں کہ تم ہو کہیں اور کہیں ہوں میں
میں ہوں تمہارا سایہ جہاں تم وہیں ہوں میں

اُس در پہ شوقِ سجدہ سے فرشِ زمیں ہوں میں
مانندِ سایہ سر سے قدم تک جبیں ہوں میں

ہوں طائرِ خیال نہ پر ہیں نہ میرے بال ۔
پر اُڑ کے جا پہنچتا کہیں سے کہیں ہوں میں

سرگشتگی بخت نہ دے مجھکو اتنے پیچ
کچھ چینِ زلف ؟ کچھ شکنِ آستیں ہوں میں ؟

یا رب کوئیں کا تارا ہوں یا آسماں کا ہوں
نام آسماں پہ میرا ہے زیرِ زمیں ہوں میں

قصد جب تیری زیارت کا کبھو کرتے ہیں
چشمِ پُرآب سے آئینے وضو کرتے ہیں

کرتے اظہار ہیں در پردہ عداوت اپنی
کیوں مرے آگے جو تعریفِ عدو کرتے ہیں

دل کا یہ حال ہے پھٹ جائے ہے سوجا سے اَور
اگر ایک جائے سے ہم اسکو رفو کرتے ہیں

توڑیں ایکنالہ سے اس کاسہ گردوں کو مگر
نوش ہم اسمیں کبھی لکا لہو کرتے ہیں

قد و لب کو تمہارے نہیں دیکھا شاید
سرکشی اتنی جو سرو لبِ جو کرتے ہیں ۔

ایک دن حافظ ویران اور میں استاد کے ہاں بیٹھے تھے ۔ اور بعض شعرائے عصر کے ہندی مضمونوں کے باب میں گفتگو کر رہے تھے مثلاً ع

ہے کاٹنے کو دوڑتا عنگ کا

اور ع ۔ میڈھا حلال کرتے ہیں دریائے نیل کا

اُستاد نے سنکر فرمایا کہ ایسے مضامین کو استعارہ و تشبیہ میں اتنا زیادہ زور دینے سے کلام بدمزہ ہو جاتا ہے بعد اس کے غزل مرقوم الذیل کے اشعار سنائے ۔

رکھتا ہے بسکہ جبقۂ دنیا سے ننگ ہوں
پارس بھی ہو تو جانتا مردار سنگ ہوں

لہ کوئیں کا تارا ۔ دیکھو صفحہ (۵۸)

ہوں وہ شگفتہ دل۔ کہ زد و زخم میں تنگ ہوں
آہن تو آگ میں ہوں مگر لالہ رنگ ہوں

ہیں سب سے پہلے میر اُٹھانے کے فکر میں
محفل میں اُنکی مَیں کسی چوسر کا رنگ ہوں

دل بیٹھا محو ضبط ہے اور مجھ کو اضطراب
دل میرا مجھ سے تنگ ہے میں دل سے تنگ ہوں

پروانہ گر نہیں تو نہیں۔ پر ہوں شعلہ دوست
مکھی بھی ہوں تو خال رخِ تفنگ ہوں

جنوں نے کچھ نہ چھوا آخر اپنے جیب و داماں میں
نفس یکتا ہے سینہ میں سمجھو یا گریباں میں

کہاں ڈھونڈھے کوئی دل کو ہجوم داغ سوزانمیں
ملے کھوج ایک پروانہ کا کیا گنج چراغاں میں

نہ بھولے گی کبھی ہمدم شکایت تشنہ کامی کی
رہے آب اُسکے جبتک تیغ میں خنجر میں پکانیں

تمہارے تیر ہیں شاداب کرتے دل کے زخموں کو
ہمیشہ آب پیکاں سے ہے فیضم اس گلستاں میں

جو لذت آشنائے مرگ ہوتا خضر تو وہ بھی
نہ پیتا آب حیواں ڈوب مرتا آب حیواں میں

مرے نالے کہیں اس گنبدِ بے در سے اوپر ہیں
ہوا کیوں باندھتے بادل یہیں اور پر سے اوپر ہیں

گذر جاتے ہمارے نالے اُنکے سر سے اوپر ہیں
وہاں سنتے نہیں دیتے اُڑا اوپر سے اوپر ہیں

عجب عالم ہے اب دل کا کہ اُن کے ایک اشارہ پر
کھنچ جاتے ہمارے دل میں سو نشتر سے اوپر ہیں

پسِ دیوارِ گلشن سم پڑے ہیں ناتوانی سے
ابھی طاقت کرے یاری تو اڑ کر فرسے اوپر ہیں

تم دغا غضب کرتے ہو بھی کم ایسے شخص ہیں
اور ہم تمہیں پہ مرتے ہیں ہم ایسے شخص ہیں

صاحب دلوں نے کعبہ دل پر کیا مقام
کب کرتے قصد دیر و حرم ایسے شخص ہیں

دیوانے تیرے دشت میں رکھینگے جب قدم
مجنوں بھی لیگا آکے قدم ایسے شخص ہیں

دیں کیا ہے بلکہ دیجئے ایمان بھی انہیں | زاہد یہ بت خدا کی قسم ایسے شخص ہیں

چاروں شعر مرقوم الذیل لڑکپن کا کلام ہیں۔ وہ ایسا زمانہ تھا کہ بتاں کا لفظ بے اضافت محاورہ میں عام تھا۔ میر و سودا کے دیکھنے والے موجود تھے دلی کی زبان یہی تھی۔ اُسی محاورہ میں انہوں نے شعر کہا بگی کی سواری اور فرنگی زاد کا مضمون اس وقت نیا معلوم ہوتا تھا۔ فرمایا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ کوئی فرنگی دلی میں نظر آتا تو ایک عجیب صنعت اچھی سمجھ کر ہم باہم دکھایا کرتے تھے۔ کہ دیکھو وہ فرنگی جاتا ہے۔ زمانہ کا مزاج اور اسکی طبیعت کا ایک عالم ہے کہ بدلتا چلا جاتا ہے۔ جو لفظ آج سماعت کو ناگوار ہے۔ اسوقت خوشگوار تھا۔ ورنہ آسان ہے۔ کہدیتے۔ مصرع

ہیں صنم محو خود نمائی میں +

ہیں بتاں محو خود نمائی میں | بیر ہے پر خودی خدائی میں
ہو کے ایک بوسہ پر ترش ابرو | بات کو ڈالنا کھٹائی میں ؟
نہیں بگی میں وہ فرنگی زاد | ماہ ہے منزل ہوائی میں

ذوق سے ایک رند شاہد باز
اس کو کیا دخل پارسائی میں

یہاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں | وہاں ایک خامشی تری سب کے جواب میں
خط دیکھکر وہ آئے بہت پیچ و تاب میں | کیا جانے لکھدیا انہیں کیا اضطراب میں

بے بادہ غورگی میں ہوا ذوق جوں مویز
کی توبہ بے وقوف نے ناحق شباب میں

نے رنگ کفک ہوں۔ نہ ترا فندق پا ہوں | میں کچھ نہیں لیکن ترے قدموں سے لگا ہوں

مجنوں نے مجھے سمجھا چراغِ رہ مقصود
میں ناقۂ لیلیٰ کا سراغِ کفِ پا ہوں

وہ مہر تو میں تاب۔ وہ گوہر ہے۔ تو میں آب
مجھ سے نہ جدا وہ ہے نہ میں اُس سے جدا ہوں

کھائے پیہم یہ تیرے ناوکِ مژگاں دل میں
اتنے مو۔ تن پہ نہیں جتنے ہیں پیکاں دل میں

گھر ہی کر بیٹھا ہمارے غم ہجراں دل میں
ہمنے جانا تھا کوئی دن ہے یہ مہماں دل میں

خانقاہ میں بھی وہی ہے۔ جو خرابات میں ہے
فرق پر یہ ہے۔ یہاں منہ پہ ہے اور وہاں دل میں

تیرے آفت زدہ جن دشتوں میں اُڑ جاتے ہیں
صبر و طاقت کے وہاں پانو اُکھڑ جاتے ہیں

اتنے بگڑے ہیں وہ مجھ سے کہ اگر نام اُن کا
خط میں لکھتا ہوں تو سب حرف بگڑ جاتے ہیں

کیوں نہ لڑوائیں اُنہیں غیر کہ کرتے ہیں یہی
ہمنشیں جن کے نصیبے کہیں لڑ جاتے ہیں

مر گیا ہوں بسکہ وصل سیمتن کے فکر میں
چادرِ مہتاب ہے میرے کفن کے فکر میں

ہائے گل سب آشنا تیرے مریض عشق کے
ق تھے علاجِ ضعفِ دل۔ او ضعفِ تن کے فکر میں

آج گھبرائے ہوئے پھرتے ہیں باچشم پُرآب
گاہ تدبیر لحد میں۔ گہ کفن کے فکر میں

اب کے دل لے لوں تو پھر اُس بتِ قاتل کو نہ دوں
جانوں مال دوں ایمان دوں پر دل کو نہ دوں

چار ٹکڑے کر دل کے۔ کہ نہیں ہو سکتا
لب کو دوں رخ کو نہ دوں زلف کو دوں تل کو نہ دوں

نہ ڈال آبلے اے گرمیِ فغاں منہ میں
کہ چپکا بیٹھ رہوں بھر کے گھنگنیاں منہ میں

ہمارا پی کے لہو۔ تیرے تیر کا سوفار
یہ چپ ہوا ہے کہ گویا نہیں زبان منہ میں

اسیر رنج و غم میں ہوں مریض جاں بلب میں ہوں
اور اس پر تبلک جیتا ہوں میں کوئی عجب میں ہوں
جو مانگوں موت درد ہجر سے۔ مجکو نہیں میسر
کہ نام عشق لوں اور اسقدر راحت طلب میں ہوں

ہر بن مو سے نکلتے ہیں شرار آتشیں
بن گیا ہوں میں سراپا ایک انبار آتشیں
واہ رے سوز جگر۔ اٹھتے ہیں میری خاک سے
دود و گلخن کی طرح اب تک غبار آتشیں

سینہ و دل پہ مرے زخم جگر ہنستے ہیں
ہنستے دو چارہ گر و ہنستے ہی گھر بستے ہیں
ہوتے پابند علایق نہیں وارستے ہیں
نکہت گل کے نکل جانے کو سوستے ہیں

میں ہوں وہ جگر خوں کہ مسامات بدن سے
جوں اشک عرق بھی شفقی رنگ نکالوں
ہے جی میں کہ غنچہ کو کروں تنگ چمن میں
پھر یار کا ذکر دہن تنگ نکالوں

دنبالہ سے سرمہ کے دھواں ہیں تری آنکھیں
کاٹیں نہ کچھ سیف زباں ہیں تری آنکھیں

مرنے اوس سے چپ ہیں مرغ خوش الحان زمانہ میں
صدا طوطی کی سنتا کون ہے نقار خانہ میں

ہوا ہے اور نہ ہوگا کوئی پیدا خدائی میں
وفا میں کوئی مجھ سا اور تم سا بے وفائی میں

نہ کبھی پابند نہیں ہوتے جو وارستے ہیں

اسیری عشق کو منظور تھی میری لڑکپن میں
بہانہ کرکے منت کا پنہایا طوق گردن میں

ہیں وہ دیوانے کہ جنکو بیڑیاں درکار ہیں
ہم اسیرِ زلف ہیں کافی ہمیں دو تار ہیں

کمندیں اور بھی یوں تو کمند انداز رکھتے ہیں
تیری زلفوں کے خم کچھ اور ہی انداز رکھتے ہیں

کیا صوفی و کیا میکش قائل مرے دونو ہیں
پر مذہب و مشرب سے غافل مرے دونو ہیں

مر گئے پر بھی تغافل ہی رہا آنے میں
بے وفا پوچھے ہے کیا دیر ہے لیجانے میں

جسجگہ بیٹھے ہیں با دیدۂ نم اُٹھے ہیں
آج کس شخص کا منہ دیکھکے ہم اُٹھے ہیں

کہتے تھے آنے کو خاطر سے ہماری پرسوں
ہوئے برسوں۔ نہوئی پر وہ تمہاری پرسوں

یہ طوق اسواسطے چھوٹا ہوا قمری کی گردن میں
کہ تھا بلبل کی گردن کا پڑا قمری کی گردن میں

رخصت جو ہوکے ہم سے جاتے وہ اپنے گھر میں
گھبرا کے پہنچے وہاں ہم اُن سے پیشتر ہیں

زاہد گمراہ کے میں کس طرح ہمراہ ہوں +
وہ کہے اللہ ہو۔ اور میں کہوں اللہ ہوا

شعر مرقوم الذیل ایک مسدس کا ترجیع بند ہے کہ جناب سید الشہدا کے مرثیہ میں لکھا تھا۔ کئی بند اس کے بندہ آزاد کو یاد ہیں۔ اپنی جگہ پر وہ بھی درج ہونگے۔

کرتے اپنے سر کو جو نوک سناں پر تاج ہیں	عشق میں وہ کرتے حاصل رتبۂ معراج ہیں
کٹا کر اپنا سر نوک سناں پر تاج کرتے ہیں	حصول اسطرح عاشق رتبۂ معراج کرتے ہیں
کہتی ہے ماہی بریاں کہ دبیرانِ قضا	داغ دیتے ہیں اُسے جسکو درم دیتے ہیں
آپ آتا ہے عیادت کو نہ تو آتی ہے	یاد میں تیری اجل سے بھی فراموش ہو نہیں
سمجھو سہل تم خفقاں کو حکیم جی۔	حضرت اسے بھی جانئے ہمزادۂ جنوں

واؤ

شاہ نصیر مرحوم جب تیسری دفعہ دکن سے پھر کر آئے تو ایک مشاعرہ قایم ہوا۔ اس میں یہی طرح تھی۔ استاد نے یہ دو غزلہ پڑھا تھا جوانی کا عالم تھا۔ اور شاعری بھی جوان تھی۔ قافیہ پیمائی سے دق ہو کر مقطع دوم میں آسانی طرح کا اظہار کیا ہے جس شعر پر ۲ ہے اس میں شاہ نصیر مرحوم کی برکت اور پیرانہ سالی کا اشارہ ہے۔ اور بعض اشخاص بھی اس مشاعرہ میں شامل تھے جو دلوں میں خلش رکھتے تھے کہیں کہیں ان کی طرف بھی اشارے ہیں۔ ہر ایک کی شرح طولانی ہے۔ اور فائدہ

کچھ نہیں قلم انداز کرتا ہوں - بر سر معرکہ واقفانِ حال موجود تھے انہوں نے مزہ

دانہ خرمن ہے ہمیں - قطرہ ہے دریا ہمکو — آئے ہے جز میں نظر کل کا تماشا ہم
اس بلندی پہ دیا عشق نے پہنچا ہم کو — کہ فلک آہ یا نظر خال سے چھوتا ہم کو
ہم وہ مجنوں ہیں کہ دل اپنا ہے صحرا ہم کو — اور جوں خیمۂ لیلی ہے سویدا ہم کو
اس نے خط جو قلم سر سے لکھا ہم کو — لکھا ایسا ئے خموشی ہے گویا ہم کو
رکھ مکدر نہ بس اے چرخ تو اتنا ہم کو — ہم نے جانا کہ کیا خاک سے پیدا ہم کو
شوق مستی میں ہے گلگشت چمن کا ہم کو — چاہیے جائے عصا گردن مینا ہم کو
ہو ویگا کشتی طوفان زدہ تابوت اپنا — آگیا اپنے اگر مرنے پہ رونا ہم کو
بستگی دل کو ہے کیوں اس گرہ زلف کے ساتھ — کیا کہیں کچھ نہیں کھلتا یہ معما ہم کو
ہم وہ مجنوں ہیں کہ گرد رم آہو کی طرح — بھاگے ہے دور ہی سے دیکھکے صحرا ہم کو
کس سے تدبیر درستی ہو ہماری جون زلف — کہ شکستوں سے بنایا ہے سراپا ہم کو
جا بجا نام تو جوں نقش قدم چھوڑ گیا — خاک گم ہو کے گیا ڈھونڈنے عنقا ہم کو
اور ہمدرد کہاں - ہو نہو اے حضرت دل — درد اب تم کو ہمارا ہو تمہارا ہم کو
پھینک کر شیشۂ دل ہاتھ سے کہتا ہے وہ مست — کیا بنانا تھا ہتھیلی کا پھپولا ہم کو
اثر کا [illegible] اپنی پیدا — نقش سجدہ کا ہے پیشانی پہ ٹیکا ہم کو
نخ [illegible] میں ملا - — کثرت زخم سے ایک خلعت زیبا ہم کو
ں میں اسپر — غم دوری سے کیا تنگ ہے کیا کیا ہم کو
ٹھیرے کوئی دم — ہاں مگر ہو ترے آنیکا بھروسا ہم کو
شتی عمر — ہر نفس باد مخالف کا ہے جھوکا ہم کو

ری ضعف کہاں مانع شوق — تیری جانب پر پرواز میں اعضا ہم کو
م ہے جس کی طرف جوں کل بازی اُسنے — پاس آنے نہ دیا دور ہی پھینکا ہم کو
رشک تھا اپنے نوشتہ پہ کہ اُس نو خط نے — خط لکھا غیر کو اور بھول کے بھیجا ہم کو
ہر قدم پانوں میں رکھتے ہیں خار سر دشت — اے جنوں تو نے تو کانٹوں میں گھسیٹا ہم کو
کرتے جوں کوہ نہیں ہم تو سخن میں سبقت — پر وہ کچھ ہم سے سنے گا جو کہیگا ہم کو
اپنا ہے کعبہ مقصود فقط گو ہر دل — طوف گرداب صفت چاہیے اپنا ہم کو
لگ گئی آنکھ جو سودے میں تری لفو کی — شب سیاہی نے کئی بار دبایا ہم کو
حرف تلخ اُس لب شیریں سے ہر ایک بات پہ آہ — ناصحا سنتے ہیں ہم کچھ تو ہے میٹھا ہم کو
خاک سے کیونکہ ہماری گل رعنا نہ اُگے — کہ کسی گل کی دو رنگی نے ہے مارا ہم کو
ایک دم عمر طبیعی ہے یہاں مثل حباب — فکر امروز ہے نے ہے غم فردا ہم کو
جتنے عاشق ہیں بہم - ایکا ہے ایک عزیز — شمع سے چاہیے ہے خون کا دعوے ہم کو
کیا ستم ہے کہ پے قطع رہ عشق فلک — آرہ سان دیتا ہے دنداں عوض پا ہم کو
دلمیں تھے قطرۂ خوں چند سو مانند انار — نہ ہوے وہ بھی جب الفت نے نچوڑا ہم کو
مل گئیں خاک میں جو صورتیں ہے انکا خیال — کیوں نہ فانوس خیالی ہو بگولا ہم کو
ہم وہ ہیں وحشی لا غر کہ چھپا لیتی ہے — زیر دامن نگہ آہو کو

ہم نہ کہتے تھے کہ ذوق اسکی تو زلفور
اب وہ برہم ہے تو ہے تجھکو قلق

آسماں اور وہ انسان بنا تا ہم کو — خاک میں تھا
فرج کیوں کرتے ہی فتراک سے باندھا ہم کو — چھوٹ ہوتے د

دل شکستہ مگر اُس مہ نے سمجھا ہم کو
خط بھی جو خط شکستہ ہی سے لکھا ہم کو

باعثِ رشک ہوا عشق ہمارا ہم کو
تجھ پہ بن دیکھے ہے غش جس نے کہ دیکھا ہم کو

کر دیا گریہ نے آخر سبک ایسا ہم کو
لگ گئے اشک بہا جوں کفِ دریا ہم کو

اسپہ مرتے ہیں کہ کیوں غیر کو تو نے مارا
وہ نصیب اسکو ہوئی تھی جو تمنا ہم کو

ہے ہی جنبش لبہائے جراحت پسِ قتل
کس لبِ تیغ کے بوسہ کا ہے لپکا ہم کو

ہم وہ ہیں گرمیِ راہِ فاجوں خورشید
سایہ تک بھاگ گیا چھوڑ کے تنہا ہم کو

ٹپکا مژگاں سے لہو ہو کے جگر آخر کار
ایک مدت سے اسی ٹپکے کا ڈر تھا ہم کو

خالِ سرمہ کا تمہیں چاہیئے زیبائش کو
اختر سوختہ ہے اپنا ہی زیبا ہم کو

یہ تو یوں مضطرب اور سینہ میں لاکھوں روزن
دل کا رہنا نظر آتا نہیں اصلا ہم کو

خطِ توام سے لکھو گور پہ تاریخ وفات
کہ رہی وصل کی تا مرگ تمنا ہم کو

کون غلطیدہ تھا خاکِ سرِ کو پر تیری -
خواب شب بستر مخمل پہ نہ آیا ہم کو

جسکی آواز سے ہوں روٹھنے سو ہاتھ کے کھڑے
وہ محبت نے دیا سلسلۂ پا ہم کو

ایک جلاوت ہے عداوت میں بھی اس ظالم کے
کہ دیا زہر بھی گر اُس نے تو میٹھا ہم کو

دیکھا آخر نہ کہ پھوٹے کیطرح پھوٹ بہے
ہم بھرے بیٹھے تھے کیوں آپنے چھیڑا ہم کو

ٹپکے ہے جائے عرق ہر بنِ مو سے پیکاں -
یہ ہدف کس نے کیا تیرِ بلا کا ہم کو

ہم سفر ہو نہ سکا کوئی بھی اپنا - لیکن
جادہ پہنچانے گیا تا لبِ دریا ہم کو

ہم وہ ہیں ننگ کہ اس عالمِ پیری میں بھی ہے
اُنس میخانہ سے جوں پنبۂ مینا ہم کو

سنگدل تین دن اک گور میں بھی بھاری ہیں
ہے سویم میں جو تے آنیکا دھڑکا ہم کو

خوبی اسی ہے یہ نہ کہ مرتے ہیں ہم بھی تم پر
مار ہی ڈالے گا بس رشک ہمارا ہم کو

پھرتے ہی آنکھ کے پھیرنے گلے پر خنجر
ہو چکا آپ کا معلوم ہے ایما ہم کو

گرمی تپ سے ہوا سوزِ دروں جو افشا
آگیا مارے خجالت کے پسینا ہم کو

حسرتِ خواریِ وحشت کہ گریبان کا تار
ہو گیا ضعف سے تارِ رگِ خارا ہم کو

کھانے پینے کی قسم کھائی ہے تجھ بن ہم نے
ورنہ ہے زہر تو ہر طرح گوارا ہم کو

نہ اٹھیں شورِ قیامت سے بھی وہ مست ہیں ہم
کیے جب تک کہ نہ قم قم لبِ مینا ہم کو

ہم تبرک ہیں لبِ کرکے زیارت مجنوں
سر پہ پھرتا ہے لئے آبلۂ پا ہم کو

وصل کا اسکے تصور جو بندھا رہتا ہے
تو مزے ہجر میں بھی آتے ہیں کیا کیا ہم کو

واہ قسام ازل صدقہ ہم اس قسمت کے
جامِ عشرت اُسے اور داغ تمنا ہم کو

دل میں نشتر نگہِ یار کا آ ہی کھٹکا
وہی پیش آیا جو مدت سے تھا کھٹکا ہم کو

کشتہ ہی ہوتا ہے اکسیر کہ مثلِ سیماب
کچھ کشندہ ہے نہیں جان کا دعوے ہم کو

رہی ہر طرح سے صیدِ کبوتر کی طرح ق
ہاتھ سے اُس بتِ بیدرد کے ایذا ہم کو

صید ہی میں نہ فقط فوج کا کچھ قصد رہا
صلح بھی ٹھیری تو پھڑکا ہی کے چھوڑا ہم کو

ذوق بازیگہِ طفلاں ہے سراسر یہ میں
ساتھ لڑکوں کے پڑا کھیلنا گویا ہم کو

رندِ خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو
تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

ناخن خدا نہ دے تجھے اے پنجۂ جنوں
ورنہ تمام عقل کے ناخنے اُدھیڑ تو

اُلفت کا گر ہے نخل تو سرسبز ہوئیگا
سو بار جڑ سے پھینکدے اسکو اُکھیڑ تو

عمرِ رواں کا تو سن چالاک اس لئے
تجھکو دیا کہ جلد کرے یہاں سے اٹیر تو

اے زاہد دو رنگ نہ پیرِ آپ کو بنا
مانندِ صبح کاذب ابھی ہے اُدھیڑ تو

اس صید مضطرب کو تامل سے ذبح کر
دامان و آستین نہ لہو میں لتھیڑ تو

جو ہو سکی بھیڑ اپنے شر و شور سے جگائے
دروازہ گھر کا اُس سگ دنیا سے بھیڑ تو

چھٹنا ہے کوئی مر کے گرفتارِ دامِ زلف
تربت پہ اُس کی جال کا پائیگا پیڑ تو

یہ تنگنائے دہر نہیں منزلِ فراغ
غافل نہ پانو حرص کے پھیلا سکیڑ تو

آوارگی سے کوئے محبت کے ہاتھ اُٹھا
اے ذوق یہ اُٹھا نسکیگا کھکھیڑ تو

موت ہی سے کچھ علاج دردِ فرقت ہو تو ہو
غسلِ میت ہی ہمارا غسلِ صحت ہو تو ہو

بعد مردن ہی ترے زخمی کو راحت ہو تو ہو
یہ بھلا کہاں راحت جراحت پر جراحت ہو تو ہو

ہو تو ہو آباد کیونکر یہ خرابِ آباد دل
عشقِ غارت گر اگر دنیا سے غارت ہو تو ہو

کہتے ہیں شورِ قیامت جسکو وہ اے چشمِ یار
تیرے مستوں کی صفیر خوابِ غفلت ہو تو ہو

آگ میں جلتا ہے پروانہ سا کرم ضعیف
آدمی سے کیا نہو۔ لیکن محبت ہو تو ہو

انتظارِ یار میں جو چشم ہو جائے سفید
مردمک اُس میں کہاں ہو داغِ حسرت ہو تو ہو

دستِ ہمت سے ہے بالا آدمی کا مرتبہ
پستِ ہمت یہ نہو وے پست قامت ہو تو ہو

تلخ کامی ہی میں گذری زندگانی عمر بھر
جانِ شیریں کے دئیے سے کچھ حلاوت ہو تو ہو

اب زباں پر بھی نہیں آتا کہیں الفت کا نام
اگلے مکتوبوں میں کچھ اُس کی کتابت ہو تو ہو

رات ایک پگڑی ہوئی تھی میکدہ میں رہن مے
ذوق وہ تیری ہی دستار فضیلت ہو تو ہو

غزل مرقوم الذیل اور اُس کے بعد کی غزل ابتدائی مشق کی تحریریں ہیں جبان میں سے پہلی غزل لکھی اور دوستوں کو سنائی تو خاص و عام کے کانوں میں نئے وزن کی

از مرتبہ گلزار نسیم و انیس

از مرتبہ ہے

آواز گئی۔ سب خوش ہوئے۔ اور تعریفوں نے جوانی کا دل بڑھایا فرماتے تھے کہ ابتدائی عمر طبیعت کی اُمنگ دل باغ باغ تھا کہ آج ہم نے وہ غزل لکھی جواب تک کسی نے نہ لکھی تھی۔ اللہ تیرا شکر کہ تو نے یہ نعمت دی۔ ساتھ ہی دوسری غزل اَور بحر میں لکھی۔ زمانہ کے ناموروں کو پہلی تعریف اور شہرت بھی خوش نہ آتی تھی۔ دوسری غزل پر ناخوشی پھوٹ بہی۔ اور کہا کہ اس بحر میں پہلے کسی نے غزل نہیں لکھی۔ یہ جائز نہیں۔

آغاز عمر۔ ابتدائے مشق۔ کوئی تقویت دینے والا ساتھ نہیں۔ گھبرا گئے۔ مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب اندنوں زندہ تھے۔ اُن سے جا کر حال بیان کیا۔ اُنہوں نے فرمایا کہ معترض بے خبر ہیں۔ فارسی میں مرزا بیدل نے اکثر غزلیں نئی بحروں میں لکھی ہیں۔ اور خوش آیندہ بحر کا نکالنا حسن طبع ہے نہ کہ عیب۔ استاد نے کلیات بیدل دیکھا تو بہت غزلیں نئی نئی بحروں میں نکلیں۔ اُنہیں دیکھکر دل قوی ہوا۔

وہ زمانہ کچھ اَور تھا۔ اُس وقت کی باتیں نئی روشنی والوں کو عجیب معلوم ہوتی ہیں شاہ نصیر مرحوم سے اصلاح بند تھی۔ مگر آمد و رفت اسی آداب و تعظیم کے ساتھ جاری تھی جو کہ اہل سعادت کی عادت ہے۔ اور وہ بھی شفقت بزرگانہ کے ساتھ پیش آتے تھے۔ چنانچہ بموجب معمول کے ایک دن ان کی خدمت میں گئے اور سب حالات سنا کر دو نو غزلیں سنائیں۔ اُنہوں نے بھی کہا کہ خوب غزلیں لکھیں بلکہ یہ بھی کہا کہ دوسری غزل بہت خوب ہے اسے مشاعرہ میں پڑھنا۔

اُستاد مشاعرہ میں گئے تو تعمیل فرمایش کا خیال کر کے اُس غزل کو بھی لے گئے

اور غزل طرح کے بعد شاہ صاحب مرحوم سے کہا کہ اجازت ہو فرمایش کی تعمیل کریں۔ انہوں نے فرمایا۔ ہاں بھئی سناؤ۔ جگہ تو یہی ہے۔ اب کچھ تو ابتدائی مشق۔ کچھ بچرنٹی۔ غرض اتفاق یہ کہ غزلِ دوم کے مطلع میں مصرع دوم پر پھر کا کا لفظ نہ تھا۔ جب اُستاد نے مطلع پڑھا۔ تو شاہ صاحب نے اُس کی تعریف معمول سے کچھ زیادہ کی اور کہا کہ بھئی! اِس مطلع کو پھر پڑھنا۔ استاد مرحوم رکے کہ یہ بات کیا ہے؟ ساتھ ہی خدا نے آگاہ کیا۔ اور لفظ بھی دیدیا۔ یعنے پہلے کہا تھا۔ ع۔ زلف بنے وہ دستِ موئے ❊ اب پڑھا۔ ع

	پھر زلف بنے وہ دستِ موئے جس میں اخگر آتش ہو

شاہ مرحوم خوش ہو گئے اور یہ تمیم ایسی بالغہ ہوئی کہ لوگوں کو خیال ہوا کہ نوجوان کی شوخیٔ طبع تھی۔ عمداً پہلے پھر کا لفظ نہ سنایا تھا۔ یہاں آپ ہی چوٹ کھائی۔ آپ ہی اس کا توڑ کیا۔

غزلِ اوّل

تمنا نہیں ہے کہ امدادِ دل کو تپش کا صلہ ہو کہ مژدہ قلق ہو	
یہی حق ہے قاتل اگر حق دلا دے یہ بسمل ترے پانو پر جاں بحق ہو	
جو مئے نوش وہ شوخ رشکِ قمر ہو۔ تو سرخی نہ کیوں اُسکے رخسار پر ہو	
غروبِ آفتابِ درخشاں اگر ہو۔ تو کس وجہ پیدا نہ رنگِ شفق ہو	
کتابِ محبت میں اے حضرتِ دل بتاؤ کہ تم لیتے کتنا سبق ہو	
کہ جب آخر تم کو دیکھا تو وہ ہی۔ لئے دستِ افسوس کے دو ورق ہو	
کرو دو نو آنکھوں کے طبقے یہ روشن۔ کہ ہو جاؤ رشکِ مہ چار دہ تم	

سُنا ہے کہ تم نور سے اپنے کرتے منور یہ یک جلوہ چودہ طبق ہو
یہ کشتوں کا اُس مانگ کے اک پتا ہے کہ اُن تیرہ بختوں کی تربت پہ کوئی
اگر سنگ موسے کا تعویذ رکھدے تو رکھتے ہی بس درمیاں سے دو شق ہو
مری زندگی تھی ابھی اے ستمگر۔ سیجائی جو کر گئی تیری ٹھوکر
کہ ٹھکرایا تو نے تو یہ تھا سمجھ کر۔ نکلجائے جاں کچھ جو باقی رمق ہو
اگر رشک گلشن نہ ہو مجھ سے باہم۔ تو گلشن میں ہووے یہ وحشت کا عالم
چٹکنا ہو غنچوں کا آواز ضیغم۔ چمن مجھکو ایک وادیٔ لق و دق ہو
اگر زخم سینہ سے پھاہا اُٹھاؤں۔ تو خورشید محشر کو میں تپ چڑھاؤں
اگر پنبۂ داغ دل کو دکھاؤں۔ تو صبح قیامت کا منہ دم میں فق ہو
یہ بحر و قوافی غزل کی بدلکر رقم ایک غزل کر کہ اے ذوق جسمیں
نہو لفظ مغلق نہ تعقید مطلق۔ جو فی الجملہ کچھ ہو تو مضموں ادق ہو

غزلِ دوم

جس ہاتھ میں خاتم لعل کی ہے۔ گر اُس میں زلفِ سرکش ہو ✤
پھر زلف بنے وہ دستِ موسے۔ جس میں اگر آتش ہو
اے قاتل حلق بریدہ سے۔ ایک شعلہ دل گر سرکش ہو
تو روشن حلقہ جیب کا میری۔ مثل تنورِ آتش ہو
ہو تیرا سیہ روز صبح ہجراں۔ رخصت مجھ سے وہ مہ وش ہو
کیوں! کھینچوں آہ کہ خور بھی نہاں زیرِ دودِ آتش ہو
لبریز شرابِ ناز دکھا تو ساغرِ چشم کافر کو ✤

آزاد پاک ملوث ہو ۔ یا صوفی دلکش میکش ہو

تم وہ وہ زخم دل پر میرے کرتے ہو دکھلانے کو

پر بُرش تیغ ناز سے اپنے دل میں کرتے عش عش ہو

دل نخل میں قد کے جوں ذکریا چھپکر چشم کافر سے

اب آرہ جنبش ابرو سے ۔ کیونکر نہ بزیر کشاکش ہو

لبیک و اذاں ۔ ناقوس و جرس ۔ یا قلقل مے یا نالۂ نے

دل کھینچنے کو لے ہم نفسو ! ۔ کوئی تو نوا سے دلکش ہو

بن تیرے گھر کی آرایش ۔ جب دشمن جاں ہو عاشق کی

محراب طاق کماں بن جاے ۔ دستۂ نرگس ترکش ہو

مانند نمکداں چرخ پہ انجم حق نے بنائے اپنے لئے +

تا ہر لب زخم حسرت میرا ہجر کی رات نمک چش ہو +

گر کلک آہ کو گردش دوں تو دودۂ شمع دل سے مرے

طاؤس فلک کا سینہ ابھی ۔ جوں سینۂ باز منقش ہو

جب ضعف سے مجھکو غش آیا تو طنز سے وہ کیا کہتا ہے ۔

بس غش نہ کرو ہم جان گئے تم مرنے پر از حد غش ہو

کیا خون کے دریا جذب کئے ہیں خاک کوچہ قاتل نے ۔

مدفن کو بھی اُس کے ستمکش کے ایسی ہی زمین دلکش ہو

بس چھوڑ دو دامن قاتل کا لوٹھ بہائے خوں سے اُٹھا

جب اپنا بہا خوں پانو پر اُس کے دل کیوں اس کا مشوش ہو

کیا رجز کو کر مقطوع و مغفل تم نے غزل یہ لکھی ہے
ذوق اسکی بحر کو سنکر شاداں روح خلیل و خفش ہو

دن کٹا جائے اب رات کدھر کاٹنے کو
جب سے وہ گھر میں نہیں دوڑے ہے گھر کاٹنے کو

ہائے صیاد! تو آیا میرے پر کاٹنے کو
میں تو خوش تھا کہ چھری لایا ہے سر کاٹنے کو

اپنے عاشق کو نہ کھلواڈ کنی ہیرے کی
اُسکے آنسو ہی کفایت ہیں جگر کاٹنے کو

دانت انجم سے نکالے ہوئے تجھ بن مجھ پر
مُنہ فلک کھولے ہے اے شاک قمر کاٹنے کو

وہ شجر ہوں نہ گل و بار نہ سایہ مجھ میں
باغباں نے ہے لگا رکھا مگر کاٹنے کو

سر و گردن جگر و دل ہیں یہ چاروں حاضر
چاہے دل یار کا چورنگ اگر کاٹنے کو

شام ہی سے دلِ بیتاب کا ہے ذوق یہ حال
ہے ابھی رات پڑی چار پہر کاٹنے کو

چرخ ضدّی ہے کوئی ضد نہ دلائے اسکو
کہ سنے غو کو غرتے تو جلاوے اُسکو

دیکھیں تم کیسے بہکتے ہو جسے کرتے ہو یاد
بھول تو جاؤ بھلا میرے بھلاوے اُسکو

قالبِ خاکیٔ انساں کو بنا کر کچا
عشق کی آگ میں ڈالا کہ پکاوے اُسکو

آبرو خاک میں دی اُس نے ملا آئینہ کی
مجھ سا ہو آئینہ تو مُنہ نہ دکھاوے اُسکو

مُنہ ہے کیا شمع کا ہو بزم میں تجھ سے روکش
چٹکیوں میں ابھی گلگیر اُڑاوے اُسکو

آئے تصویر ہی اُسکی وہ نہ آئے تو نہ آئے
پر میرے پاس کوئی کھینچ ہی لاوے اُسکو

پیار کی بات یہ مجھ سے نہیں اک دو رسے ہے
تیری یہ خو ہے کہے مجھ کو سناوے اُسکو

وہ عیادت کو میری آئے تو کیونکر آئے
مر بھی جاؤں تو ذرا رحم نہ آوے اُسکو

مشتِ خاکا اپنی ہم اُس کوچہ میں کل پھینک آئے
اب وہ ذوق آپ اٹھائے نہ اٹھاوے اُسکو

سگِ دنیا پسِ از مردن بھی امن گیرِ دنیا ہو
کہ اُس مُختے کی مٹی سے بھی کُتّا گھانس پیدا ہو

ہجومِ درجوا آنکھوں میں تیرا شوق تماشا ہو
تو شاخِ ہر مژہ سے چشمِ نرگس وار پیدا ہو

تیرے بیمار کو گر اپنے جینے کی تمنا ہو
فلک پر سُنکے ہنستے ہنستے شادیمرگ علیے ہو

نہو دستِ رس امانِ وصلِ یار تک ہرگز
اگرچہ سے عاشق پانوں تک دست تمنا ہو

مجھے کیا چاہیئے عفو گنہ کشا سوزِ محبت میں
گرہ میری سپند آسا میری زیادت ہو

درازی میں شبِ غم کی اگر ہمسائے دامن ہو
خیالِ زلفِ لیلیٰ اسکے حق میں الف لیلیٰ ہو

کرے پروازِ مرغِ جاں اگرچہ شاخِ طوبےٰ سے
پر اُرتا نقطہ سے مثلِ مرغِ رشتہ بر پا ہو

حلاوت یہاں کہاں جب ہو سے آبِ شور کا دریا
زلالِ خضر کا ایک چشمہ سو بھی سب سے اخفا ہو

تصوّر یوں کبھی غفلت میں آجاتا ہے مرنے کا
کہ جیسے عالمِ رویا میں چشم کو رینا ہو

مجھے بلوہ میں مارا ہے نگاہ و ناز و مژگاں کے
بتاؤں کسکو قاتل کس سے میرے خوں کا دعوےٰ ہو

یہ شہرت نام کی ہی وہ بلا ہے پیچ ہستی کا
کہ صحرائے عدم میں گردنِ عنقا کا پھندا ہو

ترے صحرا میں وہ وحشت پرستی ہے کہ مجنوں کے
گرے گر سر پہ قطرہ آبلہ زیرِ کفِ پا ہو

کہیں کیا دلکی وسعت اپنی ہم فندے دوست
اگر نہ آسماں ہوں جسمیں ایک خال سویدا ہو

اکیلا رہگیا یاروں سے یوں ہوں ناتوانی میں
کہیں شاخِ خزاں دیدہ پہ جیسے زرد پتا ہو

جو ذکر اُسکا کہو ذوق ماتمِ مایۂ عشرت
تو کیوں حق حق کرے وہ شیشہ جس شیشہ میں صہبا ہو

سرِ مہری سے تری گر خونِ دل یخ بستہ ہو
پھر ٹپکے کوزۂ دل گرچہ سب بشکستہ ہو

کیونکہ قابو میں فلک کے عاشقِ وارستہ ہو
یہ تو جب ہو گر کماں کے بس میں تیر جستہ ہو

ہر قدم پر ہے خراش پائے مجنوں گل فشاں
تا کہ ایک خارِ صحرائے جنوں گلدستہ ہو

کیا ہوا داغ محبت سے ہوا دل سربمہر
یہ نہیں ممکن کہ میرا یار دل سربستہ ہو

کیا نکالے سوزنِ الماس دل سے غم کی پھانس
جتنی یہ کاوش کرے اتنی ہی پیوستہ ہو

منہ سے جو نکلے مرا جب ہے کہ ہو وے لنشیں
آہ موزوں ہے کہ نالہ مصرعہ برجستہ ہو

جانے کیا بیدرد اندازِ کلامِ دردمند
ذوق میرا ہم سخن گر ہو کوئی دلخستہ ہو

ایکدن عرفی کے قصیدہ نعتیہ کے اشعار پڑھکر طبیعت میں ذوق وشوق پیدا ہوا۔

اقبال کرم میگزد ارباب ہمم را
ہمت نخورد نیشتر لاؤ نعم را

فرمایا کہ بڑے بڑے اُستادوں کے قصیدے اس زمین میں ہیں۔ اُس حوم نے بھی معرکہ میں لکھا تھا۔ اور عقیدت سے لکھا تھا۔ ہم اپنی زبان میں عرض حال کرینگے۔ چنانچہ اُسی دن شروع کیا۔ اور قلم برداشتہ یہ اشعار لکھے۔ پھر فرصت نہوئی کہ تمام کرتے۔ اب یہ ردیف واو کے ۱۲ شعر ہیں۔ باب قصائد میں لیجانا کیا ضرور ہے یہیں لکھدیتا ہوں۔

پتھرا دیا جلوہ نے تیرے چشم صنم کو
چکرا دیا غمزہ نے تیرے طوفِ حرم کو

جیسے کہ لکھا ہے تیرا وصفِ رخِ زیبا
چومے ہے قلم لوح کو اور لوح قلم کو

رونق ہے بہار گل رخسار سے تیری
گلزار حدوث و چمنستانِ قدم کو

جائے نہ کبھی طبع جفا پیشہ سے ہرگز
کس طرح نکالے کوئی شمشیر کے خم کو

کیا ڈھونڈتا ہے تو عمل بغض و محبت
چلتا ہوا نعویذ سمجھ نقشِ درم کو

ہیں اشکِ کباب اشک تیرے سوختہ جاں کے
پر کرتے ہیں خوں شبنم گلزار ارم کو

دیوانہ تیرا قیس سے ہستی کے جو چھوٹا
چڑھ جائیگا ایک زلزلہ صحرائے عدم کو

جسدان سے زمیں پر ہے فلک خاک ہے اڑتی
دیتے تھے یہاں راہ نہ اس سبز قدم کو

خوبی سے نہیں رونق بازار کہ یوسف
اس شکل و شمائل پہ بکا چند درم کو

کیا دیگا دم آکر کسی بے دم کو مسیحا
اللہ سلامت رکھے اس تیغ کے دم کو

دے جام مجھے چشم عنایت سے جو ساقی
دکھلاؤں تماشا ابھی کیخسرو جم کو

بد ہو کوئی یا نیک رقم کام ہے اسکا
احوالِ بد و نیک سے کیا کام قلم کو

منزل گم گشتگاں بالکل الگ دنیا سے ہو
آسماں بھی ہو اگر وہاں ہیضۂ عنقا سے ہو

سایہ افگن جبہ تو اپنے قدر عنا سے ہو
گرد باد اس خاک پر ہمت قد طوبے سے ہو

گر کرے معجز نمائی جادۂ رخسار یار
وہ کفِ آئینہ سے ہو جو ید بیضا سے ہو

میں دمِ مجنونِ بیاباں مرگ ہوں جسکے لئے
جو ہو چادر یا کفن وہ دامن صحرا سے ہو

سبحہ صد دانہ بھی پڑ جائے گر میرے گلے
دانۂ انگور تا رہبر مینا سے ہو

دشت کو سیراب کر دے آبلہ پائی میری
ہر قدم پر چشمہ جاری چشم نقش پا سے ہو

ثابت ایک ٹکڑا نہ چھوڑے دل کا میرے اضطراب
چاکِ سینہ گر رفو تارِ رگِ خارا سے ہو

تشنہ کامی گر مری دیوے چکھا شورابِ اشک
ذوق شورِ انعطش پیدا لبِ دریا سے ہو

صفا میں رخ تیرے آئینہ کیا خاک ہم سر ہو
نگاہ چشم سرمہ لو دے بھی جو مکدر ہو +

مری تا شیر وحشت وہ ہے مضطر جس سے پتھر ہو
نگیں پر نام کھد تو نکلے گھر سے باہر ہو

تیرا دیوانہ دل سوختہ آتش قدم گر ہو
جلا دے زیر پا گر خار مژگانِ سمندر ہو

قیامت کو بھی کیا انصاف اپنا اے ستمگر ہو
ابھی قصہ نہ ہو آخر کہ آخر روز محشر ہو

جو تو دریا دلی سے دے ناخنِ پا گلبدن اپنے
تو ہر ایک فلسِ ماہی شکل برگِ گل معطر ہو

ڈبوئیں آشنا کو گر سبکدوشی اپنی صحبت میں
تو آہن ساتھ کیوں لکڑی کے دریا میں شناور ہو

کھٹکتے ہی ہیں دل میں تیرے مژگانِ برگشتہ
ہجومِ نیشِ کژدم سے اگر دل گنجِ نشتر ہو

کہیا سوختہ جاں تو نے مجھکو سرد مہری سے
کہ آہ سرد میری شمع کافوری سے ہم سر ہو

حرم کو جائے زاہد ہم تو میخانہ کو چلتے ہیں
مبارک اسکو طوفِ کعبہ ہم کو دورِ ساغر ہو

نشہ ٹوٹے تیرے ساغر کشِ وحشت کا کیا ممکن
اگر سو ٹکڑے سنگِ کو دکاں سے کاسۂ سر ہو

بچائے حق تعالے اُس نہ دیدی شرمشر سے
کہ خوں سید کا جس پر حرم کو خونِ کبوتر ہو

رہائی قتل پر موقوف ہو گر ہم اسیروں کی
روانی تیغ میں وابستۂ زنجیر جوہر ہو

مجھے صحنِ چمن بھی عرصہ گاہِ حشر ہو تجھ بن
گل خورشید میرے واسطے خورشید مخشر ہو

جو کھوئے آپ کو وہ منزلِ مقصود کو پہنچے
تیری گمگشتگی اس راہ میں اے ذوق رہبر ہو

بجا کہے جسے عالم اُسے بجا سمجھو
زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

عزیزو اِسکو نہ گھڑیال کی صدا سمجھو
یہ عمر رفتہ کی اپنی صدائے پا سمجھو

سمجھ تو کو رسوادوں کو ہو جو علم نہ ہو
اگر سمجھ بھی نہ ہو کو ربے عصا سمجھو

نہ سمجھو دشت ۔ شفا خانۂ جنوں ہے یہ
جو خاک سی بھی پڑے پھانکنی دوا سمجھو

پڑے کتاب کے قصوں میں کیا کرو اصحاب
صفا ہو دل تو بہ از روضۃ الصفا سمجھو

زہے نصیب ہنگامِ مشق تیر ستم
ہمارے ڈھیر کو تم تو دہ خاک کا سمجھو

ہنسے وہ رونے پہ میرے تو پھر صفِ مژگاں
نہ سمجھو چشم پہ دیوار قہقہا سمجھو

نفس کی آمد و شد ہے نماز اہلِ حیات
جو یہ قضا ہو تو اے غافلو قضا سمجھو

تمہاری راہ میں بنتے ہیں خاک میں لاکھوں
اس آرزو میں کہ تم اپنا عابد پا سمجھو

دعائیں دیتے ہیں ہم دل سے تیغ قاتل کو
لبِ جراحتِ دل کو لبِ دعا سمجھو

بہا دیا میرا خوں اُس نے اپنے کوچہ میں
اسی کو یارو دیت سمجھو خوں بہا سمجھو

سمجھ ہے اور تمہاری کہوں میں تم سے کیا
تم اپنے دل میں خدا جانے سُن کے کیا سمجھو

تمہیں ہے نام سے کیا کام مثل آئینہ
جو روبرو ہوا اُسے صورت آشنا سمجھو

سہ
نہیں ہے کم زرِ خالص سے زردیٔ رخسار
تم اپنے عشق کو اے ذوق کیمیا سمجھو

یہ چار غزلیں مرقوم الذیل ابتدائی مشق کی ہیں۔ اور انہی غزلوں میں سے ہیں جنھیں استاد مرحوم کہتے تھے کہ بعض مرشد زادوں کی فرمایش سے اُن کے مشغلہ موسیقی کے لئے لکھدی تھیں۔ باوجود اس کے اہل نظر اِن کے مضامین کو۔ اور قوافی کے پہلو کو دیکھینگے کہ کس رتبہ پر ہیں۔

ہاتھ سینہ پہ مرے رکھکے کدھر دیکھتے ہو
ایک نظر دل سے ادھر دیکھ لو گر دیکھتے ہو

ہے دمِ بازپسیں دیکھ لو گر دیکھتے ہو
آئینہ مُنہ پہ مرے رکھکے کدھر دیکھتے ہو

ناتوانی کا مری مجھ سے نہ پوچھو احوال
ہو مجھے دیکھتے یا اپنی کمر دیکھتے ہو

پر پروانہ پڑے ہیں شجر شمع کے گرد
برگ ریزیٔ محبت کا ثمر دیکھتے ہو

بید مجنوں کو جو دیکھتے اے اہل نظر
کسی مجنوں کو بھی آشفتہ بسر دیکھتے ہو؟

شوق دیدار مری نعش پہ آکر بولا +
کسکی ہو دیکھتے راہ۔ اور کدھر دیکھتے ہو

غزل
لذت نادکِ غم ذوق سے ہو پوچھتے کیا؟
لب پڑے چاٹتے ہیں زخم جگر دیکھتے ہیں۔
دوئم

عبث تم اپنی رکاوٹ سے مُنہ بناتے ہو
وہ آئی لب پہ ہنسی دیکھو مسکراتے ہو

لگا کے سرمہ تم آنسو نہیں بہاتے ہو
یہ ہمکو جلوۂ شق القمر دکھاتے ہو

چھپا کے پان یہ کسکے لئے بناتے ہو
ہمارے قتل کا بیڑا کہیں اُٹھاتے ہو

تم اپنے رخ پہ یہ کاجل کا تل بناتے ہو؟
کہ میرا اختر بخت سیہ دکھاتے ہو؟

اگر دباؤ کسی کا تمہارے دل پہ نہیں
تو ہم کو دیکھکے تم کان کیوں دباتے ہو

ملا پ جائیں جبھی ہم کہ دیکے تم بوسہ
کہو کہ آؤ زباں سے زباں ملاتے ہو

مریض عشق کو تم پوچھ کر طبیبوں سے
مدام شربت عناب کیا پلاتے ہو

ہوں خاک چاٹ کے کتا ابھی شفا ہو جائے
جو شربت لب میگوں ذرا چٹاتے ہو

جگر کے آبلے جو پھوڑتے ہو حضرت عشق
ہماری چٹکیوں میں ہم کو تم اڑاتے ہو

گلو! یہ کہ گئی کیا کان میں تمہارے صبا
کہ لوٹے جاتے ہو۔ پھولے نہیں سماتے ہو

جلن سے رشک کے ہیں ہڈیاں جلی جاتیں
کہ ہائے تم نئے قلیاں کو منہ لگاتے ہو

ہماری لاش پہ آواز تم باذن اللہ ق
تم آکے حضرت عیسے عبث سناتے ہو

اُٹھینگے یار کی ٹھوکر سے یہ چلو تشریف
نہیں تو پھر کوئی صلوات سکے جاتے ہو

ہو کرتے سبزۂ خط کی جو سیر آئینہ میں
نگہ کی تیغ کو کیوں زہر میں بجھاتے ہو

نمک چھڑکتی ہے شبنم گلوں کے زخموں پر
دکھا کے تم لب و دنداں جو کھلکھلاتے ہو

ہمیشہ صدقہ اُس بروکو ہو کے حضرت دل ق
یہ لب پہ نالۂ جانکاہ اپنے لاتے ہو

وہ یا طواف حرم میں ہے سامنے محراب
اور اس میں نعرہ لبیک تم سناتے ہو

وہ آئے بام پہ ہیں ہمدموں نہ بیٹھو اب
اُٹھاؤ میرا جنازہ اگر اُٹھاتے ہو

یہ صید بستہ فتراک کھل پڑے نہ کہیں
سمند ناز کو تیز اتنا کیوں اُڑاتے ہو

مرے لئے تو ہر ایک طرح سے تباہت ہے ق
یہ تم جو دشمنوں کو دوست بناتے ہو

* بجا رہے ہیں سویدائے دل کو ہم اپنے
نظر نگر کو تمہارے سپند کیا جلتے ہو

کاؤں گمسکے جو صندل تو کہتے ہو کہ مجھے
لگاوٹ اتنی بھلا کس لئے دکھاتے ہو
جو پڑھ کے سورۂ اخلاص دم کروں تو کہو
کہ دیکے دم مجھے اخلاص کیا جتاتے ہو

یہ ایسا کونسا انداز گفتگو ہے ذوق
کہ جس پہ زہر طبیعت تم آزماتے ہو +

جو کہو لے فدیۂ یار کی تصویر دکھا دو
تم لکھوالو اور وہی تحریر دکھا دو
دیکھو! سر مقتل نہ کہیں چھوڑ دے بسمل
پہلے مجھے تم یار کی شمشیر دکھا دو
حالت طپش دل کی مرے پوچھیں اگر وہ
تم ان کو تڑپتا ہوا نخچیر دکھا دو
گر دیکھنے نا ہد تو پھر ایمان ہی لائے
تم مصحف رخ اسکو بہ تدبیر دکھا دو
گر چاہو ثریا ہو نہاں پردۂ شب میں
جھمکوں کو تہ زلف گرہ گیر دکھا دو
اس چشم کو ہے ناز بڑا تیر نگہ پر +
اے حضرت دل! آہ کی تاثیر دکھا دو
وہ برق نگہ اپنا ہے دکھلا رہی عالم
اس تا لہ جانسوز کا ایک تیر دکھا دو
گر وہ نہیں آسکتے ہیں یہاں تک تو بلا سے
لاکر کوئی اُن کی مجھے تصویر دکھا دو
دیتے ہیں خبر غیب کی گر شیخ جی صاحب
کہدو کہ ہمیں تم خط تقدیر دکھا دو
ایک جان ہے۔ ایک دل ہے سو ہیں یک رنگ دیگرنگ
تم چاہو تو ہر رنگ میں تاثیر دکھا دو

لطف و کرم یار کے تم پر جو ہیں منکر
ذوق آج انہیں تم یار کی تحریر دکھا دو

مجھے ابتدا سے سن سیدہ لوگوں کی باتیں سننے کا شوق تھا۔ ایک بڈھے نے ایک دن کہا کہ ہمیں تمہارے اُستاد کی ایک غزل یاد ہے۔ اُن کے لڑکپن کی ہے۔ وہ بیچارہ بے علم تھا۔ اور طول عمر نے بدحواس کر دیا تھا غلط سلط جو کہتا گیا میں نے

لکھ لیا۔ اُستاد کو لاکر سُنائی تو ہنسے اور فرمایا۔ بہت لڑکپن کی غزل ہے۔ کہاں سے ہاتھ آگئی۔ سرسری طور پر درست کرکے لکھوا دی۔ اور کہا کہ رکھ چھوڑو کبھی فرصت میں بنائینگے۔ (بندہ آزاد کہتا ہے) کہ کچھ ہو مگر اس کے قافیوں کو دیکھو کہ کیا کیا برجستہ پہلو سے بیٹھیں ہیں۔ اور مضمون بھی صاف بچپن کے معلوم ہوتے ہیں۔

دمِ ذبح تیغ جفا میں جب تری بہتا آبِ حیات ہو
تو شہید ناز کو کیونکہ پھر نہ حیات بعدِ ممات ہو

جو مذاق شعر کو لے پری میں چکھاؤں تیری شکر لبی
قلم انگلیوں میں جو ہے مری ابھی رشک شاخ نبات ہو

جو ہیں کرتے میرے لئے دعا کہ ہو دام عشق سے دل رہا
تو ہے دل یہ کہتا کہ اے خدا انہیں اس جنوں سے نجات ہو

مجھے کہتے سب ہیں کہ صبر کر جو نہیں تو صبر سے در گذر
سر حسن و عشق پری میں پر۔ نہ وہ بات ہو نہ یہ بات ہو

سر راہ کشتۂ ناز کا وہ مزار ہے نظر آرہا +
پڑھو فاتحہ اسپہ بھی چلو داخل حسنات ہو

ترا حسن وہ بت مرجبیں کہ ہے صدقہ جسپہ زماں زمیں
جو دکھلے رخ تو ہو دن وہیں جو چھپلے مُنہ ابھی رات ہو

جو ہیں مرتے حسن صفات میں وہ رہینگے اپنی سی بات میں
تو فنا ہو ذوق اُسی فات میں کہ جو ذات جملہ صفات ہو

کوسوں کیا تنگیٔ زمانے کو
کہ نہیں جائے سر اُٹھانے کو

قصد کعبہ کا تھا پھرے اُلٹے
چوم کر اُسکے آستانے کو

تو مکدر نہ ہو تو عشق میں ہم
ایک آندھی ہیں خاک اُڑانے کو

یہانتک لاغری ہے اس بیمار کے تن کو
عجب کیا ہے جو سمجھے طوق گردن چشم سوزن کو

زیادہ ہوتا ہے پیری میں فربہ نفس امّارہ
یہ بالوں کی سفیدی شیر ہے اس رہزن کو

کمند نام و شہرت کھینچ لاتی ہے عدم سے بھی
لپٹ کر مثل طوق فاختہ عنقا کی گردن کو

تصور کس طرح بھولے ترا اس چشم گریاں کو
نکالے مینہ برستے میں کوئی کیا گھر سے مہماں کو

نکالوں کس طرح سینہ سے اپنے تیر جاناں کو
نہ پیکاں دل کو چھوڑے ہے نہ دل چھوڑے ہے پیکاں کو

رکھا مہماں بہانہ سے ترے اُس ماتباں کو
بڑے ہی وقت کام آیا مرے حمت ہے باراں کو

دیکھا دم نزع دل آرام کو
عید ہوئی ذوق وصل شام کو

تم مستی ملکر نہ غرغرہ سے نکالا منہ کرو
اور نہیں گر مانتے تو جاؤ کالا منہ کرو

اشکبار ہی مری مژگاں کی ذرا دیکھیں تو
کتنے پانی میں ہیں فوارے بھلا دیکھیں تو

یا تو پاس دوستی تجھکو بت بیباک ہو
یا مجھی کو موت آجائے کہ قصہ پاک ہو

غیر نے ایسا پڑھایا کچھ مرے محبوب کو | لاکھ ہچوں سے پڑھا اُسنے مرے مکتوب کو

پوشاک آبی آپ کو گر دل پسند ہو | دریا پری حباب کے شیشہ میں بند ہو

خبر کر جنگ نوفل کی۔ تو مجنوں اہل ہاموں کو | کبادہ تا صبا کھچوائے شاخ بید مجنوں کو

جانتے ہیں اب تو کوئے بُت الہ فام کو | اپنا تو بس سلام ہے دار السلام کو

فرماتے تھے کہ یہ ہم نے امیر خسرو کے شعر کا ترجمہ کیا ہے اور ترجمہ کرتے ہیں تو اسیطرح کیا کرتے ہیں۔

حق نے تجکو اک زبان دی اور دیئے ہیں کان دو | اسکے یہ معنے کہے ایک اور سنے انسان دو

کہے ایک جب سنے انسان دو | کہ حق نے زباں ایک دی کان دو

نہ شبنم کو کہو بلبل کے آنسو | یہ ہنستے ہنستے نکلے گل کے آنسو

ایکدن کئی استادوں کے مطلع سنائے اور فرمایا۔ ان کے جواب نہیں لاتا نی رہے۔ انہی میں جرأت کا مطلع پڑھا۔

رشبہ گل بازی کا دلا کاش تو پاتا + | ہاتھوں سے جو گرتا تو وہ آنکھوں سے اُٹھاتا

+ سند دستار کے نوجوانوں میں یہ بھی ایک کھیل ہے کہ دو یار آمنے سامنے ایک گلاب یا گیندے کا پھول لیکر چند قدم کے فاصلے پر کھڑے ہو جاتے ہیں پھر اُسپر پھینکتا ہے۔ ۱۰-۱۵ دفعہ برابر رد و بدل ہوتی رہتی ہے جس کے ہاتھ سے پھول گر پڑتا ہے وہ نیچی نگاہ کئے کہتے تھے اُٹھاؤ آنکھوں سے جرأت کے شعر میں لطف یہ ہے کہ کہتا ہے۔ کاش میرا دل یار کی بھیازی کے کام آتا۔ اگر پھینکا بہت سی چوٹیں کھانی پڑتیں اور گرتا۔ لیکن اسکے ہاتھوں۔ اور ہاتھوں سے آنکھوں تک تو جا پہنچتا۔

نہ پوشاک آبی آپ کو گر دل پسند ہو

پھر فرمایا کہ لڑکپن میں یہ مطلع سُنکر ہم نے بھی ایک مطلع کہا تھا۔ مگر لڑکپن ہی تھا۔ بھلا یہ کجا وہ کجا۔ وہ اَور ہی بات ہے۔ پھر اپنا مطلع پڑھا۔

جتنا ہے[1] نمک رب میرے زخموں میں کھپاؤ	پلکوں سے اُٹھاؤ گے نہ ہاتھوں سے گراؤ

اللہ مغفرت کرے کیا با انصاف طبیعت۔ اور نیک دل لائے تھے۔ دیکھ لو ویسا ہی حسن قبول بھی اللہ نے اُن کے کلام کو دیدیا ہے۔

انہی میں بقا کا بھی مطلع پڑھا تھا۔ اور فرمایا تھا کہ دیکھو اسکا بھی جواب نہیں ہوا۔

دیکھ آئینہ جو کہتا ہے کہ اللہ رے میں	اسکا میں دیکھنے والا ہوں بقا واہ رے میں

ایکدن نئے اور پرانے الفاظ کے استعمال پر کچھ فرما رہے تھے۔ ایک اپنا مطلع پڑھا اور کہا کہ بچپن میں ہم تک اکثر بزرگوں سے سنتے تھے۔ خود بھی کہدیتے تھے۔

تک دیکھیو اُس لذت پیکانکے اثر کو	جنبش مرے ابتک ہے لب زخم جگر کو +

(آزاد) دوسرے مصرع کو دیکھو کیا چستی سے لفظوں کو بٹھایا ہے کہ ایک کو جنبش نہیں ہوسکتی۔

مطلع مرقوم الذیل لڑکپن کا ہوا ہے۔

دریا میں ترے حُسن کے بالے ہیں بھنور دو	اور اس پہ غضب یہ کہ پڑے اس میں مگر دو

ہائے ہوز

مرتے ہیں ترے پیار سے ہم اور زیادہ	تو لطف میں کرتا ہے ستم اور زیادہ

[1] ایک مسئلہ لوگوں میں عام زد ہے کہ نمک کو پھینکنا۔ یا بے پروائی سے گرانا منع ہے۔ اُستاد کہتے ہیں کہ جتنا نمک ہے سب میرے زخموں میں کھپاؤ۔ گراؤ گے تو آنکھوں سے اُٹھانا پڑیگا ۱۲

دیں کیونکہ نہ وہ داغ الم اور زیادہ
قیمت میں بڑھے دل کی درم اور زیادہ

ساتھ اپنے ہے اب فوج الم اور زیادہ
کر تو بھی بلند آہ علم اور زیادہ

تیز اُس نے جو کی تیغ ستم اور زیادہ
مشتاق شہادت ہوئے ہم اور زیادہ

سر کٹ کے سرافراز ہیں ہم اور زیادہ
جوں شاخ بڑھے ہو کے قلم اور زیادہ

گر شرح جنوں کیجیے رقم اور زیادہ
ہو چاک ابھی جیب قلم اور زیادہ

دیتا ہے وہ دم باز جو دم اور زیادہ
شیشہ کی طرح پھولے ہیں ہم اور زیادہ

گھبرانا جو یاد آیا تیرا ہو کے ہم آغوش
گھبرانے لگا سینہ میں دم اور زیادہ

کچھ کی رقم شوق نے تاثیر جو پیدا
اُٹھنے لگا قاصد کا قدم اور زیادہ

لذت سے محبت کی ہے ہر زخم جگر کو
ذوق نمک درد و الم اور زیادہ

کرنے کو سیہ نہ ورق چرخ کو ایدل
نالہ سے نہیں کوئی قلم اور زیادہ

کیا ہو دیگا دو چار قدح سے مجھے ساقی
میں لونگا تیرے سر کا قسم اور زیادہ

گر میری طرح دوش پہ ہو بار محبت
ہو پشت خمیدہ میں ابھی خم اور زیادہ

دشمن کی نہ جا سیدھی نگاہوں پہ کہ جو تیغ
سیدھی ہے تو ایک اسمیں ہے دم اور زیادہ

ہو جسکو پس از مرگ بھی یاد دہن تنگ
تنگ اُسکو کرے کنج عدم اور زیادہ

اُس لب کے مارے ہی اگر خاک کو چاٹے
پیدا دم افعی میں ہو سم اور زیادہ

اُس شوخ ستمگر کو میری مرگ ہے منظور
ہے زہر نہ کھانا مجھے سم اور زیادہ

ہستی تنک آبہ جو پھونکے گی اسی طرح
ابھرے گا حباب لب یم اور زیادہ

وہ دل کو چرا کر جو گئے آنکھ چرانے
یاروں کا گیا اُن پہ بھرم اور زیادہ

کرتی ہے مری خاک جلا کر مجھے قائل
کیونکر نہ اُٹھاوے وہ قدم اور زیادہ

دکھلائے جوہ صید فگن چشم کی شوخی — ہوآہوئے رم دیدہ کو رم اور زیادہ
آخر مئے عشق آنکھوں سے ٹپکائی کسی نے — بھڑکے ہے جو یوں آتش غم اور زیادہ
ہے نکہتِ ریحاں کا دماغ اب کسے تجھ بن — آتا ہے میرا ناک میں دم اور زیادہ
جو پیٹ کے ہلکے ہیں پچے بات کب اُنسے — روکیں تو اُچھر جائے شکم اور زیادہ
مہمیز سرِ خار سے نکلا سرِ صحرا + — کچھ تو سنِ وحشت کا قدم اور زیادہ
صیدِ دلِ عاشق میں ہے مصروف وہ کافر — بے خوف ہے اب صید حرم اور زیادہ
گر سرمہ کرے خاکِ خرابات کو صوفی — سوجھیں اُسے پھر لوح و قلم اور زیادہ
اے ابرِ وئے خمدار نہ برّش میں کمی کر — ہاں تجھکو میرے سر کی قسم اور زیادہ
کیا قہر ہے جتنا کہ وہ چاہت سے رُکے ہے — اُتنا ہی اُسے چاہے ہیں ہم اور زیادہ
جاتا ہے شہیدانِ محبّت کا جنارہ — دو تم بھی اُٹھا چند قدم اور زیادہ
یارب یہ مری نبض ہے یا موجِ رمِ برق — کیا ہوگا جو ہوگی تپِ غم اور زیادہ
کہتا ہے میرا شوقِ جراحت کہ صد افسوس — اس تیغ دو دم میں نہیں دم اور زیادہ
کیوں میں نے کہا تجھ سا خدائی میں نہیں اور — مغرور رہا اب وہ صنم اور زیادہ
کہتا ہے گلے لگ کے میرے وہ دمِ خنجر — لو عشق کا بھر لو کوئی دم اور زیادہ
اس عاشقِ بیچارہ کا ہے آج یہ کیا حال — ق گریے سے ہے آنکھوں پہ ورم اور زیادہ
پیٹے سرِ بستر یہ پڑا پاؤں کہاں تک — بس پاؤں نہ پھیلا شبِ غم اور زیادہ
ہے باغِ جہاں تجھے گرہمتِ عالی — ق کر گردنِ تسلیم کو خم اور زیادہ
لیتے ہیں ثمر شاخِ ثمرور کو جھکا کر — جھکتے ہیں سخی وقتِ کرم اور زیادہ

جو کنجِ قناعت میں ہیں تقدیر پہ شاکر — ہے ذوق برابر اُنہیں کم اور زیادہ

اے ذوق وقت نالہ کے رکھلے جگر پہ ہاتھ
ورنہ جگر کو روئیگا تو دھر کے سر پہ ہاتھ

میں ناتواں ہوں خاک کا پروانہ کی غبار
اُٹھتا ہوں رکھ کے دوش نسیم سحر پہ ہاتھ

خط دیکے دلمیں تھا کہ زبانی بھی کچھ کہے
رکھا مگر کسی نے دلِ نامہ بر پہ ہاتھ

کھاتا ہے اس مزہ سے غم عشق میرا دل
جیسے گرسنہ لب سے ہی حلوائے تر پہ ہاتھ

جوں پنج شاخہ تو نہ جلا انگلیاں طبیب
رکھ رکھکے نبض عاشق تفتہ جگر پہ ہاتھ

اے شمع دیکھ بزم فنا میں سنبھل کے بیٹھ
ماریگی دم میں صبح تیرے تاج زر پہ ہاتھ

چھوڑا نہ دل میں صبر نہ آرام نے شکیب
تیری نگہ نے صاف کیا گھر کے گھر پہ ہاتھ

قاتل ہے کیا ستم کہ اُٹھاتا نہیں کوئی
آکر مزار کشتۂ تیغ نظر پہ ہاتھ

اے ذوق میں تو بیٹھ گیا دل کو تھام کر
اس نازسے کھڑے تھے وہ رکھکے کمر پہ ہاتھ

روز آفتیں نئی ہیں دلِ پُرمحن کے ساتھ
ایک زخم تازہ روز ہے زخم کہن کے ساتھ

ہوش و خرد گئی نگہ سحر فن کے ساتھ
اب جو ہے اپنی بات سو دیوانہ پن کے ساتھ

ہے ان کا سادہ پن بھی تو کس بانکپن کے ساتھ
سیدھی سی بات بھی ہے تو ایک بانکپن کے ساتھ

یاد آگیا تیرا قد رعنا جو باغ میں
کیا کیا لپٹ کے رہ گئے ہیں سرو چمن کے ساتھ

وحشی کو ہم نے دیکھا اُس آہو نگاہ کے
جنگل میں بھر رہا تھا قلانچیں ہرن کے ساتھ

دست جنوں نہ دے تجھے ناخن خدا کرے تو
ٹکڑے اڑا دے تن کے مرے پیرہن کے ساتھ

افسردہ دل کے واسطے کیا چاندنی کا لطف
لپٹا پڑا ہے مردہ سا گویا کفن کے ساتھ

پایا در اثر نہ کہیں شب کو آہ نے
سرماتی پھری ہے سپہر کہن کے ساتھ

بزم صنم میں حضرت دل ذکر کعبہ کیا؟
تھی جس چمن کی بات گئی اُس چمن کے ساتھ

اِن ناتوانیوں میں بھی یہانتک ہے شوق دل
گویا چمن میں اُڑ کے نسیم چمن کے ساتھ

دوزخ میں بھی پڑیں تو یہ سیدھے ہوں کج سرشت
آتش میں پیچ و خم ہیں سن کے رسن کے ساتھ

گندم ہے سینہ چاک فراق بہشت میں
آدم کو کیا نہ ہوگی محبت وطن کے ساتھ

لب پر ترے پسینہ کی بوندائے عقیق لب
چشمک زنی کرے ہے ثریا بمن کے ساتھ

وحشت تو دیکھو بعد فنا بھی میرا غبار
باتیں کرے ہے سقف سپہر کہن کے ساتھ

دل و دلا ہے اژدر دوزخ کو کھینچ لے
مارے اگر کمند دم شعلہ زن کے ساتھ

چشم دوکان حرص ہے کون غیر مرگ
بخیہ کا تار اُن کے ہے تار کفن کے ساتھ

آخر چمن سے نکہت گل کر گئی سفر
خانہ بدوش کو نہیں الفت وطن کے ساتھ

ہوں لف عنبریں کا جو کشتہ تو کیا ہوا
لکھ دے کفن سیاہی مشک ختن کے ساتھ

منظور تجھکو کب ہے یہ اے میرے آفتاب
ہو کوئی تیرہ بخت تیرا سایہ بن کے ساتھ

داغ دل فسردہ پہ پھاہا نہ ہو نہ ہو
کام اس چراغ مردہ کو کیا ہے کفن کے ساتھ

جلد آ کہ مر نہ جائے کوئی خانماں خراب
ٹکرا کے اپنا سر در بیت الحزن کے ساتھ

مشکل ہے ذوق دام علائق سے چھوٹنا
جب تک کہ روح کو ہے علاقہ بدن کے ساتھ

جنوں کے جیب و دامن پر نہیں خون کے چھینٹے ہاتھ
سلوک سینہ سے بھی کچھ تو کر لے چلتے ہاتھ

ملا جو غیر سے عطر اسکو ہاں تو یہاں میری
لکیریں مٹ گئیں ہاتھوں کی ملتے ملتے ہاتھ

نہ آیا گور پہ میری وہ بیوفا ورنہ
گلے لگانے کو تربت سے بھی نکلتے ہاتھ

جو چھیڑے برق کو یہ تفتہ جاں تو کہتی ہے
کہ دیکھ مجکو لگانا نہ جلتے جلتے ہاتھ

اُٹھائے وجد میں جب ہاتھ ہم نے عالم سے
تو پہنچے عرش تلک کودتے اُچھلتے ہاتھ

مریضِ سوزِ محبت کی دیکھتا گر نبض | تو پھر طبیب کے بھی آبلوں سے پھلتے ہاتھ

کوئی جو کام ہو پیری میں کس طرح ہو ذوق
نہ اب ہیں پاؤں سنبھلتے نہ ہیں سنبھلتے ہاتھ

رقعہ چوری کا اور بھیجا ہے انجان کے ہاتھ | یا اکھی کہیں پڑ جاوے نہ دربان کے ہاتھ

تو جان ہے ہماری اور جان ہے تو سب کچھ | ایمان کی کہینگے ایمان ہے تو سب کچھ

لے نگاہ مجھ سے دل مت بچشم قہر دیکھ | گڑ دئے سے جو مرے تو دے نہ اسکو زہر دیکھ

کر دعا میرے لئے شیخ مناجات میں یہ | کہ خراب اور زیادہ ہو خرابات میں یہ

نگہ وہ ترک کہ جس کی نہیں جفا کی پناہ | اور اسکی آنکھ وہ کافر کہ بس خدا کی پناہ

زیادہ ہوگا توکل سے بھی کہیں روزہ | کہ اسمیں آیا تو روزی ہے اور نہیں روزہ

یائے تحتانی

بہت پرانی غزل ہے۔ والد مرحوم کے لڑکپن کی بیاض میں لکھی تھی۔ ۴ والے شعر کو دیکھو۔ وارستگان جمع ہے۔ اور بے اضافت۔ بے صفتہ باندھ دیا ہے جب وقت کا محاورہ یہی تھا۔ اور آخر میں ایک قطعہ بھی موجود ہے۔

ہیں ترے رشکِ خطِ رخسار سے
دل میں آئینے کے جوہر خار سے

شرحِ فرطِ حسرتِ دیدار سے
جو نگہ ہے کم نہیں طومار سے

کھائیے داغِ آتشینِ رخسار سے
کم نہیں دل مرغِ آتش خوار سے

ہاتھ اٹھاؤ عشق کے بیمار سے
کوئی بچتا بھی ہے اس آزار سے

اُنس ہے کیا دل کو تیرِ یار سے
ہے مشابہ زخم بھی سوفار سے

میرے طرزِ نالہ ہائے زار سے
ٹپکے بلبل کے لہو منقار سے

یوں نگہ نکلے ہے چشمِ یار سے
مست جیسے خانۂ خمار سے

فرشِ گل پر مجھ کو ہجرِ یار سے
کم نہیں تارِ رگِ گل خار سے

آئینہ اس شعلۂ رخسار سے
گرم ہے دکانِ آتش کار سے

بے نصیب اس کے ہیں گرد دیدار سے
سی دو آنکھوں کو نظر کے تار سے

مارے کرسیلی وہ زلفِ پُرعرق
جھڑ پڑیں دندان و ہان مار سے

خنجرِ موجِ تبسم سے ترے
گل چمن میں ہیں جگر افگار سے

وائے قسمت تمنا کامی ہو نصیب
ہم کو اس کے لعلِ شکربار سے

کرتا ہے دستِ جنوں جب کشمکش
جی اُلجھتا ہے نفس کے تار سے

سن کے میری جانکنی کو کوہکن
جوں صدا اُلٹا پھرے کوہسار سے

یہ بھی اس نازک بدن کو بار ہو
گر کمر باندھے نظر کے تار سے

نقطۂ خال اُسکا سودا خیز ہے
پھرتے ہیں ایک پانو ہم پرکار سے

اُٹھ چکا وہ ناتواں جب رہگیا
دب کے تیرے سایۂ دیوار سے

توبہ توبہ کہتا استغفار ہے
وقت توبہ میری استغفار سے

اپنے دامن کو بچا کر جائیو ۔ برق میرے وادیٔ پرخار سے
چاہیے سجدہ محبت میں ہمیں کشتی اسکی تیغ لنگر وار سے
ابرو آے جب نگہ کو ضعف سے کم نہیں مژگاں کی صف دیوار سے
تیرے ہی پانوں پہ اے قاتل گرا سر میرا اُڑ کر تیری تلوار سے
اُس دہن کا نکتہ موؤں بھی اک منتخب ہے مخزن اسرار سے
ابر ہے لیکن شفق آلود ہے زلف اُسکی سرخیٔ رخسار سے
خاک عاشق پر اُٹھے جائے غبار فتنۂ محشر تری رفتار سے
ناکسوں سے کیا رکیں وارستگاں اُلجھے کب دامن صبا کا خار سے
زلف کی قیمچی سے دل ڈرتا نہیں بھوت بھاگے ہے وگرنہ مار سے
دل کے آئینہ کو گر کردے گداز ق یار اپنی گرمیٔ رخسار سے
جوہر اُس سے یوں اٹھالیں جسطرح حرف قرطاس غلط بردار سے
بے تمیزوں کی ہے الفت نقص تام لیں ہیں نام طفل آدھا پیار سے

دل کو ہر دم عالم معنی سے ذوق
ہے خبر آتی نفس کے تار سے

دو برس ہوئے تھے کہ بہادر شاہ بادشاہ ہوے تھے ۔ اُدھر سے فرمایش زور پر اور ادھر سے طبیعت شور پر ۔ کہ شہر فائے دہلی میں سے ایک شخص نے مشاعرہ کیا ۔ سخن فہم وسخن شناس تھے ۔ اہل سخن سے ارتباط رکھتے تھے ۔ بڑے اشتہار و اہتمام سے شہرت دی ۔ استاد کے پاس آئے ۔ اور باصرار آنے کا اقرار لیا (میاں صابر بخش کی سرا کے پاس ان کا مکان تھا ۔ وہیں مشاعرہ ہوا تھا) استاد مرحوم فقا

کے تشریف لے گئے۔ ہم بچہ تھے ایسے جلسوں میں جانیکے قابل نہ تھے۔
غالب آئے تو سلام و کلام ہوتے ہی بولے۔ استاد! آج تو جی چاہتا ہے آپ کو کچھ سنائیے۔ اُستاد لطیفہ گوئی اور حاضر جوابی کے بادشاہ تھے۔ اور کم سخنی اس سے بڑھی ہوئی۔ اُن سے عمر میں بھی بڑے تھے۔ اتنا کہا خوب! بہت خوب!!
غرض مشاعرہ شروع ہوا۔ اور شمع گردش میں آئی۔ لطیفہ یہ ہوا کہ حکیم آغا جان عیش طبابت کا شغل رکھتے تھے۔ مگر خوش کلام اور شیریں سخن شوخ طبع شاعر تھے۔ انہوں نے اپنی غزل میں قطعہ پڑھا۔ (روئے سخن غالب مرحوم کی طرف تھا)

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے	مزا کہنے کا جب ہے اِک کہے اور دوسرا سمجھے
زبان میر سمجھے۔ اور کلام میرزا سمجھے	مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

ابھی اُستاد تک شمع نہ آئی تھی کہ حضور کا خواص[1] پہنچا۔ کہا۔ حضور نے دعا فرمائی ہے۔ یہ غزل دی ہے۔ اور فرمایا ہے۔ اسے ہمارے پاس آکر بنا دو۔ کچھ ہم زبانی بھی کہینگے۔ اُستاد نے میر مشاعرہ کو پاس بلایا۔ اور حال سنایا۔ اُنہوں نے کہا۔ آپکی غزل نہ ہوئی تو مشاعرہ ہو چکا۔ آپ پڑھکر جائیے۔ غرض جو غزل پیش تھی ختم ہوئی۔ میر مشاعرہ نے اُستاد کی ایما سے خاص خاص اشخاص سے کہ بھی دیا۔ اور طمع سامنے لاکر رکھدی۔ کہ آپ غزل پڑھئے۔ اُستاد نے غزل پڑھی بڑی تعریفیں ہوئیں۔ یہ اُدھر رخصت ہو کر حضور میں گئے۔ اِدھر مشاعرہ برہم ہو گیا۔ ہر شخص یہ کہکر اُٹھ گیا جو سُنا تھا سن لیا۔ اب چلو اور سو رہو۔ مگر کہنے والوں نے یہ بھی کہا کہ میاں یہ تو ایک فقرہ تھا۔ وزن شعر کیلئے! بلانا کہاں تھا۔ اور جانا کہاں تھا؟

[1] بادشاہی نعم جو بطور خدمتگار کے دربار کرتے تھے۔ خواص کہلاتے تھے دیکھو! جمع کا صیغہ ہے۔ مگر ادائین دربار کی زبانوں۔ اور دفتر کے کاغذوں میں بننے واحد مستعمل تھا۔

اتفاق تقدیر دیکھو کہ مشاعرہ کو سالہا سال گذر گئے۔ دلی تباہ ہو گئی۔ اب ۱۸۸۲ء میں مجھے کار سرکار کیلئے راولپنڈی میں جا کر کئی مہینے رہنا ہوا۔ وہاں میر وصیت علی نام ایک پیر کہن سال سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے دلی کے پرانے مدرسہ میں تعلیم پائی تھی۔ اور والد مرحوم سے بھی پڑھا ہوا تھا۔ انہیں جو یہاں میرا حال معلوم ہوا۔ تو مکرر بہت خوش ہوئے۔ اکثر آتے تھے۔ اور وقتوں کے حال کہانیوں کی طرح سناتے تھے میں کسی حال میں ہوں کام سے کام تھا۔ اس مشاعرہ کا بھی ذکر آیا۔ انہوں نے ماجرائے مذکور من و عن بیان کیا۔ اور کہا کہ بھئی تمہارے والد مرحوم کے سبب سے ہم بھی ہمراہیوں میں تھے۔ حضور کا طلب فرمانا۔ اور استاد کا جانا واقعی سبب تھا اور اہل مشاعرہ نے اسوقت کہا بھی تھا۔ مگر نہیں! بدگمانی تھی۔ ہمیں خوب معلوم ہے۔ ہم تو اہل راز میں تھے۔ اس وقت مجھے پھر تحقیق ہوا۔ کہ لوگ ان کی سیدھی بات کو بھی اُلٹا سمجھتے تھے۔ اور ستم دیکھاتے تھے۔ اللھم اغفر وارحم غزل مذکور یہ ہے۔

تیرے کوچہ کو وہ بیمارِ غم دارالشفا سمجھے	اجل کو جو طبیب اور مرگ کو اپنی دوا سمجھے
نگہ کیا اور مژہ کیا ہم تو دونو کو بلا سمجھے	اسے تیر قضا۔ اُس کو پرِ تیر قضا سمجھے
غلط فہمی ہماری تھی جو اُن کو آشنا سمجھے	ہم اُنکو دیکھو کیا سمجھے تھے اور وہ ہمکو کیا سمجھے
شہیدانِ محبت خوب آئینِ وفا سمجھے	بہا خوں کوئے قاتل میں اسی کو خوں بہا سمجھے
وہی کچھ تلخکامِ اس زندگانی کا مزا سمجھے	کہ جو زہراب تیغ یار کو آبِ بقا سمجھے
ہر اک گردش میں سو انداز نازِ فتنہ زا سمجھے	فلک کو ہم کسی کافر کی چشمِ سرمہ سا سمجھے
ستم کو ہم کرم سمجھے۔ جفا کو ہم وفا سمجھے	اور اسپہ بھی نہ سمجھے تو اُس بت سے خدا سمجھے

برائی میں ہماری گر وہ کچھ اپنا بھلا سمجھے
بُرا سمجھے بُرا سمجھے بُرا سمجھے بُرا سمجھے

تجھے اے سنگدل آرام جاں مفتِ بلا سمجھے
پڑیں پتھر سمجھ پر اپنی ہم سمجھے تو کیا سمجھے

وہ ہم سے خاکساروں کو گرا اپنا خاک پا سمجھے
ہم اپنی خاکساری اپنے حق میں کیمیا سمجھے

جو کچھ دلپر گذرتی ہے سنائیں گے ہم اُس بُت کو
خدا جانے کہیں کیا ہم پہ اپنے دل میں کیا سمجھے

تیرے کشتے جو یوں خوابِ عدم سے یک بیک چونکے
مگر شورِ قیامت کو تری آوازِ پا سمجھے ۔

نسیم صبحِ گلشن میں اگر ہووے دمِ عیسےٰ
ترا بیمارِ غم تجھ بن سمومِ جانگزا سمجھے

کہو بلبل سے چلتا کارواں ہے گھتِ گل کا
چمن بادِ صبا سمجھے کہ آوازِ درا سمجھے

نگاہِ لطف اُنکی جب بازآئی تغافل سے
ہم اُسکی نارسائی اپنا بختِ نارسا سمجھے

حسابِ اصلا نہ پوچھے مجھ سے میرے دکے زخموں کا
حسابِ دوستاں در دل اگر وہ دلربا سمجھے

اگر دل کو نکالا چیر کر پیکاں تو رہنے دو
کہ عاشق اپنے پہلو میں اسی کو دلکی جا سمجھے

کرے آہ رسا میری جو سیرِ عالمِ بالا
تو سینہ کو فلک کے آبلہ سا زیر پا سمجھے

حکایت دل کی کہتا ہوں سمجھتے ہو شکایت ہے
تمہی سمجھو ذرا دل میں کہ سمجھے بھی تو کیا سمجھے

ہنسے ہے زخمِ دل تدبیر پر جراح کے کہدو
انہیں ٹانکے نہ سمجھے خندۂ دنداں نما سمجھے

ہوا جب گرمیٔ الفت سے رام اس دل شکن کا دل
تو اسکے دل شکستہ اپنے حق میں مومیا سمجھے

عدو آیا ہے بن کر نامہ بر لکھا نصیبوں کا
کرینگے لیکے خط کیا مدعی سے ۔ مدعا سمجھے

مجھے آتا ہے شک اس رندِ مے آشام پر ساقی !
نہ جو دعِ ما کدر جانے نہ جو خندِ ما صفا سمجھے

نہ آیا خاک بھی سنتہ سمجھ میں عمرِ رفتہ کا
مگر سمجھے تو داغِ معصیت کو نقشِ پا سمجھے

خبر سنتے ہی قاصد کے ہوئے ہم بے خبر بالکل
ترے پیغام کو گویا کہ پیغامِ قضا سمجھے

لہ جب اس شعر پر پہنچے تو غالب مرحوم سے کہا مرزا صاحب ! یہ آپکے مذاق کا شعر ہے ۔ وہ بھی خوش ہونے اور تعریف کی ۱۲

نحوست بھی سعادت ہو گئی سودے میں زلفوں کے
گلیم تیرہ بختی سر پہ ہم مثل ہما سمجھے

کشادِ کار ہم نے پنجۂ تقدیر کو سونپا
خرد کے تیز ناخن۔ ناخنِ انگشت پا سمجھے

بلا اُس زلف کے مصرع میں ہے مضمونِ پیچیدہ
اُسی سے یہ کھلے جو معنیٔ ناز و ادا سمجھے۔

ہوا نے زلف کو چھیڑا۔ اور اپنا دم الجھتا ہے
کہیں ایسا نہ ہووے ہم سے وہ کافر ادا سمجھے

سمجھ ہی میں نہیں آتی ہے کوئی بات ذوق اُس کی
کوئی جانے تو کیا جانے۔ کوئی سمجھے تو کیا سمجھے

کہاں تلک کہوں ساقی کہ لا شراب تو دے
نہ دے شراب پر کر کوئی کباب تو دے

بجھا تا گریہ ہے گر سوزِ دل کو آب تو دے
اور آگ میں یونہی دینا ہے گر عذاب تو دے

الٰہی چشم کے چشمہ کو اتنا آب تو دے
کہ سر پہ چرخ بھی دکھلائی جوں حباب تو دے

کھلے ہے نازسے گلشن میں غنچۂ نرگس +
ذرا دکھا اسے تو چشمِ نیمخواب تو دے

دلِ برشتہ کو میرے نہ چھوڑ اے میخوار
جو لذت اس میں ہے ایسا مزا شراب تو دے

کہاں بجھی ہے یہ خاک میری آتشِ دل
کہو ہوا سے ہلا دامنِ سحاب تو دے

تمہارے مطلعِ ابرو پہ خال کہتا ہے
کہ ایسا نقطہ کوئی وقت انتخاب تو دے

درِ قبول ہے دربان نہ بند کر دیار
دعائے خیر ذرا ہونے مستجاب تو دے

صبا! بگولہ بنے کشتگانِ زلف کی خاک
کہ بعد مرگ بھی معلوم پیچ و تاب تو دے

شہید کرتا ہے قاتل تو پھر ہے جلدی کیا
ذرا ٹھہر نے تہ تیغ اضطراب تو دے

بلا سے آپ نہ آئیں پر آدمی ان کا
تسلی آ کے مجھے وقتِ اضطراب تو دے

شکارِ بستۂ فتراک کو ترے مقدور
ہوا نہ یہ بھی کہ بوسہ سرِ رکاب تو دے

نشہ میں ہوش کسے جو گنے حساب کرے
جو تجھ کو دینے ہوں بوسہ بلا حساب تو دے

زبان خنجر قاتل نے کیا کہا تجھ سے
دل شہید تو چپ کیوں ہے کچھ جواب تو دے

جواب نامہ نہیں گر تو رکھدو نامۂ یار
جو پوچھیں قبر میں عاشق سے کچھ جواب تو دے

ہماری آنکھ سے ہم چشم ہوگا کیا دریا
کسی کو بھر کے ذرا کاسۂ حباب تو دے

بلا سے کم نہ ہو گریہ سے میرا سوز جگر
بجھا پر اُنکی ذرا آتش عتاب تو دے

خنک دلوں کی اگر مشت خاک دوزخ میں
پڑے تو واقعی ایکبار آگ داب تو دے

کریگا قتل وہ اے ذوق مجھکو سرمہ سے
نگہ کی تیغ کو ہونے سیاہ تاب تو دے

پہنچ رہوگا سر منزل فنا اے **ذوق**
مثال نقش قدم کرنے پا تراب تو دے

کب حق پرست زاہد جنت پرست ہے
حوروں پہ مر رہا ہے یہ شہوت پرست ہے

دل صاف ہو تو چاہئے معنے پرست ہو
آئینہ خاک صاف ہے صورت پرست ہے

درویش ہے وہی جو ریاضت میں چست ہو
تارک نہیں فقیر بھی راحت پرست ہے

جز زلف سوجھتا نہیں اے مرغ دل تجھے
خفاش تو نہیں ہے کہ ظلمت پرست ہے؟

دولت کی رکھ نہ مار سر گنج سے امید
مفوی وہ دبکا کیا کہ جو دولت پرست ہے

عنقا نشاں چھپا کے ہے بیٹھا بہائے نام
گم گشتہ کون کہتا ہے شہرت پرست ہے

یہ **ذوق** مے پرست ہے یا ہے صنم پرست
کچھ ہے - بلا سے - لیک محبت پرست ہے

زخم دل پر میرے کیوں مرہم کا استعمال ہے
مشک اگر مہنگا ہے تو کیا لون کا بھی کال ہے

قبر میں عاشق جو تیرا مضطرب احوال ہے
لوح بالیں پر بھی لکھا سورۂ زلزال ہے

عشق کو گر استخواں پر میرے قصد وصال ہے
جوش داغ دل ہجوم نقطہ رمال ہے

اب تو جانِ ناتواں کا ضعف سے یہ حال ہے
لب تلک بھی لیکو آجانا رہ صد سال ہے

ہمنے جانا تھا کہ تم ہو گے خفا ہم پر بہت
لیکن اب دیکھا سو بیدادئے دل پامال ہے

ابر برسوں رو چکا پر سوز غم سے اب تلک
خاک میرے ڈھیر کی اڑنے میں جیسے لال ہے

میرے دود آہ سے یہانتک زمانہ ہے سیاہ
آفتاب آسماں زنگی کے مُنہ کا خال ہے

ہیں وہ مجنوں ہوں کہ میرا کاغذ تصویر بھی
مثل عیدی باعث خوشنودئی اطفال ہے

جب سے ہے دل میں کسی کی نوک مژگاں کا خیال
نشتر زنبور ہے تن پر میرے جو بال ہے

جوش گریہ کا میرے تم کچھ نہ پوچھو ماجرا
چادر آب رواں منہ پر میرے رومال ہے

دل پہ ہو گر داغ سوزاں عشق میں اے کوہکن
پھر تو نشتر کا بھی گنج سوختہ کیا مال ہے

گھاؤں میں بیڑا جو اُس بن کیجو کندہ دل کٹے نہو
جو رگ پاں ہے وہ مجھکو شیر کا سا بال ہے

ہیں جہاں مدفن تمہارے کشتگان ناز کے
نخل کی جا بید مجنوں ہے وہاں یا جال ہے

شوخی قاتل کرے آلودہ کیوں مُنہ پان سے
خون اعجاز مسیحا سے لب اُسکا لال ہے

فندقوں سے کسکی دل خوں تھا کہ میری خاک پر
نوک برگ سبزہ جوں منقار طوطی لال ہے

اسکی ٹھوکر کا ہوں دیوانہ کہ جسکے پا نو نیں
گردش رنگ پری سے حلقہ خلخال ہے

آئے وہ شاید عیادت کو کہ باصد ضعف حال
آئی مژگاں تک نظر بھی بہر استقبال ہے

وادئی وحشت میں بھی جا کر نہ دل اپنا کھلا
پنجۂ مژگان آہو شیر کا چنگال ہے

دل میں شکل یار کب آئے نظر اے اضطراب
دیکھ لو سیماب بن آئینہ بے تمثال ہے

بسکہ ہے نوروز اپنا آفتاب بادہ سے
دور ساغر ہمکو ساقی گردش یکسال ہے

پوچھتے کیا ہو شکست دل کو صورت دیکھ لو
نامہ ہے پیس بر جبیں قاصد شکستہ حال ہے

یار عشق اُس گل کا سر پر رکھ لیا جو ہو سو ہو
اب کسے پروا ہے سودا ہے کہ ایک مثقال ہے

* وہ وہاں جہاں تمہارے کشتگان ناز کے

غم نہیں صیاد کو دے نہ میری پر یا دے
ہے قفس تو سینہ چاک اور دل مشبک خال ہے

کھل گیا مضمونِ شکستِ دل کا بے خط کے کھلے
نامہ بر کا اسقدر اپنے شکستہ حال ہے

ہے اسیرانِ محبت کی بلا سینہ میں آگ
شعلۂ جوالہ ساں طوق گلو تک لال ہے

ہوتے ہیں اعضائے بوسیدہ تصور سے جدا
کھینچنی تصویر مجنوں کی ترے اشکال ہے

روز محشر کئی دن دیکھنے کو چاہئیں
گر یہی اے ذوق طولِ نامۂ اعمال ہے

فرماتے تھے کہ جوانی کا عالم تھا اور طبیعت میں جوش۔ وہی دن تھے کہ مدرسۂ غازی الدین خاں کے وسیع کوٹھے پر مشاعرے ہوتے تھے۔ نواب امیر خاں سرکار انگریز سے عہد نامہ کے لئے دہلی میں آئے۔ شہر کے لوگ دیکھنے کو دوڑے کہ باہر ڈیرے کا لشکر پڑا ہے۔ ہم بھی مدرسہ میں گئے۔ تمہارے والد وہیں تھے کوٹھے پر جا بیٹھے۔ دور تک خیمے ہی خیمے نظر آتے تھے۔ ہم نے حسب حال یہ غزل کہی کئی دن کے بعد مشاعرہ ہوا۔ لشکر کے لوگ مسجد مدرسہ میں نماز پڑھنے آیا کرتے تھے انہیں بھی مشاعرہ کی خبر ہوئی کہ رات کو جلسہ ہے۔ سب آئے۔ دوستوں کی فرمایش سے ہم نے یہ غزل بھی پڑھی۔ بیچارے برسوں صحرانوردی میں تھے۔ اور اسلام کے نام سے ہر کام کرتے تھے۔ اب خط صلح میں آکر اُسے چھوڑنا تھا۔ سب دل شکستہ تھے اکثر اشعار غزل کے اُن کی صورت حال دکھاتے تھے۔ بڑی تعریفیں ہوئیں۔ اور ۵ والے شعر پر تو اللہ اللہ خوب غلغلے اور ولولے ہوئے بات نہ سُنائی دیتی تھی۔

موئے سر ماران سیہ کا ایک سراسر لشکر ہے
مانگ جو ہے ایک مار سفید اس لشکر کا سر لشکر ہے

آبلہ ہائے سینہ جو خیمہ سے دکھائی دیتے ہیں
مزرع دل پر میرے پڑا کیا غم کا آکر لشکر ہے
ہووے دل مظلوم ہمارا کیوں نہ شہیدِ دشت بلا
در پے اس کے شامیوں کا وہ زلف معنبر لشکر ہے
دیویں موذی زحمت کش کو کیونکہ نہ ایذا جمع ضعیف
دشمن مارِ زخم رسیدہ مور کا اکثر لشکر ہے
کعبہ توبہ خدا ہی رکھے آج۔ کہ جوش ابر نہیں
ایک اصحاب الفیل کا سایہ دوش ہوا پر لشکر ہے
میں وہ شاہ کشور غم ہوں یارو جسکے ساتھ سدا
فوجیں اشک کی موجیں ہیں اور بہتا سمندر لشکر ہے
گاہ ہجوم یاس میں ہے دل۔ گاہ ہجوم حسرت میں
ہے یہ مرد سپاہی پیشہ پھرتا لشکر لشکر ہے۔
خالِ چشمِ جاناں کا مژگاں سے تجمل دیکھو تو۔
اُترا پشت پہ ماہی کی کیا پے کے سکندر لشکر ہے
ہووے امام برحق پیدا ذوق اگر تو دیکھ ابھی
ہونا گرد اسلامیوں کا جوں سُبحہ گوہر لشکر ہے

میری عمر کستر اُڑی تھی اُس سے گردوں سب بنے
اسمیں کچھ اخگر بھی باقی تھے سو وہ کوکب بنے
دل کو رکھدوں اُس دم شمشیر پر گر ڈھب بنے
تا یہ قربانی صراط عشق پر مرکب بنے
خال اے خورشید رو رُخ پر تمہارے کب بنے
تیرہ روز اگر اُفق پہ سوختہ کوکب بنے

کیونکہ تعلیم نیاز و ناز ہو یکجا بہم
کر نہ مجنوں آنکر لیلی کا شہ مکتب بنے

غنچہ تصویر بھی کھلکر جو عقدے وا نہوں
ہائے قسمت وہ ہمارے عقدۂ مطلب بنے

ہے سیاہ کاری سے نامہ یہاں تلک اپنا سیاہ
روز محشر پر پڑے گر سایہ اسکا شب بنے

سرمۂ چشم کو اب کیوں بنا لے دود آہ
ایسا کاجل بن کہ جس سے اسکا خال لب بنے

صحبت عیسےٰ بنائیں کیا گدھے کو آدمی
جسکے جوہر میں ہو نادانی وہ انساں کب بنے

مٹویوں کو تخ دے آنکھیں کتالا دیں بلا
عین حکمت تھی کہ معدوم البصر عقرب بنے

عشق ہے اے ذوق وہ کافر کہ جسکے ہاتھ سے
شیخ صنعاں سا مسلماں رند بدمشرب بنے

لیتے ہی دل جو عاشق دل سوز کا چلے
تم آگ لینے آئے تھے کیا آئے کیا چلے

تم چشم سرمہ گیں کو جو اپنے دکھا چلے
بیٹھے بٹھائے خاک میں ہم کو ملا چلے

دیوانہ آکے آدر بھی دل کو بنا چلے
اک دم تو ٹھیرو آدر کہ کیا آئے کیا چلے

ہم لطف سیر باغ جہاں۔ خاک اڑا چلے
شوق وصال دلمیں لئے یار کا چلے

غیروں کے ساتھ چھوڑ کے تم نقش پا چلے
کیا خوب پھول گور پہ میری چڑھا چلے

دکھلا کے مجھکو نرگس بیمار کیا چلے
آوارہ مثل آہوئے صحرا بنا چلے

اے غم! مجھے تمام شب ہجر میں نہ کھا
رہنے دے کچھ کہ صبح کا بھی ناشتا چلے

بل بے غرور حسن زمیں پر نہ رکھے پانو
مانند آفتاب وہ بے نقش پا چلے

کیا لے چلے گی سے تری ہم۔ کہ جوں نسیم
آئے تھے سر پہ خاک اڑانے اڑا چلے

افسوس ہے کہ سایۂ مرغ ہوا کی طرح
ہم جسکے ساتھ ساتھ چلے وہ جدا چلے

قاتل جو تیرے دل میں رکاوٹ نہو۔ تو کیوں
رک رک کے میرے حلق پہ خنجر ترا چلے

ہے گل کا دل تو سنبل پیچاں کے دام میں
کیا اُڑ کے تجھ سے طائرِ نکہت بھلا چلے

ہو کر سوار تو سنِ عمرِ رواں پہ آہ +
ہم اس سے دہر میں کیا آئے کیا چلے

لبریز ہو گیا مرا شاید کہ جامِ عمر
تم وقتِ نزع مجھ سے جو ہو کر خفا چلے

سمجھا میں زلفیں کیا لبِ دریا پہ آپنے
ہر موج مثلِ مارِ سیہ تم بنا چلے

دنیا میں جب سے آئے۔ رہا عشق گل خلل
ہم اس جہاں میں مثلِ صبا خاک اڑا چلے

قاتل سے دخل کیا ہے کہ جانبر ہو اپنا ہوش
گر اڑ کے مثلِ طائرِ رنگِ حنا چلے

فکرِ قناعت اُنکو میسر ہوئی کہاں
دنیا سے دل لیے لے کے جو حرص و ہوا چلے

آلودہ سرمہ سے نہ ہوئی چشم میں نگاہ
دیکھا جہاں سے صاف ہی اہلِ صفا چلے

کیا دیکھتا ہے ہاتھ مرا چھوڑ دے طبیب
یہاں جان ہی بدن میں نہیں نبض کیا چلے

جائیں تیرے کشتہ کو جنت میں بھی اگر
پھر پھر کے تیرے گھر کی طرف دیکھتا چلے

اُس روئے آتشیں کے تصور میں یا ذلف
ہے کیا غضب کہ آگ لگے اور ہوا چلے

اے ذوق ہے غضب نگہ یار الحفیظ
وہ کیا بچے کہ جسپہ یہ تیر قضا چلے

اُستاد کا قاعدہ تھا کہ وضو کے بعد ایک لوٹے پانی سے برابر کلیاں کرتے تھے۔ بچپن میں دیکھا کرتا تھا۔ تو ہنسی آتی تھی۔ جب بڑا ہوا تو ایک دن میں نے سبب پوچھا۔ فرمایا۔ دیکھتے ہو زبان سے کیا کیا نکل جاتا ہے؟ خیر یہ بھی ایک بات ہے۔ پھر ذرا تامل کیا اور یہ مطلع پڑھا۔ میں نے لکھ لیا۔ اُسدن تو مطلع ہی طلوع ہوا۔ پھر غزل ہو گئی۔

پاک رکھ اپنا دہاں ذکر خدائے پاک سے
کم نہیں ہرگز زباں منہ میں ترے مسواک سے

جب بنی تیرِ حوادث کی کماں افلاک سے
خاکہ کا تودہ بنا انساں کی مشتِ خاک سے

جس طرح دیکھے قفس سے باغ کو مرغ اسیر
جھانکتا ہے دل تجھے یوں سینۂ صد چاک سے

تیرے صیدِ نیم جاں کی جان نکلے کس طرح
یہ تو وابستہ ہے تیرے دامنِ فتراک سے

بیٹھا دوزخ میں بہارِ خلد کی دیکھا کروں
واں کی آتش ہو جو اُن کے روئے آتشناک سے

آفتابِ حشر ہے یا رب کب نکلا گرم گرم
اشک خونیں دل جلوں کے دیدۂ نمناک سے

چشم کو بے پردہ ہو کس طرح نظارہ نصیب
کرتا وہ پردہ نشیں پردہ تو ہے ادراک سے

بیت ساقی نامہ کی لکھو کوئی جا سے دعا
مے پرستوں کے کفن پر کلکِ چوبِ تاک سے

عیبِ ذاتی کو چھپائے گا نہ حسنِ عارضی
زیبِ بدانداز کو ہو ذوقِ کیا پوشاک سے

الگ تا ہو کھچ کھچکر مرا ہر تار دامن سے
نہ دامن خار سے چھوٹے نہ چھوٹے خار دامن سے

خبر لوں جیب کی یا میں ہوں ہشیار دامن سے
جنوں الجھے ہیں ناخن جیب سے اور خار دامن سے

لگی ہے اس تمنا میں مرے ہر خار دامن سے
کروں ستار میں گر ہو عطا اک تار دامن سے

لگے اس شعلہ خو کے کون مجھ سا زار دامن سے
کہیں الجھا ہے اب تک برق کے بھی چار دامن سے

کرے گرد ہوتے دھوتے تو جدا ہر تار دامن سے
نہ چھوٹے خون میرا تیرے اے خونخوار دامن سے

کیا تو نے کنارہ ہم سے اور ہاتھوں سے وحشت کے
گریباں ہکنار آکر ہوا اے یار دامن سے

تمہارے جلوۂ رخ کے جو بسمل خاک پر لوٹیں
تو پریاں آکے پونچھیں لے پری خسار دامن سے

ہوا بے پردہ وہ پردہ نشیں تو یوں کیا پردہ
بنا یاد دریاں ایک پردہ دیوار دامن سے

وہی پیا ہے اس کے واسطے جو قطع ہے اُس پر
نکل سکتا ہے کوئی آستیں کا کار دامن سے

ابا نکوشش جہت میں ہفت دریا لوگ کہتے ہیں
گرے تھے اشک کے قطرے مرے دو چار دامن سے

مکدر ہو جو مل کیا جو نادانستہ لگ جاوے
ذرا آکر نسیم دامن گلزار دامن سے

جدا گر سر ہو تن سے اور جدا ہوں ہاتھ شانے سے
جدا ہو پر ہاتھ اپنا ترے اے یار دامن سے

ترا مجنوں زرا مانا گراں جاں ہے اٹھنے دے
لپٹ جائے اگر صرصر کے مثل خار دامن سے

پھروں کھینچے ہوئے کو سو نہیں اپنے پہ وحشت میں
ذرا تم باندھ دیکھو دامن کہسار دامن سے

جلینگے آتش رنگ حنائے پا سے گھر کتنے
دکھائینگے ادا جب گرمی رفتار دامن سے

دکھائے صدمۂ زنجیر نے یہ پا نو مجنوں کے
کہ صدمہ دل پہ ہوتا ہے دم رفتار دامن سے

عزیز اصلا نہیں سرمایہ ہمت کو کہ دریا نے
گرہ دیکر نہ باندھا گوہر شہوار دامن سے

مربی بھی خلش گر کو نہیں دیتے ہیں آرائش
گلستاں پونچھتا ہے کب بنان خار دامن سے

سرایت کو ہکن کا خوں اگر کر جائے پتھر میں
نکالے لعل ہی پتھر کی جا کہسار دامن سے

فرشتے تیری دامن کو بنائیں جانماز اپنی
اگر دھو ڈالے تو داغ مے پندار دامن سے

مرے پانو کے چھالے ہچکچے ہیں کیا کیا شکستہ دل
جو کوئی ٹوٹ جاتا ہے الجھکر خار دامن سے

مرا آنسو ہے وہ زہراب نیلا ہو بدن سارا
خدا نا کردہ لگ جائے گر اے غمخوار دامن سے

ترے مجنوں کو ہے وہ جامۂ عریاں تنی زیبا
کہ جسکو آستیں سے ننگ ہے اور عار دامن سے

یہ تجھبن انکساری ہے کہ آنسو پونچھنا ہو نہیں
کبھی تو آستیں سے اور کبھی اے یار دامن سے

کہاں وہ موسم طفلی کہ جب دامن سوار و نہیں
تھے ہم تیار کرتے تو سن رہوار دامن سے

مرا وہ گریۂ غم خندۂ عشرت سے بہتر ہو
اگر آنسو مرے پونچھے وہ گل رخسار دامن سے

ہیں وہ آلودۂ دامن ہوں بنائیں تا رسجہ کا
فرشتے پاکدامن لیکے میرے تار دامن سے

یہ صید ناتواں مثل پر افتادہ اڑ جائے
لگالے گر نسیم دامن کہسار دامن سے

ہوا پنکھے کی خواب آور ہے پر ایک خلش میں
کریں سو فتنۂ خوابیدہ کو بیدار دامن سے

نگاہ بلہوس آندھی ہے تیرے خاک اڑانیکو
چھپالے اے پری رو شعلۂ رخسار دامن سے

نہ ہوگی دل جلونکی ذوق ہمسایوں سے دلدہی
کہ کب فانوس پونچھے شمع کا رخسار دامن سے

ہوں لا یعنی جھک کے قامت ایک خس کے بوجھ سے
ہے کباب وہ جو پکا جائے نفس کے بوجھ سے

تھا قد رعنا کبھی پر اب ہوس کے بوجھ سے
جھلملاتا سا ہے شعلہ ایک نفس کے بوجھ سے

بدنصیبی سے مری اُس بام پر ٹوٹی کمند
ورنہ میں کیا وہ نہ ٹوٹے مجھ سے کس کے بوجھ سے

شاخ گل کیا مال ہے گر ہم گراں جانی پہ آئیں
توڑ دے لوہے کے حلقہ کو قفس کے بوجھ سے

مت لگا اے عشق دل کے آبلہ پر نقش غم
ٹوٹ جائیگا یہ گنبد اس کلس کے بوجھ سے

سر جھکاتے ہیں وہ آزاد اپنا کب مانند سرو
ہے سبکباری جنہیں ما رہوس کے بوجھ سے

یا سیری ہیں گراں خاطر ہوں میں جاتا ہے ٹوٹ
آہنی قلاب بھی میرے قفس کے بوجھ سے

زندہ تو ڈوبے ہے اور تیرے ہی وہ آب میں
بوجھ شاید جسم کا کم ہے نفس کے بوجھ سے

باندھ دے ناقہ کی گردن میں دل نالان قیس
لیلی۔ اسکا بوجھ ہلکا ہے جرس کے بوجھ سے

نکلے دنیا سے کہاں احمق اٹھا کر بار حرص
یہ گدھا تو رہگیا دلدل میں پھنس کے بوجھ سے

اپنے دامن میں نہ لے میری گل لخت جگر
جی دھڑکتا ہے کہیں حوصلہ مسکے بوجھ سے

کیا ہوا دل نے لیا گر ایک کوہ غم اٹھا
یہ نہیں اے ذوق دبتا ایسے دس کے بوجھ سے

سر بوقت ذبح اپنا۔ اُس کے زیر پا ہے
یہ نصیب۔ اللہ اکبر۔ لوٹنے کی جا ہے

رخصت اے زنداں! جنوں زنجیر رکھ کاے ہے
مژدہ خار دشت پھر تلوا مرا کھجلائے ہے

واہ داشور محبت خوب ہی چھڑکا نمک
استخواں میرے ہما کس کس مزہ سے کھائے ہے

دم کی ہے سینہ میں آکر ضعف سے یہ گفتگو
دیکھئے لب تک خدا کس طرح سے پہنچائے ہے

بس کہ مم سوزِ دروں بھن جائینگے دل اور جگر
رحم جوش گریہ چھاتی پھر ابھی بھر آئے ہے

بل بے استغنا کہ وہ یہاں آتے آتے رہگئے
اُف رے بیتابی۔ کہ یہاں تو دم ہی نکلا جائے ہے

نزع میں بھی ذوق کو تیرا ہی بس ہے انتظار
جانب در دیکھ لے ہے جبکہ ہوش آجائے ہے

زخمی ہوں ترے ناوک دزدیدہ نظر سے
جانیکا نہیں چور مرے زخم جگر سے

ہم خوب ہیں واقف ترے انداز کمر سے
یہ تار نکلتا ہے کوئی دل کے گہر سے

گر اب کے پھرے جیتے وہ کعبہ کے سفر سے
تو جانو پھرے شیخ جی اللہ کے گھر سے

لبریز مئے صاف سے ہو جام بلوریں
زمزم سے ہے مطلب نہ صفا سے نہ حجر سے

سرمایۂ امید ہے کیا پاس ہمارے
ایک آہ ہے سینہ میں سو نومید اثر سے

وہ خلق سے پیش آتے ہیں جو فیض رساں ہیں
ہیں شاخ ثمردار میں گل پہلے ثمر سے

حاضر ہیں مرے توسن وحشت کے جلو میں
باندھے ہوئے کہسار بھی دامن کو کمر سے

فریاد ستمکش ہے وہ شمشیر کشیدہ
جس کا نہ رکے وار فلک کی بھی سپر سے

اشکوں میں جو ہیں بہ کے چلے ہم بہ سوئے دوست
مقصود رہ کعبہ ہے دریا کے سفر سے

اللہ رے وحشت کہ مری ٹھوکروں ہی میں
پتھر ہیں پہاڑوں کے اڑے جاتے شرر سے

کچھ رحمت باری سے نہیں دور کہ ساقی
رو دیں جو ذرا مست تو مے ابر برسے

کشتہ ہوں میں کس چشم سیہ مست کا یارب
مستی ہے ٹپکتی مری تربت کے شجر سے

کھلتا نہیں دل بند ہی رہتا ہے ہمیشہ
کیا جانے کہ آجاتا ہے تو اس میں کدھر سے

نالوں کے اثر سے مرے پھوٹا سا ہے بکتا
کیوں ریم سدا نکلے نہ آہن کے جگر سے

اے ذوق رہ عشق میں ہے خضر و مسیحا
ہم دم جو نکل آئے کوئی گرد سفر سے

آیا نہ وہ مطلع ۔ کیا دیر لگائی ہے
کھینچ اے کشش الفت ۔ کیا دیر لگائی ہے

قاصد تو کب آتا ہے۔ پر پیک اجل نے بھی
یہاں آنے میں یا قسمت کیا دیر لگائی ہے

آنکھوں میں ہے دم تیرے بیمار محبت کا
دکھلا دے کہیں صورت کیا دیر لگائی ہے

آنا بھی کہیں تیرا آنا ہے قیامت کا
اے دلبر خوش قامت کیا دیر لگائی ہے

پروانہ سے کہتی ہے یہ شمع کہیں جل چک
ہے تجھ میں اگر جرات کیا دیر لگائی ہے

کس فکر میں ہے ساقی دے بادہ جو ہو باقی
تھوڑی ہے یہاں فرصت کیا دیر لگائی ہے

ہے تیغ بکف قاتل تم مرنے پہ جا نباز وا
باندھو کمر ہمت کیا دیر لگائی ہے

گر قتل ہی کرنا ہے۔ قاتل کہیں کر جلدی
لاحول ولا قوت کیا دیر لگائی ہے

یہاں وعدہ بھی آ پہنچا۔ تو اب تلک آتا ہے
اللہ رے تری غفلت کیا دیر لگائی ہے

بے بادہ گلستاں میں۔ پیتے ہیں لہو میکش
ساقی نے دم عشرت کیا دیر لگائی ہے

دے پھونک کہیں دل کو مدت سے سلگتا ہے
اے سوز غم فرقت کیا دیر لگائی ہے

بالیں پہ کہا میری۔ ہنگامہ محشر نے
لو اٹھو کہیں حضرت کیا دیر لگائی ہے

اس کی لب خنجر کا۔ لینا ہے اگر بوسہ
تو لے دل پر حسرت کیا دیر لگائی ہے

اے ذوق شہید اسکو۔ کرتے ہیں کئی عاشق
کرتے ہو اگر سبقت۔ کیا دیر لگائی ہے

خوب رو کا شکایتوں سے مجھے۔ تو نے مارا عنایتوں سے مجھے

کیا کہوں کہ رہے ہیں کیا کیا کچھ۔ غیر تیری حمایتوں سے مجھے

بات قسمت کی ہے کہ لکھتے ہیں۔ خط وہ کن کن کنایتوں سے مجھے

واجب القتل اس نے ٹھیرایا۔ آیتوں سے۔ روایتوں سے مجھے

حال مہر و وفا کہوں تو کہیں۔ نہیں شوق ان حکایتوں سے مجھے

دیکھو صفحہ ۲۱۰

سمجھے ہے واجب الرعایت دوست | دشمنوں کی رعایتوں سے مجھے
کہدو اُنکو سے کیوں ہو کرتے کمی | شوق کم ہے کفایتوں سے مجھے
کئی گریہ نے جلا دیا دل | ہوا نقصاں کفایتوں سے مجھے

لے گئی عشق کی بدایت ذوق
اُس سے سب نہایتوں سے مجھے +

الٰہی کس بے گنہ کو مارا سمجھ کے قاتل نے کشتنی ہے
کہ آج کوچہ میں اس کے شورِ بِاَیِّ ذَنْبٍ قُتِلْتَنِیْ ہے
غمِ جدائی میں تیری ظالم - کہوں میں کیا - مجھ پہ کیا بنی ہے
جگر گدازی ہے سینہ کاوی ہے - دلخراشی ہے - جانکنی ہے
زمیں پہ نورِ قمر کے گرنے میں صاف اظہارِ روشنی ہے
کہ ہیں جو روشن ضمیر اُن کا فروغ اُن کی فروتنی ہے
بشر جو اس تیرہ خاکداں میں پڑا - یہ اس کی فروتنی ہے
وگرنہ قندیلِ عرش میں بھی اسی کے جلوہ کی روشنی ہے
ہوئے ہیں تر گریۂ ندامت سے اس قدر آستین دامن
کہ میری تر دامنی کے آگے عرق عرق پاک دامنی ہے
ہوئے ہیں اس اپنی سادگی سے - ہم آشنا جنگ و آشتی سے

حاشیہ صفحہ (۲۰۹) لہ مثنوی مہر و وفا - فارسی میں ایک عمدہ مثنوی ہے - پہلے زلیخا - بوستان سکندر نامہ کی طرح تعلیم میں داخل تھی - اب اس کا رواج نہیں رہا - یہ اُسی کی طرف اشارہ ہے کون سمجھتا ہے اب ان شاروں کو - خواجہ حافظ نے بھی کہا ہے ؎

ماقصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم — از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

اگر نہ ہو یہ تو پھر کسی سے ۔ نہ دوستی ہے نہ دشمنی ہے

لگا نہ اس تبکدہ میں تو دل ۔ یہ ہے طلسمِ شکست غافل
کہ کیسا ہی کوئی خوش شمایل صنم ہے آخر شکستنی ہے

نہیں ہے قانع کو خواہشِ زر ۔ وہ مفلسی میں بھی ہے تونگر
جہاں میں مانندِ کیمیا گر ۔ ہمیشہ محتاج و دل غنی ہے

کوئی ہے کافر ۔ کوئی مسلماں ۔ جُدا ہر ایک کی ہے راہِ ایماں
جو اس کے نزدیک ہبری ہے ۔ وہ اس کے نزدیک ہرزنی ہے

تکلفِ منزلِ محبت نہ کر ۔ چلا چل تو بے تکلف
کہ جا بجا خارزارِ وحشت سے بچھ رہا فرشِ سوزنی ہے

خدنگِ مژگاں سے ذوق اسکے دل اپنا سینہ سپر ہے جب سے
مثالِ آئینہ سخت جانی سے سینہ دیوارِ آہنی ہے

آنکھ اُس پر جفا سے لڑتی ہے ۔ جان کشتی قضا سے لڑتی ہے
شعلہ بھڑکے گا کیا بھلا سرِ بزم ۔ شمع تجھ بن ہوا سے لڑتی ہے

قسمت اُس بت سے جا لڑی اپنی ۔ دیکھیو! احمق خدا سے لڑتی ہے
صفِ مژگاں تری خدا کی پناہ ۔ ایک بلا ۔ ایک بلا سے لڑتی ہے

شورِ قتلِ یہ کیوں ہے، دخترِ رز ۔ کیا کسی آشنا سے لڑتی ہے؟
نگہِ ناز اُس کی عاشق سے ۔ چھوٹ کس کس ادا سے لڑتی ہے

تیرے بیمار کے سرِ بالیں ۔ موت کیا کیا شفا سے لڑتی ہے
آج کہتے ہو کیا طبیعت کو ۔ عشق میں ابتدا سے لڑتی ہے

زال دنیا نے صلح کی کس دن
یہ لڑا کا سدا سے لڑتی ہے

تیری شمشیر خوں کی چھینٹوں سے
چھینٹے آبِ بقا سے لڑتی ہے

دیکھو اس چشمِ مست کی شوخی
جب کسی پارسا سے لڑتی ہے

ذوق دنیا ہے مکر کا میداں
نگہ اُس کی دغا سے لڑتی ہے

دل کی معاش غم ہے غم کی تلاش ہے
ڈرتا ہوں دل سے میں یہ بڑا بدمعاش ہے

اس بت کدہ میں کون ہے کافر ترے سوا
تو بت پرست بت بھی ہے اور بت تراش ہے

ہوتی وبالِ دوش نہیں عاشقوں کی خاک
اُڑ جاتی ٹھوکروں میں تری اُن کی لاش ہے

لبریز صد نشاط ہے مثلِ ہلالِ عید
سینہ میں وہ جو نافِ محم کی خراش ہے

کرتے ہیں اشک آہ ہیں تکلیف کیوں عبث
ہو جاتا راز دل تو نگاہوں میں فاش ہے

دنبالہ پر جو سرمہ کے دانہ ہے خال کا
دیکھو! وہ دستِ چشمِ فسونگر میں ماش ہے

کیا شاد کو خفیف ہے کرتی زبانِ خلق
شاباش جسکو کہتے ہیں وہ شاد باش ہے

دنیا سے بھی اُٹھے تو نہ بستر سے اُٹھ سکے
تیرا مریضِ عشق جو صاحب فراش ہے

ہے کس مزہ سے عشق میں اپنی ہوئی بسر
افسوس لب پہ ہے۔ نہ کبھی دل میں کاش ہے

برش میں اب تو خنجرِ مژگاں سے بھی ہے تیز
اس شوخ کج ادا نے نکالی تراش ہے

مسکن پذیر آج سے دل میں نہیں ہے غم
روزِ ازل سے اسکی یہیں بود و باش ہے

اے ذوق جانتا ہے وہ ہمدرد میرا درد
دل جس کا پارہ پارہ جگر پاش پاش ہے

ہے تیرے کان میں لفِ منبر لگی ہوئی
رکھے گی یہ نہ بال برابر لگی ہوئی

مژگاں سے تیری لگ ہے دل پر لگی ہوئی
ایک پھانس ہے کلیجے کے اندر لگی ہوئی

چاٹے بغیر خون کوئی رہتی ہے تیری تیغ
بے ڈھب ہے اس کو چاٹ ستمگر لگی ہوئی

بیٹھے بھرے ہوئے ہیں ستم کی طرح ہم
پر کیا کریں کہ مُنہ پہ لگی ہوئی

میت کو غسل دیجو نہ اس خاکسار کی
ہے تن کو خاکِ کوچۂ دلبر لگی ہوئی

عیسےٰ بھی پاس ہے۔ نہیں ممکن مگر شفا
خورشید کو وہ ہے فلک پر لگی ہوئی

میرا گلِ امید شگفتہ ہو کس طرح
دل کی گرہ ہے اُس کی گرہ پر لگی ہوئی

گل میدھی کیوں نہ باغ میں ہو پائمالِ اشک
پانو میں تیرے دیکھے حنا گر لگی ہوئی

کرتی ہے زیرِ برقع فانوس تاک جھانک
پروانہ سے ہے شمع معتبر لگی ہوئی

یہ چاہتا ہے شوق کہ قاصد بجائے مُہر
آنکھ اپنی ہو لفافۂ خط پر لگی ہوئی

مُنہ سے لگا ہوا ہے اگر جامِ مے تو کیا
ہے دل سے یادِ ساقیِ کوثر لگی ہوئی

اے ذوق اتنا ذکرِ رزق نہ منہ لگا
چھٹتی نہیں ہے مُنہ سے یہ کافر لگی ہوئی

مجھ سے کچھ پوچھو خونِ ناب حسرت کے مزے
زہر کے گھونٹ ہیں پر رکھتے ہیں شربت کے مزے

تجھکو کچھ یاد بھی ہیں پہلی وہ الفت کے مزے
بے مزہ ہو نیکے لطف اور شکایت کے مزے

بے محبت نہیں اے ذوق شکایت کے مزے
بے شکایت نہیں اے ذوق محبت کے مزے

کھائے کوچہ میں ترے آکے جو سنگِ دشنام
آئے مجنوں کو ترے میوۂ جنت کے مزے

لگتی پھبتیں سی کہا بوں کہیں سُنکر کیا کیا
دلِ بریاں سے مرے سوزِ محبت کے مزے

صرفِ ہر زخمِ جگر تا نہ ہو صد کانِ نمک
لوٹے کیا عشق میں اس کان ملاحت کے مزے

ملتِ عشق میں ہو۔ کاش تناسخ ہی سہی
کہ اڑائیں ترے سر بازِ شہادت کے مزے

دیکھکر اسکو گیا عالم حیرت میں تو میں
پر بیاں کیا کروں اُس عالمِ حیرت کے مزے

سجدہ میں پائے خم مے پہ ہیں کس لطف سے مست
یوں عبادت ہو تو زاہد ہیں عبادت کے مزے

پھول گلشن میں ہنسے کرکے زر اپنا برباد
کہ اُڑانے ہی میں دولت کے ہیں دولت کے مزے

جانِ شیریں بھی گئی اور نہ ملی شیریں بھی
پوچھو فرہاد سے اس تلخیِ حسرت کے مزے

ابر و باراں کے مزے کیونکہ نہ لوٹیں میخوار
کہ اُڑاتے ہیں گنہگار رہی رحمت کے مزے

ہے نمک پاش جو ہنس ہنسکے وہ بسمل نہ کیں
لے رہا ہے دلِ مجروح جراحت کے مزے

کچھ جتاؤں جو محبت تو ہے کہتا کہ تجھے
دیکھ تو کیسے چکھاتا ہوں محبت کے مزے

ذائقہ چاشنیٔ عشق کا کامل ہو تو دیں
شادیٔ وصل کی لذت غمِ فرقت کے مزے

نہیں جز بے مزگی کوئی مزا دنیا میں
پر مزیدار بنا دیتے ہیں غفلت کے مزے

خنجرِ ناز نے کیا چاٹ لگائی دل کو
چاہتا ہو نٹ ہے لے لیکے جراحت کے مزے

بے مزاجی کو کریں لاکھ تیرے ظلم و ستم
پر نہیں بھولتے وہ پہلی عنایت کے مزے

پھر چٹا زخم کا انگور مبارک اے ذوق
دلِ زخمی کو تھے بادہ حسرت کے مزے

کب وہ گذرتے ہیں سرِ لاف و گذاف سے
جنکی کہ آشنا ہے بالم و کاف سے

اوّل ہی سے بشر کو ہے رغبت خلاف سے
لیتا تھا کام منہ کا شکم میں یہ ناف سے

چل میکدہ میں شیخ بسر کر مہِ صیام
مسجد میں تنگ بیٹھا ہے کیوں اعتکاف سے

نالوں نے دی چڑھا جو تپِ لرزہ مہر کو
کھولی نہ آنکھ برسیہ کے لحاف سے

پھینکے ہے ایک جنبشِ مژگانمیں دو پری
اس اپنے ناتواں کو پری کوہِ قاف سے

ہو جو ہلال پہ ننگا جو خاکسار
ایکتنغ ہے کہ ننگ ہے اسکو غلاف سے

گذرتی ہے مشقِ سینہ شگافی میں اے قلم
عاشق کی عمر نالۂ گردوں شگاف سے

گردش ہے اسکی چشم کی کیوں میری ہی گرد
کافر کو کام کعبہ کے ہے کیا طواف سے

لڑتے ہیں گر نصیب سے گاہے فلک سے ہم
فرقت کی رات کم نہیں روزِ مصاف سے

طوفِ سیاہِ خیمۂ لیلیٰ ہوا نصیب
مجنوں سمجھیو کعبہ کے بہتر طواف سے

جوں تیغِ خوش غلاف نگہ تیری اے پری
ہے دمبدم نکلکے چمکتی غلاف سے

لکھتا ہے شیخ مسئلۂ وحدتِ وجود
لیکن دوئی عیاں ہے قلم کے شگاف سے

گلہائے رنگ رنگ سے ہے رونقِ چمن
اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

۱۸۵۰ء میں مرزا خدا بخش شاہزادہ نے قلعہ میں مشاعرہ کیا۔ اور دو مصرع طرح کئے۔

(۱) ع۔ کیا کیا مصیبتیں ہیں دلِ پُرمحن کے ساتھ

دوسرا ع۔

کیا غرض لاکھ خدائی میں ہوں دولت والے

استاد نے دونو طرحوں میں غزلیں لکھی تھیں۔ اور مشاعرہ میں بھی گئے تھے۔ غزل قوم الدین کہہ رہے تھے کہ ایک دوست آئے۔ اور کہا کہ اسمیں تو ساری غزل بے محاورہ ہوگئی۔ اس طرح میں نہ کہئے۔ میں نے کہا بے محاورہ ہماری غزل نہ ہوگی۔ کہوانے والے بے محاورہ ہونگے۔ ایسی طرح کیا سمجھ کر رکھی۔ استاد مرحوم نے تامل کرکے فرمایا نہ کہیں؟ میں نے کہا حضرت ضرور کہنی چاہئے۔ لوگ ہمیں کہینگے کہ انہیں بے محاورہ کہنا نہیں آتا۔ استاد کا ارادہ پھر مستقل ہوگیا۔ اور غزل تمام کی۔

کیا غرض لاکھ خدائی میں ہوں دولت والے
انکا بندہ ہوں جو بندہ ہیں محبت والے

چاہیئں چارہ جراحت کا محبت والے
بیچیں الماس و نمک سنگ جراحت والے

گئے جنت میں اگر سوزِ محبت والے
تو یہ جانو ہے دوزخ ہی میں جنت والے

ساقیا ہوں جو صبوحی کی نہ عادت والے
صبح محشر کو بھی اُٹھیں نہ تیرے متوالے

ہے جوں شیشۂ ساعت وہ نکدر دونو
کبھی مل بھی گئے دو دل جو کدورت والے

کس مرض کی ہیں دوا یہ لبِ جاں بخش ترے
جاں بلب ہیں ترے آزارِ محبت والے

حرص کے پھیلتے ہیں پانو بقدر وسعت
تنگ ہی رہتے ہیں دنیا میں فراغت والے

ہائے رے حسرتِ دیدار میری ہائے کو بھی
لکھتے ہیں ہائے دو چشمی سے کتابت والے

نہیں جز شمع مجاور میرے بالینِ مزار
نہیں جز کثرتِ پروانہ زیارت والے

نہ ستم کی ہے شکایت۔ نہ کرم کی خواہش
دیکھ تو ہم بھی ہیں کیا صبر و قناعت والے

کیا تماشا ہے کہ مثلِ مہ نو دیکھے فروغ
خود نمائی کو ہیں چمکارے شہرت والے

دل سے کچھ کہتا ہوں میں مجھ سے ہے کچھ دل کہتا
دونو ایک حال میں ہیں درد و مصیبت والے

بے نصیبوں کے نصیبوں میں کہاں یار کا وصل
ان کی قسمت میں ہے جو لوگ ہیں قسمت والے

تو جو آجائے تو اے دردِ محبت کی دوا
میرے ہمدرد ہوں بیدرد نصیحت والے

چھوڑ دیتے ہیں قلم جوں قلمِ آتش باز
لکھ کے میری تپشِ دل کو کتابت والے

کبھی افسوس ہے آتا کبھی رونا آتا
دلِ بیمار کے ہیں دو ہی عیادت والے

تو میرے حال سے غافل ہے پر اے غفلت کیش
تیرے انداز تغافل نہیں غفلت والے

ناز ہے گل کو نزاکت پہ چمن میں اے ذوق
اس نے دیکھے ہی نہیں ناز و نزاکت والے

مرزا نورالدین اور مرزا حیدر شکوہ دو تیموری شاہزادے لکھنو میں عمدہ احترام و عزت

کے ساتھ رہتے تھے۔ مرزا سلیمان شکوہ خلف شاہ عالم بادشاہ کے پوتے تھے۔
۱۸۵۱ء میں دلّی میں آئے۔ ہر طرح صاحب لیاقت تھے۔ اور شعر بھی کہتے تھے
آتش کے شاگرد تھے۔ بادشاہ اُن کی خوبیوں کے سبب سے خوب ہی متوجہ ہوئے
اور اپنا سمجھ کر ان پر اعتبار ظاہر کئے۔ چاندنی چوک میں نواب رُکن الدّولہ کے
مکان میں اُترے تھے۔ تسخیر کے اُستاد تھے۔ اُستاد سے بھی محبت اور تپاک سے
اخلاص قایم کیا۔ بادشاہ کے حکم سے مشاعرہ شروع کیا۔ استاد سے وعدہ لیا
کہ بادشاہ کی غزل لے کر اور آپ غزل لکھکر مشاعرہ میں لائیں۔ پہلے جلسہ میں یہی
طرح تھی۔ اور غزل مرقوم الذیل استاد نے پڑھی تھی۔ بڑی دھوم دھام کا جلسہ تھا۔

کیا غمزہ ترا برسرِ بیداد غضب ہے
جلادِ فلک سے بھی یہ جلاد غضب ہے

ہر ناز میں کرتا ستم ایجاد غضب ہے
سر تا بقدم وہ بتِ بیداد غضب ہے

ناز آفت و چشمِ ستم ایجاد غضب ہے
شاگرد بھی ہے قہر جو استاد غضب ہے

اے بلبلِ نالاں تری فریاد غضب ہے
کر بات بھی آہستہ کہ میّاد غضب ہے

گلشن میں ابھی ہنسکے پریشاں ہوئے اے گل
اس باغ میں آنا دلِ ناشاد غضب ہے

نکلے ہے سدا کوہ سے ہم آتش و ہم آب
کیا سوز و گدازِ دلِ فرہاد غضب ہے

خاکسترِ پروانہ پہ روتی ہے بجا شمع
ہو خاکِ جگر سوختہ برباد غضب ہے

دل حسن کے یوسف سے جو ہونے لگا روشن
ہم سمجھے کہ اس چاہ کی افتاد غضب ہے

اُس بت کا سمجھ حسن خدا داد نہ اس کو
یہ تجھ پہ خدا کا دلِ ناشاد غضب ہے

ہوتا ہے سپند ایک ہی وا زد میں آخر
کیا سوختہ جانوں کی بھی فریاد غضب ہے

توڑا کمرِ شاخ کو کثرت نے ثمر کی
دنیا میں گرانبار نئی اولاد

اے شوخ تری چشمِ غضبناک کے ہوتے
ہم چاہیں تصنا سے اگر امدادِ غضب ہے

اللہ کرے خیر مرے شیشۂ دل کی
پھر آج وہ مستِ مے بیداد غضب ہے

بھولا نہ مجھے قتلگہِ عام میں قاتل
اللہ رے ترا حافظہ کیا یاد غضب ہے

شیطاں بھی اماں مانگتا ہے انکی عمل سے
کیا حضرتِ آدم کی بھی اولاد غضب ہے

پریوں پہ تیری طرح سے مرتے نہیں ہمدم
ہم جیسے ہیں عاشق وہ پریزاد غضب ہے

تارے یہ فلک پر ہیں کہ اڑتے ہیں شرارے
عاشق کی ترے گرمیٔ فریاد غضب ہے

ہے سرو تو پابندِ غمِ بے ثمری میں
کہتے ہیں گرفتار کو آزاد غضب ہے

غصہ ہے ترا قہر۔ ترا قہر قیامت
رنجش تری بیداد ہے۔ بیداد غضب ہے

ہے فکرِ سخن آئینہ بادیدۂ پرآب
اسکندرِ رومی کی بھی روداد غضب ہے

وہ کونسا غم ہے کہ جو دنیا میں نہیں ہے
اور اسپہ بھی دلکش یہ غمِ آباد غضب ہے

قامت تو ترا سرو کے سر پر تھا قیامت
پر طرّۂ سر طرّۂ شمشاد غضب ہے

سو فتنے ہیں پنہاں نظرِ لطف میں اُسکی
یہ لطف نہیں اے دلِ ناشاد غضب ہے

دیں ہوش بھلا مردمِ ہشیار کے پل میں
آنکھوں کو تمہاری وہ فسوں یاد غضب ہے

یہ خانۂ ہستی ہے عجب خانہ رنگیں
اے ذوق مگر ہستیٔ بنیاد غضب ہے

ہوئے وہ کب قایلِ قیامت۔ جو ترا قامت نہ دیکھ لینگے

رہینگے رویت کے بلکہ منکر۔ جو تیری صورت نہ دیکھ لینگے

ہمیں غرض کیا کہ جائینگے ہم۔ حرم کو اے شیخ بتکدہ سے

یہیں بتوں میں خدا کا اپنے۔ ظہورِ قدرت نہ دیکھ لینگے

نہ دیکھی کیسی کیسی آفت - جہاں میں ہم نے تمہارے باعث
اور آگے کیا کیا غم والم ہم - تمہاری دولت نہ دیکھ لینگے
دکھا نہ احوال اُن کو اپنا - یہ اُن کی اُلفت کا امتحاں ہے
کہ ہوگی اُلفت تو دیکھ لینگے - نہ ہوگی اُلفت نہ دیکھ لینگے
کہوں یہ کیوں میں کہ حضرتِ دل - شکر لبوں پر نہ زہر کھاؤ
کہ آپ ہی تلخیِ محبت کی وہ حلاوت نہ دیکھ لینگے؟
بلا سے گردانیال کا سا - نہیں ہے پاس اپنے فال نامہ
ہم اپنے نقطوں سے داغِ دل ہی کے فالِ دولت نہ دیکھ لینگے
اگرچہ دردِ محبت اپنا - کہا نہ میں نے زباں سے اپنی
وہ میری صورت نہ دیکھ لینگے - وہ میری حالت نہ دیکھ لینگے؟
ہلال کو دیکھیں کیوں فلک پر - اگر ہے منظور عید ہم کو
تو اس کے تیغِ ستم کا دل ہیں - لبِ جراحت نہ دیکھ لینگے
بہارِ یاراں کو کون دیکھے - بغیر یاراں ہے تیر باراں
ہم اس کے بدلے سرشک خوناں کی اپنے شدت نہ دیکھ لینگے
گذر بھی جاؤں گر اپنے جی سے - کہیں گے جیتا ہے جی چرایا
وہ جب تلک اپنے آستانے پہ میری تربت نہ دیکھ لینگے
مجھے یقیں ہے نہیں دکھائینگے اپنے رخسارِ لالہ گوں کو +
رواں مری چشمِ تر سے جبتک - وہ خونِ حسرت نہ دیکھ لینگے
تپِ محبت کا میرے دل کی یقیں نہ آئے گا ہرگز ان کو

ملیاں وہ رگ رگ میں میری جبتک کہ برق سرعت نہ دیکھ لینگے

خط ان کو دے بھی دیا جو قاصد نے ذوق دیکر کسی کا دھوکا
وہ خط نہ پہچان لینگے میرا - میری عبارت نہ دیکھ لینگے؟

کیا مدنظر تجھکو ہے یاروں سے تو کہئے
کر منہ سے نہیں کہتے اشاروں سے تو کہئے

حال دل بیتاب کہا جائے جو ہم سے
گر کہئے نہ لاکھوں سے ہزاروں سے تو کہئے

کیا کہئے گا اب اور سر خاک شہیداں
کچھ فتنے اٹھانے ہوں مزاروں سے تو کہئے

پھر قم نہ کہیں حضرت عیسے اگر اسے
کہئے - کہ یہ قم عشق کے ماروں سے تو کہئے

کچھ سوز دل اپنا کسی دلسوز کے آگے
فرصت ہو تپ غم کے حراروں سے تو کہئے

موقوف ہے گردل کا شکار آن واد پر
تو پہلے کچھ اُن میر شکاروں سے تو کہئے

اُس گوہر دنداں پہ اگر سوجھے کوئی بات
موتی تو ہیں کیا مال ستاروں سے تو کہئے

جس راہ سے شانہ ہے گیا زلف سا میں
اُس سنہ کو ان سینہ فگاروں سے تو کہئے

کہئے نہ تنگ لف سے اے ذوق کبھی راز
کہکر اُسے سُننا ہو ہزاروں سے تو کہئے

یہ اقامت ہمیں پیغام سفر دیتی ہے
زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے

زوال دنیا ہے عجب طرح کی علامۂ دہر
مرد دیندار کو بھی دہریہ کر دیتی ہے

تیرہ بختی مری کرتی ہے پریشاں مجھکو
تہمت اُس زلف سیہ فام پہ دھر دیتی ہے

رات بھاری تھی سر شمع پہ سو ہو گذری
کیا طباشیر سفیدی سحر دیتی ہے

ناز و انداز تو ہیں کر چکے سب شق ستم
کچھ محبت مری اصلاح مگر دیتی ہے

دیتی شربت ہے کسے زہر بھری آنکھ تری
عین احساں ہے مجھے زہر ہی گر دیتی ہے

کیا کرے حسرتِ دیدار کہ دم لینے کی
دل کو فرصت نہیں وہ تیغِ نظر دیتی ہے

شمع گھبرا نہ تپِ غم سے کہ ایک دم میں ابھی
آکے کافور سفیدیٔ سحر دیتی ہے

فائدہ دے تے بیمار کو کیا خاک دوا۔
اب تو اکسیر بھی دیجے تو ضرر دیتی ہے

غنچہ ہنستا ترے آگے جو گستاخی سے
بیخنا منہ پہ ہیں بادِ سحر دیتی ہے

شمع بھی کم نہیں کچھ عشق میں پروانہ سے
جان دیتا ہے اگر وہ تو یہ سر دیتی ہے

نخلِ مژگاں سے ہے کیا جانیے کیا چشم ثمر
چشم پانی کی جگہ خونِ جگر دیتی ہے

کہتے سنتے نہیں کچھ ہم تو شبِ ہجر میں پر
نالۂ دل کا جواب آہِ جگر دیتی ہے

کوئی غمّاز نہیں میری طرف سے اے ذوق
کان اس کے مری فریاد ہی بھر دیتی ہے

مزا تھا ہم کو جو بلبل سے دو بدو کرتے
کہ گل تمہاری بہاروں میں آرزو کرتے

مزے جو موت کے عاشق بیاں کبھو کرتے
مسیح و خضر بھی مرنے کی آرزو کرتے

غرض تھی کیا ترے تیروں کو آبِ پیکاں سے
مگر زیارتِ دل کیونکہ بے وضو کرتے

اگر یہ جانتے چُن چُن کے ہم کو توڑیں گے
تو گل کبھی نہ تمنائے رنگ و بو کرتے

یقیں ہے صبحِ قیامت کو بھی صبوحی کش
اُٹھینگے خواب سے ساقی سبو سبو کرتے

سمجھیو روز سن تار و سوزن اے منصور
کہ چاک پردہ حقیقت کا ہیں رفو کرتے

نہ تھی یوسفِ کنعاں کی خوبیٔ بازار
مقابلہ میں جو ہم تجھکو رد و بد کرتے

چمن بھی دیکھتے گلزارِ آرزو کی بہار
تمہاری باد بہاری میں آرزو کرتے

عجب تھا کہ زمانہ کے انقلاب سے ہم
تیمم آب سے۔ اور خاک سے وضو کرتے

سراغ عمرِ گذشتہ کا لیجئے گر ذوق
تمام عمر گذر جائے جستجو کرتے

روشنی بھی نہیں پھر شمع سے جانبازی میں
جان پروانہ جو دے شمع بھی سر دیتی ہے

اُس سنگِ آستاں پہ جبینِ نیاز ہے
وہ اپنی جانماز ہے اور یہ نماز ہے

تا ساز ہم سے جو ہے اُسی سے یہ ساز ہے
کیا خوب دل ہے واہ ہمیں جب پہ ناز ہے

دروازہ میکدہ کا نہ کر بند محتسب
ظالم خدا سے ڈر کہ در توبہ باز ہے

تا نہ خرابیاں دلِ بیمارِ غم کی ہائے
ہے وہ دوا خراب کہ جو خانہ ساز ہے

خنجر کہیں نہ یار کا بہ جائے ہو کے آب
میرے گلے میں نالۂ آہن گداز ہے

پہنچا ہے شب کمند لگا کر کہاں رقیب
دیکھو حرامزادہ کی رسّی دراز ہے

اس بت پہ گر خدا بھی ہو عاشق تو آئے رشک
ہر چند جانتا ہوں کہ وہ پاک باز ہے

نقطہ پہ خالِ روئے بتاں کے مجھے خدا
عشق تو کیا عجب کہ وہ نکتہ نواز ہے

ہر برگِ گل کے لب سے ٹپکتا ہے خوں پڑا
گلشن میں کس کی خاکِ شہیدانِ ناز ہے

اے ذوق کیوں نہ سب پہ کھلے تیرِ رازِ عشق
جو نالہ ہے کلیدِ درِ گنجِ راز ہے

ساقیا عید ہے لا بادہ سے مینا بھر کے
کہ پیالے ہیں مے آشام مہینا بھر کے

آشناؤں سے اگر ایسے ہی بیزار ہو تم
تو ڈبو دو انہیں دریا میں سفینہ بھر کے

عقدِ پروین یہ نہیں حقہ پڑیں ہیں ملک
لائے ہیں اُس رخِ روشن کا پسینہ بھر کے

روز اس گلشنِ رخسار سے لیجاتے ہیں
اپنے دامانِ نظر مردم بینا بھر کے

دل ہے آئینہ۔ صفا چاہئے رکھنا اسکا
زنگ سے بھرتا ہے کیوں اسمیں تو کینہ بھر کے

غمِ پُرجوش کی مانند چھلکتا ہے پڑا۔
خونِ حسرت سے لبوں تک مرا سینہ بھر کے

جام خالی بھی لگا منہ سے نہ کم ظرف کے ساتھ
ذوق کے ساتھ قدح ذوق سے مینا بھر کے

جو تھے مژگانِ پر خون سب خارِ لنشیں نکلے
جنوں یہ کیسے نشتر تھے کہ ٹوٹے بے کہیں نکلے

عدوئے نیش زن کے گھر سے کب وہ مہ جبیں نکلے؟
الٰہی برجِ عقرب سے قمر جلدی کہیں نکلے

چھٹے کیا ہم سے شوقِ حسنِ گندم گوں۔ کہ گندم پر
ہمارے جد آدم چھوڑ کر خلدِ بریں نکلے

ترے انداز سے سو سو طرح کے ناز ہوں پیدا
ترے ہر ناز پر سو سو کا دم اے نازنیں نکلے

پرے جا کر نئی دنیا سے بھی گر دیکھو دنیا میں
تو خالی خاکِ آدم سے نہ چٹا بھر زمیں نکلے

خدا دے دو رہینی اور اس چشمِ تصور کو
کہ لاکھوں کام اس سے دور کے بے دو بیں نکلے

رلائے گر تصور اس لبِ شیریں کا آنکھوں کو
تو آنسو ہو کے شربت خوں ہو کر گھبیں نکلے

قلم کی دیکھو گلکاری دمِ تحریرِ حالِ دل
کہ جائے حرف گلہائے بلا رنگِ آتشیں نکلے

زیادہ جان کے جانے سے غم ہے تیرے جانیکا
الٰہی جانے سے پہلے مری جانِ حزیں نکلے

نہ ہو غربت میں گر قدرِ صفا پاکیزہ گوہر کی
تو کیوں دریا سے یکتا ہو کے پھر دُرِ ثمین نکلے

تباہی میں ہے مفوی کی حلاوت اہلِ عالم کی
کہ ویراں خانۂ زنبور ہو جب انگبیں نکلے

ہوئے تم چیں برابر دو ہو کے میرے قتل کے درپے
چمکنے سے تمہارے جو ہر شمشیر کیں نکلے

سراپا روسیاہی گر ملے ان نامداروں کو
ہوس دل سے نہ اُن کے نام کی مثقالِ نگیں نکلے

فلک بھی خانۂ زنبور ہے کثرت سے انجم کی
مگر کیا دخل جز زہرابِ سیمیں انگبیں نکلے

دلِ زخمی کی حالت پر دہانِ زخم کیا بولیں
زبانِ تیغ سے نکلے تو شاید آفریں نکلے

جو حسرت میرے لب سے نکالوں میں کہاں اسکو
نہ وہ زیرِ فلک نکلے نہ وہ زیرِ زمیں نکلے

سنا کرتے تھے شہرہ ذوق جنکی پارسائی کا
وہ سب یارِ خرابات اپنے نکلے۔ ہمنشیں نکلے

غنچے تری غنچہ دہنی کو نہیں پاتے
ہنستے تو ہیں پر تیری ہنسی کو نہیں پاتے

ہم تُم سا عدو اپنا کسی کو نہیں پاتے
تم ہم کو جو پاؤ تو چھری کو نہیں پاتے

کیا وقت تھا وہ تجھ کو دیا دل تھا جو ہم نے
اے سنگدل اُس سخت گھڑی کو نہیں پاتے

وہ کونسی شے ہے جسے پاتے نہیں دل میں
لیکن نہیں پاتے تو خوشی کو نہیں پاتے

لیتے ہیں شبِ وصل میں اُس لب کے یہ بوسے
ہم لب پہ سحر رنگِ مسی کو نہیں پاتے

میں ایسا ہوا گم کہ عزیزانِ عدم بھی
گم ہو کے میری گم شدگی کو نہیں پاتے

رکھتے ہیں دمِ شعلہ فشاں اثر دوزخ
لیکن مری آتش نفسی کو نہیں پاتے

وہ دن ہیں کہاں بہتے تھے جو چشم سے چشمے
اب نام کو بھی ان میں نمی کو نہیں پاتے

معلوم نہیں اس کی دہن ہے کہ نہیں ہے
اے ذوق ہم اس سرِ خفی کو نہیں پاتے

ابتدائے شباب کی غزل ہے۔ نظر ثانی نہیں ہوئی۔

نبضِ نملی ہے کہاں میری فلاطوں چلتی
ہے یہ ضعف اب تو کہ چونٹی بھی نہیں یوں چلتی

پہنچے کیونکر جرسِ ناقۂ لیلےٰ کی صدا
آج آندھی تری قسمت سی ہے مجنوں چلتی

کھولدو آنکھوں سے پٹی نہیں دیکھو گا تمہیں
پر چھری اپنی تو گردن پہ میں دیکھوں چلتی

جب میں دنیا سے چلا۔ سر پہ یہ بولی حسرت
تو اکیلا نہیں میں ساتھ ترے ہوں چلتی

دور کر بالوں کو سر سے یہ ہے کتنی لیلےٰ
پر نہیں کان پہ مجنوں کے ذرا جوں چلتی

میں تو اُن آنکھوں کی گردش کا بلا گرداں ہوں
کہ نہیں تیری جہاں گردشِ گردوں چلتی

عمر ہے کر رہی ہر دم سفرِ بحرِ فنا۔
جسکو تو سانس کہے ہے۔ دلِ محزوں چلتی

سمجھے ہے راکبِ کشتی کہ ہے ساحل چلتا
پر حقیقت میں ہے کشتی سرِ جیحوں چلتی

ذوق گل اذکر کوئی تازہ کھلا چاہتا ہے
کہ ہوا باغِ جہاں میں ہے دگرگوں چلتی

۱۸۴۵ء میں نواب اصغر علیخاں کے ہاں رامپور کے بعض خوانین آئے۔ بڑی دھوم دھام سے مشاعرہ کیا تھا۔ وہاں یہ غزل پڑھی گئی تھی۔ نواب موصوف۔ نواب عبداللہ خاں صدر الصدور میرٹھ کے بیٹے تھے۔ (دیکھو صفحہ ۱۰۷) اصغر علیخاں مومن خاں سے اصلاح لیتے تھے۔ انہیں ساتھ لیکر استاد مرحوم کے پاس آئے۔ اور بڑے اصرار سے مشاعرہ میں آنیکا اقرار لیا۔ اللہ اکبر۔ یاد ایام۔ استاد میرے والد مرحوم کے بغیر مشاعرہ میں نہ جاتے تھے۔ اُن کے پاس آئے۔ والد نے کہا۔ دل افسردہ ہو گیا میں اُدھر نہیں جاتا۔ تم جاؤ گے جاؤ گے تو سنو گے کسے؟ اور سناؤ گے کسے؟ استاد نے کہا جی تو میرا بھی نہیں چاہتا۔ مگر کیا کروں۔ وہ دونو آئے تھے۔ میں نے بھی اُن کے اصرار سے وعدہ کر لیا ہے۔ تم نہ جاؤ گے تو میں بھی جاؤنگا۔ بندۂ آزاد اُس وقت تک ایسے جلسوں میں نہ جا سکتا تھا جبتک کوئی ایسا ہی بزرگ ساتھ نہ ہو۔ اور شاعرہ کبھی دیکھا تھا۔ اس لئے ہمیشہ اگلے مشاعروں کی باتیں سُن سُن کر آرزومند رہتا تھا۔ میں نے بھی والد مرحوم سے کہا۔ غرض کہ مشاعرہ میں گئے۔ ملاقات مذکورہ بالا کی باتوں میں اُستاد نے یہ بھی بیان کیا کہ مومن خاں نے مجھ سے کہا۔ کچھ اندنوں کا کہا ہوا سنائیے۔ مدتیں گذر گئیں آپ کے منہ سے کچھ نہیں سنا۔ میں نے کہا حضور کی غزلیں فرصت کہاں دیتی ہیں؟ پھر کہا۔ پھر کہا۔ خیر میں نے دو شعر سنا دیئے۔ انہیں دنوں میں ہوئے تھے۔

خط بڑھا۔ کاکل بڑھی زلفیں بڑھیں گیسو بڑھے	حسن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے
بعد بخشش کے گلے ملتے ہوئے رُکتا ہے دل	اب سنا سب ہی کچھ میں بڑھوں کچھ تو بڑھے

والد نے کہا۔ اُنہوں نے بھی کچھ سُنایا؟ فرمایا۔ نہیں۔ یہی کہتے رہے۔ مجھ کو مرض ایسا لگا ہے

کہ ایک دم مفارقت نہیں کرتا دل نہیں لگتا۔ چرچہ جاتا رہا۔ وغیرہ وغیرہ۔
اس بیان سے بندہ آزاد کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ایسا کہہ سکتے تھے۔ بے شک انکے
دیوانمیں کئی ایسے مطلع موجود ہونگے۔ مگر سخن سنج نکتہ شناس تھے۔ ساتھ اس کے
عاشق معشوق مزاج تھے۔ ایک ایسا شعر کہ مطلع ہو۔ اور اُس میں اثبات مضمون
کے گواہوں سے قایم ہو۔ اس پر غزلیت کے اوصاف سے متصف ہو وغیرہ وغیرہ۔
اُسے سُن کر جو پڑھتے تو اُسی رتبہ کا مطلع پڑھتے۔ وہ زبان پر نہ دھرا تھا۔ اور وہ
اُن لوگوں میں نہ تھے۔ کہ شعر سنا اور شعر خوانی شروع کر دی۔ بات کو سمجھتے تھے۔
اور محل و مقام پہچانتے تھے۔

ثبات کب ہے زمانہ کے عزو شاں کیلئے
کہ ساتھ اوج کے پستی ہے آسماں کیلئے

مزے تو دل کو ملے تھے ہوئے زباں کیلئے
یہ ہم نے دل میں مزے سوزش نہاں کیلئے

ہزار لطف ہیں جوہر ستم میں جاں کیلئے
ستم شریک ہو اکون آسماں کیلئے

فروغ عشق سے ہے روشنی جہاں کیلئے
کہ یہ چراغ ہے اس تیرہ خاکداں کیلئے

صبا ہے آفتی خس و خار گلستاں کیلئے
قفس میں لوٹ رہے ہے دل آشیاں کیلئے

دم عروج ہے کیا فکر زوال کیلئے
کمند آہ تو ہے بام آسماں کیلئے

سدا تپش پہ تپش ہے دل تپاں کیلئے
ہمیشہ غم پہ ہے غم جان ناتواں کیلئے

جو سنگ کعبہ کے بوسہ میں حج کعبہ ہے شیخ
تو بوسہ ہم نے بھی اس سنگ آستاں کیلئے

نہ دینا ہاتھ سے تم راستی کہ عالم میں
عصا ہے پیر کو اور سیف ہے جواں کیلئے

دکان حسن میں رکھتے نہیں متاع وفا
وگرنہ لیتے ہم ایک اپنے مہرباں کیلئے

خلش سے عشق کے ہے خار پیرہن اے یار
یہ جان اُس ترے مجنون ناتواں کیلئے

آگہی سوزِ محبت سے اڑاتا ہے تنِ زار
کہ لایا عشق ہے سیماب استخواں کے لئے

نگاہِ ناز نے کی دیر ورنہ میں تیار
ہوں کب سے بیٹھا ہوا مرگِ ناگہاں کیلئے

مری مزار پہ کس وجہ سے نہ برسے نور
کہ جان دی ترے روئے عرق فشاں کیلئے

آگہی کان میں ہے کیا صنم نے پھونک دیا
کہ ہاتھ[1] رکھتے ہیں کانوں پہ سب اذاں کیلئے

قدِ خمیدہ پر اپنے ہیں بال زیبِ بال
اثاثہ کچھ تو ہے خانۂ کماں کے لئے

نہ دل رہا نہ جگر دونو جلکے خاک ہوئے
رہا ہے سینہ میں کیا چشمِ خوں فشاں کیلئے

مری تو گور پہ جام و سبو کی ہو تصویر
کہ یادگارِ زمانہ رہے نشاں کیلئے

امید ہوگئی ہمسایہ ورنہ خانۂ یاس +
بہشت تھا ہمیں آرامِ جاوداں کیلئے

نگاہِ ناز نے دیکھے تھے جو ہر آج اپنے
دل اپنا ہم کو بھی یاد آیا امتحاں کیلئے

تمہاری نرگسِ بیمار نے جو کی تھی نگاہ
وہی جواب ہوا طاقت و تواں کیلئے

مزاجِ انکا نہ بجلی ہے اور نہ ہے سیماب
خطر جو ہے تو یہی ہے مزاجداں کیلئے

نہیں ہوں نے مگر اتنا مجھے بھی ہے معلوم
فغاں ہے میرے لئے اور میں فغاں کیلئے

اڑا کے آہ کا شعلہ کبھی بنائینگے ہم
شبِ فراق میں خورشیدِ آسماں کیلئے

چلیں ہیں دیر کو مدت میں خانقاہ سے ہم
شکستِ توبہ لئے ارمغاں مغاں کیلئے

وبالِ دوش ہے اس ناتواں کو سر لیکن
نگار رکھا ہے ترے خنجر و سناں کیلئے

بیانِ دردِ محبت جو ہو تو کیونکر ہو
زباں نہ دل کے لئے ہے نہ دل زباں کیلئے

اشارہ چشم کا تیری یکایک اے قاتل
ہوا بہانہ مری مرگِ ناگہاں کے لئے

بنایا ذوق جو انساں کو اُس نے جزو ضعیف
تو اُس ضعیف سے کل کام دو جہاں کے لئے

---

[1] کانوں پر ہاتھ رکھنا۔ انکار کرنا۔ مکر جانا۔ کان میں کچھ پھونکنا۔ کسی کو اندر ہی اندر بہکا دینا۔

بادشاہی خواجہ سراؤں میں محبوب ایک خوجہ تھا۔ بیگم کی اُس پر بڑی مہربانی تھی۔ وہ بڑھتے بڑھتے میاں محبوب۔ اور میاں صاحب ہو گئے۔ جب بیگم ترقی کرتے کرتے وزارت کی مالک ہوئیں تو محل کے ساتھ مقدمات دربار کے اختیار بھی کل محبوب کو مل گئے۔ اور محبوب علیخاں نواب ہو گئے۔ سفید سیاہ۔ سو قوفی بحالی سب ایک خوجہ کی زبان پر تھی۔ بے علم۔ بے لیاقت۔ بیہودہ۔ اُس پر یہ اقتدار۔ ضرورتیں تھیں کہ علما۔ شرفا۔ امرا کو اس کے پاس ملتجی کر کے لیجاتی تھیں۔ اُس کمبخت مخنّث کو جوئے کا مرض تھا۔ شہر کے نامی نامی جواری ہر وقت جمع رہتے تھے۔ ایسے امن کی جگہ انہیں کہاں؟ حضور کبھی کبھی اس سے ناراض بھی ہو جاتے تھے۔ ایک دفعہ ناراضی بڑھ گئی۔ اُس نے لوگوں سے کہا کہ میں حج کو جاتا ہوں۔ بندہ آزاد استاد کی خدمت میں حاضر تھا۔ استاد کے کسی دوست نے کہا کہ یہاں صاحب حج کو چلے۔ ایسا اور صاحب بولے جاتا ہے نہ آتا ہے باتیں سنا کیجئے۔ استاد نے سن سن کر فرمایا۔

جوئل قمار خانے میں بت سے لگا چکے	وہ کعبتین چھوڑ کے کعبہ کو جا چکے

کئی مہینے کے بعد غزل پوری کی۔

جوئل قمار خانہ میں بت سے لگا چکے	وہ کعبتین چھوڑ کے کعبہ کو جا چکے
کیا خط لکھوں انہیں کہ جو لکھنے کی بات ہے	پہلے ہی غیر وہاں ہیں انہیں سب پڑھا چکے
آنا بلا سے ان کا قیامت سے کم نہیں	ہیں ہم تو مر چکے اُسے آنا ہوا چکے
زہر اب یا شراب یہاں سب ہے نوشِ جاں	ساقی پیالہ منہ سے ہم اب تو لگا چکے
اچھا کیا وفا کے عوض تم نے کی جفا	جانے دو تم بھی اب کہ کیا اپنا پا چکے

یاد آیا یہاں کے آنے کا وعدہ بھی خوب آپ نہیں ؟ — جب رات کو وہ پانوں میں مہندی لگا چکے

اے دل زمین پر بوجھ ہے یا آسماں کا بار — ہیں اب تو سر پہ بار محبت اُٹھا چکے

مدت سے موت زیست پڑے ہیں گلے کا ہار — تیغ نگہ تری کہیں قصہ چکا چکے

اب ڈھیر گر خرابۂ دنیا میں ہیں تو کیا — پہلے تو ہم بھی خاک بہت سی اُڑا چکے

باز آیا دیکھنے سے نہ آتش رخوں کے دل — سو بار آبلے اسے آنکھیں دکھا چکے

حاجت نہیں ہے تیرے شہیدوں کو غسل کی — ہیں تیغ آبدار سے خوں میں نہا چکے

سب ہم سے قیمتِ دل و جاں پوچھتے ہیں آج — ناز ان کے ایک نگاہ میں ہیں سب چکا چکے

ہو مر کے میں عشق کے قاضی نہ کیونکہ موت — جھگڑا یہ وہ نہیں ہے جو بے قضا چکے

اپنا ہی دل نہ پھیرے رخ سے یار کے — سر اپنا خوب حضرتِ ناصح پھرا چکے

تم بھولکر بھی یاد نہیں کرتے ہو کبھی !! — ہم تو تمہاری یاد میں سب کچھ بھلا چکے

دیکھو خدا کے نام نے روشن کیا نشاں — دشمن ہمارے نام کو کیا کر مٹا چکے

مسجد میں بیٹھے کیا ہو چلو میکدہ کو ذوق
اُٹھو کہیں۔ وظیفہ نبت بڑ بڑا چکے

چپکے چپکے غم کا کھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے — جی ہی جی میں تلملانا

ابر کیا۔ آنسو بہانا کوئی ہم سے سیکھ جائے — برق کیا ہے۔ تلملانا کو

ذکرِ حسنِ شمع لانا کوئی ہم سے سیکھ جائے — اُن کو در پردہ جلانا کو

جھوٹ موٹ افیون کا کھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے — اُنکو کف لاکر ڈرانا کو

لطف اُٹھانا ہے اگر منظور اُس کے ناز کا + — پہلے اُسکا ناز اُٹھانا

کہدو فاصد سے کہ جانے کچھ بہانہ دے ہمیں — گر نہ آنا

زخم تو سیتے ہیں سب سوزن الماس سے
چاک سینہ کا سلانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

پوچھے ملا سے جسے کرنا ہو سجدہ سہو کا
سیکھے گر اپنا بھلانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

تیر و پیکاں جتنے دل میں تھے وہ اسکو نکال
اپنے ہاتھوں گھر لٹانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

دیکھکر قاتل کو بھر لائے خراش دل میں خوں
سچ تو یوں ہے مسکرانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

خط میں لکھوا کر انہیں بھیجا تو مطلع درد کا
درد دل اپنا جتانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

تیغ تو اوچھی پڑی تھی گر پڑے ہم آپ سے
دل کو قاتل کے بڑھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

جب کہا مرتا ہوں وہ بولے مرا سر کاٹ کر
جھوٹ کو سچ کر دکھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

واہ رے ابرو۔ یہاں پھیری گلے پر تیغ
بات کا ایسا بھی پانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

آمد انکی از خود رفتہ ہو جاتے ہیں ہم
پیشوا لینے کو جانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

یہی کہا تھا تو کریگا ہم کو قتل
تیور و نکا تاڑ جانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

قسمت نے۔ وگرنہ اسکو غیر
کیا سکھائیگا سکھانا کوئی ہم سے سیکھ جائے

ہوا اے ذوق ہیں جوں مردمک ہم رو سیاہ
نہ آنکھوں میں سمانا ۔ کوئی ہم سے سیکھ جائے

ہ انسان کیلئے ہے
آراستہ یہ گھر اسی مہماں کیلئے ہے

من دل ہے مرے کیا کام
دل کعبہ ہے اور کعبہ مسلماں کیلئے ہے

وگرفتار تفکر
[illegible] قفس مرغ خوش الحاں کیلئے ہے

ت باری کے ہیں آثار
[illegible] باراں کیلئے ہے

[illegible] دشمن
[illegible] آگ نیستاں کیلئے ہے

خاک
[illegible] غزالاں کیلئے ہے

کچھ میرے نصیبوں سے زیادہ جو سیاہی
باقی ہے تو میری شبِ ہجراں کیلئے ہے

عاشق کا جنوں طرفہ تماشا ہے کہ ہر بات
گویا سبق اطفالِ دبستاں کیلئے ہے

وہ زلفِ سیہ پھینکتی کیوں دام ہے لپر
یہ صید کسی پنجۂ مژگاں کیلئے ہے

دل بھی ہے مرا جان ترے مشق ستم کی
جو تیر ہے اس تودۂ طوفاں کیلئے ہے

دل قیدِ تعلق سے نکل سکتا نہیں ذوق
کیا در نہیں اس خانۂ زنداں کیلئے ہے

چُنی تو نے افشاں جو اے مہ جبیں ہے
ستاروں میں کیا کیا چنان و چنیں ہے

نہ پوچھو کہ دل شاد ہے یا حزیں ہے
خبر بھی نہیں یہاں کہ ہے یا نہیں ہے

یہی گر تری چشم سحر آفریں ہے
تو دل ہے۔ نہ جاں ہے نہ ایماں نہ دیں ہے

صنم میرے دل کو خدائی کا تیری
یقیں ہے یقیں بلکہ عین الیقیں ہے

ہر ایک چاند دیکھے ہے انتیسویں کا
ہمن و باریک بیں ہے

گئے اشکبار آہ پہنچی فلک پر
مرا عشق کم خرچ و بالانشیں ہے

تغافل سے فرصت نہیں واں نظر کو
یہاں منتظر لب پہ جانِ حزیں ہے

پڑے تفقدے یہ جدائی سے تیری
کہ میں ہوں کہیں دل کہیں جاں کہیں ہے

شبِ غم میں دمساز و دلسوز اپنا
دمِ سرد ہے نالۂ آتشیں ہے

ہنسی ہے جو کچھ رنجش آمیز اُن کی
تو موجِ تبسم بھی چیں بر جبیں ہے

نہ ہووے اگر تجھکو دم کا بھروسا
تو جو دم ہے غافل دمِ واپسیں ہے

وہ پہلو میں بیٹھے ہیں اور بدگمانی
لئے پھرتی مجھکو کہیں کا کہیں ہے

ہنسی آتی ہے مجھکو جب تیرے آگے
کوئی ماہ کنعاں کو کہتا حسیں ہے

جو تم عرش سے دور بیٹھے تو بیٹھو + لگائے ہوئے میرا دل دور بیں ہے
نہیں وہ رہے ہم سے ۔ تم تھے جو پہلے زمانہ کو تو کچھ تغیر نہیں ہے
وہی ہے زمانہ وہی رات دن ہے وہی آسماں اور وہ ہی زمیں ہے

نہ کی آہ سوزِ غم دل پر اُٹھائے ۔
تجھے آفریں ذوق صد آفریں ہے

مرقوم الذیل مشاعرہ کی طرحی غزل ہے ۔ مرزا خدا بخش شاہزادہ کے ہاں پڑھی تھی ۔ حکیم آغا جان عیش استاد کے پاس ہی بیٹھے تھے ۔ انہوں نے اپنی غزل میں پڑھا

اے شمع صبح ہوتی ہے روتی ہے کس لئے | تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گذار دے

شعر کو دیکھو استاد کے ہاں بھی یہی مضمون تھا ۔ والد مرحوم اُستاد کے پہلو میں بیٹھے تھے ۔ اُن سے اُستاد نے کہا کہ مضمون لڑ گیا ۔ اب میں وہ شعر نہ پڑھوں ؟ اُنہوں نے کہا ضرور پڑھنا ۔ ان کا انداز معلوم ہوتا ہے ۔ کہ ایک نقطہ پر دو فقرے پہنچے ۔ اور کس کس انداز سے پہنچے ۔ حکیم صاحب کے بعد ہی ان کے آگے شمع آئی ۔ حکیم صاحب کو خدا مغفرت کرے کیا نیک نیت اور منصف مزاج تھے شعر مذکور سُن کر خوش ہوئے ۔ رسائی طبع کی تعریف کی اور کہا کہ آپ فی الواقع اُستاد ہیں ۔ (دیکھو صفحہ ۱۹۰)

چھلا نہیں تو چھلے کا گل اے نگار دے | پر کچھ نشانی اپنی مجھے یادگار دے
تو چشم میں سرمۂ دنبالہ دار دے | مفتونِ چشم کو یوں ہی ایک تیر مار دے
ہاتھ اپنا میرے ہاتھ میں کچھ تو نگار دے | جو اپنے ہاتھ کا نہ مجھے پشتِ خار دے
ٹانکے نہ زخمِ دل میں تیرا دلفگار دے | تو جب تلک گیسوئے مشکیں کا تار دے

دشنام ہو کے وہ ترش ابرو نہ ہار دے
یہاں دنشے نہیں جنہیں تُرشی اُتار دے

گلشن کو آب گر مژۂ اشکبار دے
بلبل بجائے بیضہ دُرِ آبدار دے

کیا خاک تجھ پہ جان کوئی جاں نثار دے
مٹی بھی جس کو تیرے دل کا غبار دے

وہ زلفِ مشکبار اگر ایک تار دے
پھر میں نہ لوں اگر کوئی مشک تتار دے

جولاں سمندِ ناز کو اے شہسوار دے
تو سرمہ چشمِ ماہ میں میرا غبار دے

وہ ناتواں ہوں میں کہ نہ جنبش کروں کبھی
پلٹے اگر نہ مجھ کو دلِ بیقرار دے

عشق اُس پری کا ہے وہ بلائے جا کہ اے جاں
یہ جن نہیں ہے جسکو سیانا اتار دے

ایسا نہو کہ آتے ہی آتے جوابِ خط
قاصد جوابِ زندگیٔ مستعار دے

غم یار کا رہیگا مرے ساتھ تا بہ حشر
سچ ہے کہ ساتھ یار کا کیونکر نہ یار دے

کرتا ہے یوں فغاں دلِ اُمید وارِ وصل
جیسے اذاں بلند کوئی روزہ دار دے

میں ہوں وہ گل کہ پہنچوں نہ گلبن سے خاک تک
جنبش اگر نہ مجھکو نسیمِ بہار دے

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات
ہنس کر گزار یا اسے رو کر گزار دے

میں ہوں نہ زندہ دل کہ مری جانِ بیقرار
برقِ جہاں کو آتشِ مردہ قرار دے

لے دامِ داغِ دل سے مرے سوزشِ آفتاب
وعدہ پہ روزِ حشر کے پر کون اعتبار دے

نے رحم ہے۔ نہ پاسِ مروّت۔ نہ منصفی
پھر جان کس امید پہ یہ جان نثار دے

ہو گرمیٔ وفا سے شگفتہ نہ گل کا دل
جاں اپنی اسپہ بلبلِ شیدا نہ ار دے

بے فیضِ حشر آپ مُصفّا کا ہے تو کیا
مانگوں تو ایک قطرہ نہ آئینہ وار دے

جانبازِ عشق جان تلک اپنی کھیل جائے
لیکن فگارِ عشق میں ہمت نہ ہار دے

جوں شمعِ مردہ کشتۂ زلفِ سیاہ کو
گر دے کفن تو دامنِ شب سا تار دے

چھوٹے کمان سے نہ تیرا اپنا چھوڑنا
یہ آہ تیر ناک میں اس کی ہزار دے

عاشق نہ بدلے انجم گردوں سے اپنے اشک
کیوں کوڑیوں کے مول در شاہوار دے

پشہ سے سیکھے شیوۂ مردانگی کوئی
جب قصد خوں کو آئے تو پہلے پکار دے

اس جبر پر تو ذوق بشر کا یہ حال ہے
کیا جانے کیا کرے جو خدا اختیار دے

پرانی غزل ہے۔ نظر ثانی نہیں ہوئی تھی۔

پوچھ مت راہِ وفا اُس نگہِ پرفن سے
رہنمائی کی نہ رکھ چشمِ دلا رہزن سے

خار نکلے عوضِ سبزہ مرے مدفن سے
بچ کے جانا کہ الجھ جائے ترے دامن سے

کافرِ عشق ہوں گر سر بھی جدا ہو تن سے
نکلے زنارِ محبت نہ میری گردن سے

تارِ ہر ساز کے پردہ میں محبت کے سبب
ایک فریاد نکلتی ہے دلِ آہن سے

ہوں میں وہ سوختہ جوں شمع کہ مثلِ فانوس
میرا پیراہنِ تن میرے جدا ہے تن سے

تیغِ غم سے ہو نہ کیوں سینہ سپر مرد وفا
کثرتِ زخم بدن پر نہیں کم جوشن سے

تیرہ بختوں کا ہے وہ کلبۂ تاریک بلا
ڈر کے خورشید بھی جھانکا نہ جہاں روزن سے

میں گرانبارِ محبت مراخوں بھی ہے گراں
جی دھڑکتا ہے ترے ناز کی گردن سے

خون مرا واغ نہیں دھوتا ہے تو کیا قاتل
یہ نہ چھوٹا ہے نہ چھوٹے گا ترے دامن سے

ہو گیا کاغذِ سوزن زدہ سینہ سارا
دل کی جو پھانس تھی نکلی نہ سرِ سوزن سے

گر جھکے تیغ تری سر ابھی حاضر ہے کہ ہم
اسپہ مرتے ہیں کہ تعظیم تو لی دشمن سے

چشمِ میگوں و صراحی بہ بغل۔ جامِ بکف
دیکھنا آج وہ گل آتا ہے کس چمن سے

چھوڑ کر گھر ترے تھوں سے نکل جائیں کہاں
سنگ ہمسایوں کو اے ذوق کریں سے

فلک تو میرہ ہی کی صبح سے تا شام چلتا ہے
مگر سیدھی نظر سے تیری اپنا کام چلتا ہے

بھرے جاؤنگا میں صیاد دم گلشن کے چلنے کا
مرے سینہ میں جبتک دم بزیرِ دام چلتا ہے

ہمیشہ دورِ عشرت ہے جو تم ہو اہلِ کیفیت
کہ مہر و ماہ سے دن رات یہاں ایک جام چلتا ہے

چلا پہلو سے اٹھکر جبکہ وہ آرامِ جان و دل
کہا آرام نے ہم سے کہ لو آرام چلتا ہے

تیرا تیرِ نگہ پیکِ قضا سے کم نہیں قاتل
جدھر چلتا ہے بنکر موت کا پیغام چلتا ہے

سمندِ وحشت اپنا شاخِ گل کے تازیانہ سے[۵۱]
جنوں کی شاہ راہوں میں سدا شہ گام چلتا ہے

کیا پختہ مزاجوں کو مسخر تو نے دنیا میں
یہ تیرا خوب جادو لے خیالِ خام چلتا ہے

عجب شطرنج گردوں ہے کہ جسمیں اپنے گھوڑے کو
نئے منصوبہ سے روز ابلق ایام چلتا ہے

کہو صیاد سے گر ذبح کرنا ہے تو جلدی کر
ابھی کچھ دم مرے سینہ میں زیرِ دام چلتا ہے

ارادہ گر کرے ناقص علو جاہ کامل کا
تو یہ جانو کہ نابینا کنارِ بام چلتا ہے

خرد نے رازِ عالم کچھ نہ پایا ذوق اگر پایا
کہ بے آغاز آیا اور بے انجام چلتا ہے

پھولا نہیں سماتا جو گل پیرہن میں ہے
آتا یہ کس بہار سے بہنستا چمن میں ہے

مہ میں کہاں جو تاب رخِ سیم تن میں ہے
پردہ سا عنکبوت کا سقفِ کہن میں ہے

دم کو نہیں ہے سینہ میں آرام ایک دم
یہ وہ غریب ہے کہ مسافر وطن میں ہے

حرف آئے مجھ پہ دیکھئے کس کس کے نام سے
اس رخ سے عقیق کا دل خوں یمن میں ہے

رنگیں ہے آج کل کے گل نو بہار سے
اگلا جو برگ زرد کوئی اس چمن میں ہے

[۵۱] پہلے فرمایا تھا۔ سمند وحشت اپنا چوب گل کے تازیانہ سے ۔ پھر فرمایا ہر شخص نہ سمجھے گا۔ عام لوگونکو کیا خبر ہے کہ ایران میں جسے موسم بہار میں جنون ہو جاتا ہے اسپر یہ ٹوٹکا کرتے ہیں تو اچھا ہو جاتا ہے ۔ اور اسے چوب گل زدن کہتے ہیں ۱۲

وہ دل کہ لا نہ سکتا تھا چینِ جبیں کی تاب	زیرِ شکنجۂ زلفِ شکن در شکن میں ہے
یاد آتا ہے جو آبِ دمِ تیغ کا مزا	بھرا تا میرے زخمِ کہن پانی دہن میں ہے
ہیں وزنِ دہن میں جو کژدم لئے ہوئے	یہاں کام اُنکا نیش زنی ہر سخن میں ہے
دکھلا دو پشتِ لب پہ تم اپنی دُرِ بلاق	دیکھیں سہیل کیونکہ چمکتا بین میں ہے

ہوش و خرد کو دیکھ لیا در دسر میں ذوق
آرام کو بھی دیکھ کہ دیوانہ پن میں ہے

غزل مذکورۂ ذیل ابتدائی مشق ہے۔ اسوقت اُستاد کی ۱۶ ۱۷ برس کی عمر تھی مجھے یاد ہے ایکدن والد مرحوم کو اُستاد نے کچھ پرانے مسوّدے دئے۔ میں اُن دنوں لڑکا تھا۔ وہ دیکھتے جاتے تھے۔ اور ہر کاغذ پر حسبِ حال کچھ کچھ کہتے بھی جاتے تھے۔ جس پرچہ پر غزل مرقومۂ ذیل کے شعر لکھے تھے۔ اُسے دیکھکر والد نے افسوس کیا۔ اور کہا۔ اوہو۔ دیکھو جی! یہ وہ غزل ہے! بھئی کیا دن تھے وہ۔ اُس حوم کا بھی افسوس ہی ہے۔ اُستاد نے کہا۔ افسوس۔

پھر ایکدن میں نے والد سے پوچھا۔ تو معلوم ہوا کہ شاہ نصیر مرحوم کے بیٹے وجیہ الدین نصیر تھے۔ ان کی بھی اس زمانہ میں ۱۶ ۱۷ برس کی عمر تھی۔ اور طبیعت بھی تیز تھی اُستاد کے ساتھ اکثر غزلوں اور شعروں کے معرکے رہتے تھے۔ ایکدن انہوں نے استاد سے کہا۔ مصرع طرح کرتے ہیں آؤ غزل لکھو۔ لڑکپن کا عالم تھا۔ اُستاد نے کہا۔ کہو۔ کہینگے۔ مگر غزل کہی۔ اُستاد سے (شاہ صاحب) کہوالی۔ پھر کہا کیا؟ نصیر نے کہا اچھا پھر تم بتاؤ۔ اُستاد نے کہا۔ ہم تم یہیں بیٹھکر کہیں۔ دونو بیٹھ گئے۔ اور طبع آزمائی ہونے لگی۔ استاد نے ڈیڑھ دو گھنٹہ میں غزل لکھی اور کہا کیوں صاحب!

اُنھوں نے بھی غزل کہی تھی۔ دونو غزلیں پڑھی گئیں۔ اُستاد نے اپنی غزل اُنھیں دی۔ اور چلے آئے۔ دوسرے دن اُستاد گئے تو اُنھوں نے کچھ اور شعر بھی سنائے۔ بعض میں ترمیم تھی۔ بعض اشعار پر اُستاد نے کہا۔ یہ شعر تمہارے ہیں؟ انھوں نے کہا بے شک۔ استاد نے کہا اب یہ شعر اُستاد (شاہ صاحب) کے ہیں۔ صاف معلوم ہوتا ہے۔ اِنھوں نے کہا۔ واہ ہمارے ہیں۔ اسپر خوب گفتگوئیں رہیں۔ طرفین کے یاروں میں صلاحیں مشورے۔ اور مقابلے ہوتے رہے۔ خدا کی شان ہے شاہ وجیہ الدین نوجوان دُنیا سے گئے۔ اُستاد بڈھے ہوئے تو کیا۔ آخر چلے ہی گئے۔ افسوس افسوس وقت گذرتا ہے۔ باتیں یاد رہ جاتی ہیں۔ آلھی ہم سے نیکی اور راستی یادگار باقی رکھیو۔ غزل مذکور میں سے جو کچھ باقی ہے وہی لکھدیتا ہوں۔

یہاں کے آنیکا مقرر قاصدا وہ دن کرے
جو تو مانگیگا وہی دونگا خدا وہ دن کرے

کونسی شب آئیگا وہ مہ منجم سے کہو
میرے سعد و نحس کا معلوم تا وہ دن کرے

تو کرے قرباں ہمیں جسدن۔ ہمارے واسطے
عید قرباں سے شرف پیدا سوا وہ دن کرے

جب کہا قاصد نے دن وعدہ کا آیا تو کہا
اُس سے کہدیوں ہی محشر تک بڑھا وہ دن کرے

تیغ قاتل سے ہے جو قتل کے دن بے نصیب
عید کے دن کو نہ کیوں عاشورہ کا وہ دن کرے

دن قیامت کا تو ہے۔ پر میرا طومار عمل
ہائے اتنا ہے کہ امکاں کیا وفا وہ دن کرے

نیک و بد سب دن خدا کے ہیں لکھی جسدن کی سو
کچھ تو لیکن فرمائش کیا قضا وہ دن کرے

لاش دفنا کر مری بیٹھا ہے قاتل سوچ میں
یعنے میری فاتحہ کا کونسا وہ دن کرے

ذوق کہتا تھا کروں گا جمعہ کو حج کا عمل
کوئی اس کو جا کے بتلادے۔ ہوا وہ دن کرے

یہ غزل بھی اُسی عہد کی ہے مسوّدات مذکور سے نقل کی ہے ۔

کوئی کمر کو تری ہو اگر کمر تو کہے ۔ کہ آدمی جو کہے بات سوچ کر تو کہے ۔
مری حقیقتِ پُر درد کو کوئی اُس سے یہ آہ و نالہ نہ کہوے بہ چشمِ تر تو کہے ۔
یہ آرزو ہے جہنم کو بھی کہ آتشِ عشق مجھے نہ شعلہ گرا پنا کہے شرر تو کہے
بقدرِ مایہ نہیں گر ہر ایک کا رتبہ و نام بھلا حُباب کو دیکھیں کوئی گہر تو کہے
جو جب لگا کے نہ بیٹھے تو کیا کرے ناصح کہ جانتا ہے کہے کا ہو کچھ اثر تو کہے
جل اُٹھے شمع کی مانند قصّہ خواں کی زباں ہمارا قصّۂ پرسوز لحظہ بھر تو کہے
شہیدِ عشق کا ہر قطرہ خوں انا الحق ہے کہے جو حق کوئی منصور اسقدر تو کہے
مجال کیا کہ ترے آگے فتنہ دم مارے کیگا اور تو کیا ۔ پہلے الحذر تو کہے
بھر لگا با رِ محبّت کی کیا فلک نامی یہ حوصلہ کوئی رکھے بجز بشر تو کہے
بلا سے ہووے مرا مرغِ نامہ بر بھونرا کہ اُس کو دیکھکے مُنہ سے خوشخبر تو کہے[1]

سرشکِ چشم مرے ہیں کہ ہو گئے موزوں
مری طرح سے کوئی ذوقِ شعر تر تو کہے

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائینگے مر گئے پر نہ لگا جی تو کدھر جائینگے
سامنے چشمِ گہربار کے کہدو دریا چڑھکے گر آئے تو نظروں سے اُتر جائینگے
تم نے ٹھیرائی اگر غیر کے گھر جانے کی تو اِرادے یہاں پھر اَور ٹھیر جائینگے
خالی اے چارہ گرو ہونگے بہت مرہمداں پر مرے زخم نہیں ایسے کہ بھر جائینگے

[1] دِلّی میں رسم تھی کہ جب بھونرا اڑتا ہوا پاس آتا تھا تو اسے شگون نیک سمجھتے تھے ۔ اور کہتے تھے ۔ خوشخبر ۔ خوشخبر ۔ خاندان تباہ ہو گئے ۔ وہ لوگ اب نہیں ۔ کون کہے اور کون سنے +

لائے جو مست ہیں تیرے پہ گلابی آنکھیں
اور اگر کچھ نہیں دو پھول تو دھر جائینگے

پہنچینگے رہگذر یار تلک کیونکر ہم
پہلے جبتک نہ دو عالم سے گذر جائینگے

آگ دوزخ کی بھی ہو جائیگی پانی پانی
جب یہ عاصی عرق شرم سے تر جائینگے

ہم نہیں وہ جو کریں خون کا دعوے تجھ سے
بلکہ پوچھے گا خدا بھی تو مکر جائینگے

رخ روشن سے نقاب اپنے اُلٹ دیکھو تم
مہر و مہ نظروں سے یاروں کی اُتر جائینگے

شعلۂ آہ کو بجلی کی طرح چمکاؤں
پر یہی ڈر ہے کہ وہ دیکھ کے ڈر جائینگے

ہم بھی دیکھینگے کوئی اہل نظر ہے کہ نہیں
یہاں سے ہم جب روش تیر نظر جائینگے

ذوق جو مدرسہ کے بگڑے ہوئے ہیں ملّا
اُن کو میخانہ میں لے آؤ سنور جائینگے

دل بچے کیونکر بتوں کی چشم شوخ و شنگ سے
اپنا گھر تو سوجھتا ہے سینگڑوں فرسنگ سے

اے تغافل کیش جلدی آکہ تو واقف نہیں
اس دل بیتاب و جان مضطر کے ڈھنگ سے

بل بے باریکی کہ گویا ہر تیرا تار سخن +
جنتری میں کھینچے نکلے ہے دہان تنگ سے

ایک بھی نکلے نہ میری سی صدائے دلخراش
خون اگر ٹپکے نوائے مرغ خوش آہنگ سے

چھپ کے بیٹھے گا کہاں تو ہم سے اے رنگیں ادا
ہو گا تو جس رنگ میں ملجائینگے اس رنگ سے

جوش گریہ سے رہی برسات برسوں پر کبھی
اسکی تیغ تیز آلودہ نہ دیکھی زنگ سے

پہلے یہ نیت وضو کی ہے نماز عشق میں
دل سے کہدیجے کہ دھوئے ہاتھ نام و ننگ سے

میرے رونے کے اثر سے ہو گئے پتھر بھی آب
جھڑتے ہیں جائے شرر پانی کے قطرے سنگ سے

ذوق زیبا ہے جو ہو ریش سفید شیخ پر
وسمہ آب ننگ سے۔ میدھی نے گرنگ سے

کوئی ان تنگ دہانوں سے محبت نکرے
اور یہ تنگ کریں مُنہ تو شکایت نکرے

ہے جراحت کا مری سودۂ الماس علاج
فائدہ اسکو کبھی سنگِ جراحت نکرے

عشق کے داغ کو دل مُہرِ نبوّت سمجھا
ڈر ہے کافر کہیں دعوائے نبوّت نکرے

ہر قدم پر مرے اشکوں سے رواں ہیں دریا
کیا کرے جادہ اگر ترکِ رفاقت نکرے

آج تک خوں سے مرے تر ہے زبانِ خنجر
پر کرے کیا جو طلب کوئی شہادت نکرے

مکتبِ صبحِ ازل کا ہے خلیفہ انساں
پھر کرے کون اگر یہ ہی خلافت نکرے

بن جلے شمع کے پروانہ نہیں جل سکتا
کیا کرے عشق اگر حسن ہی سبقت نکرے

پھر چلا مقتلِ عشاق کو قاتل اے ذوق
سر پہ برپا کہیں کشتوں کے قیامت نکرے

کہتے ہیں جھوٹ سب۔ کہ نہیں پانو جھوٹ کے
جھوٹے تو بیٹھتے بھی نہیں پانو ٹوٹ کے

چلتا ہو ذوق قید سے ہستی کی چھوٹ کے
یہ قید مار ڈالے گی دم گھوٹ گھوٹ کے

ڈھالا جو تجھکو حسن کے سانچے میں اے صنم
آنکھوں کی جائے بھر دئے موتی سے کوٹ کے

بے درد سینہ کونسا خالی نہیں مرا
دل میں بھرا ہے درد مرے کوٹ کوٹ کے

کیونکر حباب ہو سکے دریائے بیکراں
دریا سے جبتلک نہ ملے ٹوٹ پھوٹ کے

اس شمع رو سے رات کو رخصت ہوئے جو ذوق
روئے ہیں دل کے آبلے کیا پھوٹ پھوٹ کے

ہر دم لخونگشتہ میں ایک جوش فزوں ہے
جو آہ ہے سینہ میں سو فوارۂ خوں ہے

دنیا کی ہے رفعت کا سبب پستیٔ ہمت
گردوں کو ہے اوج اس سے زمانہ میں کہ دوں ہے

پھر جاتی ہے سینہ کو مری آہ بھی اُلٹی
قسمت ہے جو برگشتہ ہوئی بختِ نگوں ہے

میں درد سے ہوں عشق کے بیٹھا ہوا لبریز
پر دل یہی کہتا ہے کہ ہرگز نہ کہوں - ہے !

ایک غمزۂ چشم فسونکار کا کافر
سو چشم پری کو سبق آموزِ فسوں ہے

دل کرتا ہے اس کوچہ کا جب قصد تو لیتا
طائر کے عوض رنگِ پریدہ سے شگوں ہے

قایم ہے بنا درد کی فریاد سے میری
جو نالہ ہے ایوانِ محبت کا ستوں ہے

جس دن سے ہوا عشق مرے درپے تعلیم
ہر خارِ بیابان قلم مشقِ جنوں ہے

مرجاؤں مگر رازِ محبت نہ جتاؤں
کیسا ہی اگر درد ہو دل میں نہ کہوں - ہے

بیتابیٔ دل لفظوں میں کیا آئے کہ ہر حرف
دکھلا رہا گاہے حرکت گاہ سکوں ہے

بیتابیٔ دل کا کوئی مضموں جو ہو انظم
ہر حرف پہ میرے حرکت جائے سکوں ہے

تنخواہِ حسرت کو پیوں کیوں نہ مزے سے
میری یہی تبریدِ تپ سوزِ دروں ہے

ہے وصل میں غم ہجر کا اور ہجر بلا ہے
آرام محبت میں ہمیں یوں ہی ووں ہے

آلودہ اظہار نہ ہو رازِ محبت
دم ہو نہ تو نپہ آجائے مگر میں نہ کہوں - ہے

کہو آپکو گرد ڈھونڈتا ہے عشق کی منزل
گم گشتگی اس رہ میں تری راہ نموں ہے

ہاروت ہے وہاں لاکھوں ہیں شاگرد کہ جسجا
وہ چشم فسوں گر سبق آموزِ فسوں ہے

کیوں حالِ زبوں اپنا بیاں کرتا ہے اُن سے
اے ذوق ترے واسطے یہ سخت زبوں ہے

کرے ہے کام تیغِ یار کس کس آبداری سے
دکھاتی اپنی گلکاری ہے کیا کیا زخمکاری سے

زباں کھولینگے مجھ پر بدزباں کیا بدشعاری سے
کہ میں نے خاک بھڑی اُنکے منہ میں خاکساری سے

گذرتی ہے مزہ میں زندگی غفلت شعاری سے
مرے نزدیک بیہوشی ہے بہتر ہوشیاری سے

نہوتا گر وہ شوخِ خودنما سرگرمِ آرائش
اُٹھاتا ہاتھ خورشیدِ فلک آئینہ داری سے

روا ہے شمع کے شکو نہیں چربی خاکِ گھل گھل کر
بہا جاتا ہے دل خوں ہو کے اپنا اشکباری سے

خبر کیا پوچھتے ہو اپنے بیمارِ محبت کی
کہ نوبت دم شماری کی تھی شب اختر شماری سے

جو پوچھے زاہد خشک اپنی دارو کمنڈے پی لے
اگر پرہیز کو پوچھے۔ کہو پرہیز گاری سے

قفس کو لے اڑیں صیاد اسیرِ مضطرب میرے
خبر گل کی اگر اڑتی سنیں بادِ بہاری سے

کبھی گر سر اٹھایا تو جوں اشک سرشرگاں
زمیں کو جا لگا سر جھک کے اپنا شرمساری سے

اٹھائے جاؤں کبتک داغ۔ کاش انکے عوض ہوتے
مری چھاتی پہ پتھر سنگدل دو چار بھاری سے

لگی بھی گر زمیں کو بیٹھ تیرے تفتہ جانو کی
تو مثل برق اٹھ بھاگے وہیں پھر بیقراری سے

نہیں آتا نہ آئے رحم اے **ذوق** اس ستمگر کو۔
بلا سے خوش تو ہو جاتا ہے میری آہ و زاری سے

یہ غزل بھی امام شباب کی ہے۔ شاہ نصیر کے عہد میں کہی تھی۔

یار ہنسنے حال پر ہم دلفگاروں کے لگے
کاش کے ایسے ہی یارب دلکو یاروں کے لگے

اور بھی چمکا سمندِ وحشت اپنا دشت میں
تیز جوں مہمیز نشتر جبکہ خاروں کے لگے

کسکی کفشِ پا پہ دیکھے ہیں ستارے اے فلک
رہتے ہیں دیدے زمیں کو جو ستاروں کے لگے

بزم میں گروہ الٹ دے روئے روشن سے نقاب
چھوٹنے مہتاب منہ پر ماہ پاروں کے لگے

اسطرح دو پے دلونکے ہیں تیرے چشم و نگاہ
جوں شکار افگن پھریں پیچھے شکاروں کے لگے

سرمہ میں باغِ الفت میں ترے اے فتنہ گر
تخلِ قامت جب ترے سینہ فگاروں کے لگے

ٹہنیاں تیروں کی نکلیں پھولے سوفارونکے گل
خنجرونکے برگ غنچے پھل کٹاروں کے لگے

ہوا گر گرمِ فغاں مرغِ چمن میری طرح
آگ دم میں آشیانونکو ہزاروں کے لگے

آئے ہم اس بزم میں یکدم سو اسپر سینکڑوں
تیغے طعنوں کے لگے خنجر اشاروں کے لگے

اے خدنگِ یار مرہم جائیں غیرت سے نہ کیوں
مرہم آکر زخم پر سینہ فگاروں کے لگے

ذوق صحرائے جنوں میں ہوگیا ہے گرد باد
تو سنِ وحشت کو ہیں مہمیز خاروں کے لگے

باغِ عالم میں جہاں نخلِ حنا لگتا ہے
دل پُرخوں کا وہاں ہاتھ پتا لگتا ہے

کیا تڑپنا دلِ بسمل کا بھلا لگتا ہے
جب اُچھلتا ہے ترے سینہ سے جا لگتا ہے

دل کہاں سیرِ تماشے پہ میرا لگتا ہے
دل کے لگ جانے سے جینا بھی بُرا لگتا ہے

جو حوادث سے زمانہ کے گرا کب اُٹھا
نخلِ آندھی کا کہیں اُکھڑا ہوا لگتا ہے

دل لگی کا ہے مزا یہ کہ گزک میں اے دل
سب کبابوں سے نمک تجھکو سوا لگتا ہے

نہ شبِ ہجر میں لگتی ہے زباں تالو سے
اور نہ پہلو مرا بستر سے ذرا لگتا ہے

ہائے محتاج ہوا مرہمِ زنگار کا تو۔
زخمِ دل! زہر مجھے ہنسنا ترا لگتا ہے

آبِ خنجر سے جو زہراب و فادارونکو
ملکِ سرحد ہے فا پانی ذرا لگتا ہے[1]

قدِ مجنوں ترے پھولونکی چھڑی ہے لیلےٰ
جب ذرا جھکتا ہے سرپانو سے جا لگتا ہے

زر و زاہد ہے تو کیا! کھوٹ ابھی ہے دل میں
ذوق اس زر کو کسوٹی پہ کسا لگتا ہے

ادائی طرزِ نالہ کی تھی ایکدم تیرے مخزوں سے
سوا بتکد کیھ لے منقاطِ طوطی سُرخ ہے خوں سے

نہ شب آنکھوں میں خواب آیا خیالِ خالِ شبگوں سے
رہے بیدار ساری رات ہم ایک جنبِ افیوں سے

اڑائیں پون جادوگر بلا سے ہم نہیں ڈرتے
ہے اپنا دم ہوا ہوتا تری چشمِ پُرافسوں سے

[1] بعض بعض پہاڑوں یا جزیروں کا پانی خاص خاص طبیعت کے اشخاص کو ایسا ناموافق ہوتا ہے کہ امراض مہلک میں گرفتار ہوکر مرجاتے ہیں۔ محاورہ میں کہتے ہیں۔ کہ فلاں مقام کا پانی لگتا ہے۔ فلاں شخص فلاں سفر میں مرگیا پانی لگا تھا ۱۲

یہ نیا ہے خمخانہ کہ جسمیں دورِ گردوں نے
گِل حکمت کے کتنے ہی خم خاکِ فلاطوں سے

اثر ہو نالۂ پر درد کا اتنا تو اے بلبل
کہ ٹپکے جائے شبنم اشکِ انجم چشمِ گردوں سے

شہیدِ چشمِ میگوں ہوں کہو تربت پہ سب میکش
کریں آ کر چراغاں ساغرِ صہبائے گلگوں سے

ترے مجنوں کے تن پر لاغری کا قطع ہے جامہ
بنا تا پیرہن ہے ایک برگِ بیدِ مجنوں سے

خدا جانے ہوئے بہت اپنے دشمن اسکی زلفوں نے
و یا زلفیں ہیں اسکی دشمنِ گوں مجھ بخت دشمنوں سے

اُسی باغِ سخن میں **ذوق** جی اپنا بہلتا ہے
جہاں نو عشق کی آتی ہے کچھ گلہائے مضموں سے

نگہ کا وار تھا دل پر پھڑکنے جان لگی
چلی تھی برچھی کسی پر کسی کے آن لگی

ترا زباں سے ملانا زباں جو یاد آیا
نہ لے لئے میں تالو سے پھر زبان لگی

کسی کے دل کا سنو حال دل لگا کر تم
جو ہو سکے تو دل کو تمہارے بھی مہربان لگی

تو وہ ہلال جبیں ہے کہ تارے بن بن کر
رہے ہے تیری طرف چشمِ یک جہان لگی

خدا کرے کہیے تجھ سے یہ کچھ خدا لگتی -
کہ زلف اے بت بد کیش تیرے کان لگی

اُڑائی حرص نے آکر جہاں میں سب کی خاک
نہیں ہے کس کو ہوا زیرِ آسمان لگی

تمہارے ہاتھوں ہمارے دلِ فگار میں آہ
سُنان و خنجر و پیکاں کی ہے دکان لگی

کسی کی کاوشِ مژگاں سے آج ساری رات
نہیں پلک سے پلک میری ایک آن لگی

تباہ بحرِ جہاں میں تھی اپنی کشتیِ عمر
سو ٹوٹ پھوٹ کے بارے کنارہ آن لگی

خدنگِ یار کو کس طرح کھینچ لوں دل سے
کہ اس کے ساتھ ہے اے **ذوق** میری جان لگی

وہ ہو نہیں تو پھر سی سنوشتِ سوزِ ندامت
خندہ دوزخ کرے جسکے شرارِ سنگِ تربت سے

وہی ہے ایک سب میں دیکھ لو چشمِ حقیقت سے
بنا واحد کی کیوں ٹوٹے گا ملا جمعِ کثرت سے

نہ سوکھے دامنِ تر ذرہ میرا۔ اور جوں اختر
رواں ہوں اشکِ خجلت چشم خورشید قیامت سے

دمِ تکبیر اٹھا دے وجہاں سے ہاتھ یک باری
نمازِ عشق کی ہم نے ادا کیا حسنِ نیت سے

اگر پوچھے کوئی مجھ سے کہ کیوں دن رات نالاں ہے
تو میں کہدوں محبت سے محبت ہے محبت سے

برائے شوکتِ دنیا یہ لجو عارِ دین اٹھا
سمجھیو شوکۃ الغرب کو بہتر ایسی شوکت سے

نمک ہو مشک ہو۔ یا سوءُ الماس تم چھڑکو
جراحت کو مرے کیا کام ہے سنگ جراحت سے

پڑھو گر فاتحہ تم آکے مرقد پر شہیدوں کے
تو یاس اٹھکر اشارہ کردے انگشتِ شہادت سے

حریصوں کو نہیں جا۔ وسعت آبادِ قناعت میں
جو کھینچے ہاتھ کو وہ پانو پھیلاوے فراغت سے

الف کو تیری قامت کے کیا استادِ قدرت نے
مزین صفحۂ ہستی پہ یکتائی کے خلعت سے

لبِ ہر زخم میرا ہے ہلالِ عید سے خوشتر
مجھے زخمی کیا ہے کس نے ابرو کی اشارت سے

بہت اچھا کیا مجھکو کیا گر قتل قاتل نے
کہ ہوگا نہ عاشق اب کوئی اور اسپہ عبرت سے

علاجِ زخمِ تیغِ یار سے ہرا تیزابِ تیغ اسکا
نہیں سنگ فساں کچھ کم مجھے سنگِ جراحت سے

اگر آرائشِ ظاہر ہو بد باطن کو کیا حاصل
بھلا باطن میں رتبہ کیا ہے اسکو نیک طینت سے

ہوئی حرفوں میں گو یک نقطہ رحمت سے سوا زحمت
عدد میں ہے مگر رحمت زیادہ ہوتی زحمت سے

زبان ریختہ کردی زباں اہلِ ولایت کی
محبت ذوق کو از بسکہ ہے شاہِ ولایت سے

غزل مرقومۂ الذیل ابتدائی مشق کی ہے۔ ردیف کو دیکھو عہدِ مذکور کا محاورہ سُناتی ہے۔

ولایت ۳۰۔۴۰۔ برس ہوئے کہ اہلِ ولایت۔ مردِ تازہ ولایت۔ شمشیرِ ولایت۔ عنابِ ولایتی۔ مردِ ولایتی۔ اور مردِ ولایت زاد۔ اور بلی ولایتی کہتے تھے۔ اور لوگ اس سے ولایت ایران سمجھتے تھے۔ اب کوئی ولایت کہتا ہے تو انگلستان سمجھتے ہیں۔ دیکھو لفظ وہی ہے مفہوم بدل گیا۔ آزاد

ملنا ہمارا ان کا تو کب جائے ہے
البتہ آدمی سو کبھی آئے جائے ہے

جو اُس گلی میں مثلِ صبا آئے جائے ہے
فردوس میں کب اُسکو تمنائے جائے ہے

کہتے ہیں لوگ موت تو سب جائے جائے ہے
پر بیر پاس اسے بھی کوئی کھائے جائے ہے

ٹوٹا ہے کس تنگ کا بازو کہ شمع بزم
یوں روغن اشک گرم سے ٹپکائے جائے ہے

لکھو کے بھیجدیتا ہے ایک پرچہ گاہ گاہ
دل کو ذرا ذرا مرے پرچائے جائے ہے

ابرِ ثمرہ برس کے اگر کھل گیا تو کیا
نالہ تو وہ ہی آگ سی برسائے جائے ہے

فوارہ سے بجا ہے تواضع کا سیکھنا
اس سرکشی پہ سر کو وہ نہوائے جائے ہے

کیا حالِ جسمِ زار کہوں سوزِ عشق سے
ایک بال ہے کہ آگ پہ بل کھائے جائے ہے

مضمونِ اضطراب کا ہے یہ بھی ایک اثر
وہ مرغِ نامہ بر کو جو پھڑکائے جائے ہے

تابوتِ ترے کشتہ کو پنیں سے کم نہیں
کیا پانو اپنے چین سے پھیلائے جائے ہے

سو کوس کیا! نہ جا سکے مجنوں تو دو قدم
پر شوقِ مدعا ہے کہ دوڑائے جائے ہے

جبتک کہ جان تن سے نکل جائیگی نہ ذوق
دل میں جو درد ہے سو کوئی ہائے جائے ہے

کچھ نہیں چاہیے تجہیز کا اسباب مجھے
عشق نے کشتہ کیا صورت سیماب مجھے

اس نے مارا رخِ روشن کی دکھا تاب مجھے
چاہیے جائے کفن چادر مہتاب مجھے

کل جہاں سے کہ اُٹھا لائے تھے احباب مجھے
لیچلا آج وہیں پھر دلِ بیتاب مجھے

چمنِ دہر میں جوں سبزۂ شمشیر ہوں میں
آب کی جائے دیا کرتے ہیں زہراب مجھے

ہیں وہ مجنوں ہوں کہ مجنوں بھی ہمیشہ خطِ پیر
قبلہ و کعبہ بنا کرتا ہے القاب مجھے

سفرِ عمر ہے یا رب کہ ہے طوفانِ بلا +
ہر قدم سیلِ حوادث کا ہے گرداب مجھے

جو مرے تف جو ہر ہیں وہ رکھتے ہیں عزیز
تیرہ بختی میں بھی جوں تیغ سیہ تاب مجھے

کنجِ تنہائی میں دیتا ہوں دلاسے کیا کیا
دلِ بیتاب کو ہیں اور دل بیتاب مجھے

میں تڑپا جو دمِ ذبح تو یہ باعث تھا
کہ رہا تھا نظرِ عشق کا آداب مجھے

ورنہ وہ شوخ کہ جوگل سے بھی نازک ہو سوا
لیوے اس طرح سے زانو کے تلے داب مجھے

ہو گیا جلوۂ انجم میری آنکھوں میں نمک
کیونکہ آئے شبِ ہجراں میں کہو خواب مجھے

گردشِ چرخ ہے اے ذوق مہندس کے لئے
آسماں اس کو نظر آتا ہے دولاب مجھے

تیرِ اُس نگہ کا گر دلِ مضطر میں گھر کرے
ناسورِ عشق زخم کے پھر گھر میں گھر کرے

کیڑا ذرا سا آوے وہ پتھر میں گھر کرے
انسان وہ کیا نہ جو دلِ دلبر میں گھر کرے

چشمِ سیہ تمہاری نظر بھر کے دیکھے جب
لالہ میں داغ دے گلِ عبہر میں گھر کرے

یوں تیرے دل میں چبھتی ہے ندا نکی اسکے تاب
ہیرے کی جوں کنی دلِ گوہر میں گھر کرے

گلگشت چیں نہیں کہ گئے صبح شام آئے
دل ہو کہ اُسکی زلفِ معنبر میں گھر کرے

دکھلائے جوشِ گریہ اگر میری چشمِ تر
مردم کے غرق سینکڑوں پل بھر میں گھر کرے

گنبد میں گر دباد کے مجنوں نے گھر کیا
سرگشتہ ایسا کون کہ چکر میں گھر کرے

یوں رنگِ رخ پہ اسکے جما ہے مرا خیال
جس طرح رنگ برگِ گلِ تر میں گھر کرے

خونِ شہیدِ ناز کو دھونا تھا کیا بھلا۔
یہ رنگ وہ نہیں ہے کہ خنجر میں گھر کرے

دُزدِ نگہ تو آنکھوں میں گھر کر رہے ہیں ذوق
دل جس کا گم ہوا۔ کہو کس گھر میں گھر کرے

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے
پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے

کم ہونگے اس بساط پہ ہم جیسے بدقمار
جو چال ہم چلے سو نہایت بری چلے

ہو عمر خضر بھی تو کہینگے بوقتِ مرگ۔
ہم کیا رہے یہاں۔ ابھی آئے ابھی چلے

لیلیٰ کا ناقہ دشت میں دکھلاتا ذوق و شوق
سُنکر فغانِ قیس بجائے حدی چلے

نازاں نہ ہو خرد پہ جو ہونا ہو وہ ہی ہو
دانش تری نہ کچھ مری دانشوری چلے

دنیا نے کس کا راہ فنا میں دیا ہے ساتھ
تم بھی چلے چلو یونہی جبتک چلی چلے

جاتے ہوائے شوق میں ہیں اس چمن سے ذوق
اپنی بلا سے بادِ صبا اب کبھی چلے

لیا ایمان و دین تو نے اگرچہ ایک نہ مانے سے
نہیں سیر اب بھی اے ظالم ترا ایماں تھکانے سے

سنگر تو نے رد کا سبکو میرے پاس آنے سے
اجل بھی اب یہاں آئے تو آئے کچھ بہانے سے

ڈھلینگے شمع کے سانچہ میں گذرے سر پہ جو گذرے
بہینگے آنسو نہیں اُنکے آگے اس بہانے سے

پڑے تسبیح زاہد پر نگاہِ مست اگر تیری
تو ٹپکے بادۂ انگور اسکے دانے دانے سے

تمہاری نعل کے کوچوں میں پھرتا ہے وہ دیوانہ
پتا لینا ہو گر دل کا تو لینا اپنے شانہ سے

کہاں جاؤنگا اڑکر طائرِ بے بال و پر ہو نہیں
قفس صیاد کا بہتر ہے مجھکو آشیانہ سے

نہ کیجو خوانِ دوں ہمت پہ ہاتھ اے ذوق آلودہ
کہ یہ کھانا مرے آگے ہے بدتر زہر کھانے سے

جاں بخش لبِ جاں بخش پر۔ دل غش خطِ مشکیں پہ ہے

عیسائی اپنے دیں پہ ہے۔ موسائی اپنے دیں پہ ہے

دے سین کی صورت دکھا۔ تو ہنس کے دانت اپنے ذرا

یاسین - کیا پڑھوا رہا - قاتل مرے بالیں پہ ہے

بلبل کا دل ہے خوں فشاں - ہیں عشق کی نیرنگیاں

سرخیٔ رنگِ گل کہاں - یہ دامنِ گلچیں پہ ہے

حرفِ زبانی ہو کہ خط - قول اُن کا سچ ہو یا غلط

میری تو اَب تسکیں فقط - اے دل تری تسکیں پہ ہے

ہے خوشۂ انگور یا - کرتا ہے دل پر آبلہ ✣

صد خندۂ دنداں نما - شب خوشۂ پرویں پہ ہے

دو جام مے بھر کر چڑھا - پھر دیکھ کیفیت ہے کیا

یہ خوب عینک حق نما - چشمِ حقیقت بیں پہ ہے

ہو کوہ کے چشموں سے رواں - پانی نہ کیوں شیریں رواں

وہی جانِ شیریں کھو جہاں - فرہاد نے شیریں پہ ہے

میں کیا کروں اظہارِ غم - ہے بارِ غم پر بارِ غم

دن رات ایک انبارِ غم - میرے دلِ غمگیں پہ ہے

صیقل نہ ہو گر تیغ پر - جوہر پہ ہو کس کو نظر ✣

اے ذوق یہاں قدر ہنر - آرایش و تزئیں پہ ہے

اگر ہوتے ہو تم برہم ابھی سے
تو پھر ہوتے ہیں رخصت ہم ابھی سے

لگے کیوں تم پہ مرنے ہم ابھی سے
لگایا جی کو اپنے غم ابھی سے

دلا ربط اُس سے رکھنا کم ابھی سے
جتا دیتے ہیں تمکو ہم ابھی سے

ترے بیمارِ غم کے ہیں جو غمخوار
برستا اُنپہ ہے ماتم ابھی سے

غضب آیا ہلیں گر اُس کی مژگاں
صفیں ماریونکی ہیں برہم ابھی سے

نہیں ہے دیر اگر جانے میں اُن کے
نہیں اپنے بھی دم میں دم ابھی سے

بہے آنسو تو دامن کیا کینگے
ہوئی ہے آستیں پرنم ابھی سے

میرے لاشہ پہ بھی اُس نے گماں نے
کہا! کیوں جی! چرایا دم ابھی سے

تمہارا مجھکو پاسِ آبرو تھا
وگرنہ اشک جاتے تھم ابھی سے

لگے شیشہ پلانے مجھکو آنسو +
کہ ہو بنیادِ غم محکم ابھی سے

وہ شاید منہ کھلے پر جائینگے آج
کہ چھایا دل پہ ابرِ غم ابھی سے

نکلتے ہی دم اُٹھواتے ہیں مجھکو
ہوئے بیزار کیوں ہمدم ابھی سے

ابھی دلپہ راحت ۔ سو نہ دو سو
لے آئے دوستو مرہم ابھی سے

کیا ہے وعدۂ دیدار کس نے
کہ ہے مشتاق ایک عالم ابھی سے

مُوا جانا مجھے غیروں نے اے ذوق
کہ پھرتے ہیں خوش و خوّرم ابھی سے

عالمِ نشہ میں دیکھنا اس بے حجاب کی
ہر ناز سے ٹپکتی ہے مستی شراب کی

کوچہ میں آ پڑے تھے ترے خاک ہو کے ہم
یہاں تو صبا نے اور بھی مٹی خراب کی

قاصد جواب جان مری دیکھی مجھے
پر منتظر ہے آنکھوں میں خط کے جواب کی

نکلے ہو بیکدہ سے ابھی منہ چھپا کے تم
دابے ہوئے بغل میں صراحی شراب کی

اے ذوق بس نہ آپ کو صوفی جتائیے
معلوم ہے حقیقتِ ہُو حق جناب کی

یہ دو غزلہ بھی آغازِ شباب کا ہے ۔

قفلِ صدخانۂ دل آیا جو تو ٹوٹ گئے
جو طلسمات نہ ٹوٹے تھے کبھو ٹوٹ گئے

خارِ غم دل سے کسی طرح نہ نکلا اے عشق
ہو کے ناخن کئی سینہ میں فرو ٹوٹ گئے

چارہ گر سوزنِ تقدیر میں کچھ اور ہیں تار
جیب کے تار جو ہو ہو کے رفو ٹوٹ گئے

سینکڑوں کاسۂ سر دہر میں مانندِ حباب
کبھو اے چرخ بنے تجھ سے کبھو ٹوٹ گئے

تو جو کہتا ہے کہ دے غیر کو بھی ساغرِ مے
ہاتھ کیا اُسکے ہیں اے عربدہ جو ٹوٹ گئے؟

دخترِ رز نے وہ انداز دکھائے سرِ بزم
رات یاروں کے وہاں غسل وضو ٹوٹ گئے

کیونکہ بن کشتیٔ مے کیجئے سیرِ دریا
میکشو زیرِ بغل اب تو کدو ٹوٹ گئے

دیکھکر سرمہ کی تحریر تری آنکھوں میں
ہیں صنم خانوں میں زنّارِ گلو ٹوٹ گئے

تیرے ہاتھوں میں برنگِ گل بازی آخر
بند بند اپنے ہیں اے عربدہ جو ٹوٹ گئے

چشمِ مخمور کے ایک جام میں سب یاروں کے
رات سر رشتۂ اعمالِ نکو ٹوٹ گئے

تیر کھینچے بھی اگر چارہ گروں نے دل سے
تو کبھو چھوٹ گئے اور کبھو ٹوٹ گئے

کیا بیاں تم سے کروں زورِ شکستِ دل کا
کہ مری خاک سے بن بن کے سبو ٹوٹ گئے

مژۂ تر پہ اُمنڈ کر جو شب آئے آنسو
شدتِ گریہ سے مو بر سرِ مو ٹوٹ گئے

جذبِ عشق اپنا ہے کب چھوٹتا تیر و نکو ترے
کھینچے بھی دل سے جو سو فار کبھو ٹوٹ گئے

گلشنِ عشق ہے کیا بار و راللہ اللہ
یہ ثمر لائے کہ سروِ لب جو ٹوٹ گئے

کہہ بہ تبدیلِ قوافی غزل ایک اور بھی ذوق
دیکھیں کس طرح سے بھلاتا ہے تو ٹوٹ گئے۔

کس کے موشانہ میں اے دستِ ہوس ٹوٹ گئے
تیرہ بختوں کے جو یاں تارِ نفس ٹوٹ گئے

رات جو شیشۂ مے تجھ سے عسس ٹوٹ گئے
ہمسے نہ گنبدِ مینا کے کلس ٹوٹ گئے

دیدۂ آبلۂ پا پہ ہے مژگاں پیدا
پانو میں چبھ کے مرے خار بس ٹوٹ گئے

ساقیا بادہ کشی میں کئی ساری برسات
عہد و پیماں مرے سب اگلے برس ٹوٹ گئے

یاد آیا جو سیران قفس کو گلزار
مضطرب ہو کے یہ تڑپے کہ قفس ٹوٹ گئے

ڈونگے یار کے پشتِ لبِ شیریں پہ نہیں
شہد پر بیٹھ کے ہیں پائے مگس ٹوٹ گئے

نوگرفتارِ قفس گریونہی تڑپے صیاد
کوئی دم میں یہ سمجھنا کہ قفس ٹوٹ گئے

ذوق ہم ہو گئے گم ایسی ہوئی گم آواز
آج کیا قافلہ کے سارے جرس ٹوٹ گئے؟

ہم اوّل ہی سے خود کو نابود سمجھے
کہ بانگِ درا دت کو مولود سمجھے

ہوا نالہ جب دود آلود سمجھے
کہ تھے عشق حلوائے بے دود سمجھے

تری ہانگ کی تیغ کا ہو جو زخمی
وہ بے زخمِ دل کو نمک سود سمجھے

خدا کی خدائی اگر آگے آئے
وہ کافر کسی کو نہ موجود سمجھے

جو کچھ آپ کو دل میں سمجھا وہ کافر
نہ فرعون سمجھے نہ نمرود سمجھے

ہمارا جو دل ہو گیا موم اُن پر
ہم الفت کو اعجازِ داؤد سمجھے

کیا دل کا بازارِ الفت میں سودا
زیاں کو ہم اپنے ذوق یہاں سود سمجھے

خط بڑھا کاکل بڑھے زلفیں بڑھیں گیسو بڑھے
حسن کی سرکار میں جتنے بڑھے ہندو بڑھے

تیرے جلوہ سے چمن میں روئے اے گلرو بڑھے
شاخِ گلبن میں بڑھے گل گل میں رنگ و بو بڑھے

بعد بخشی کے گلے ملتے ہوئے رُکتا ہے جی
اب بنا سب ہے یہی کچھ میں بڑھوں کچھ تو بڑھے

ہاتھ ملنے کو جو مجنوں سے بڑھائے دشت میں
ضعف سے مدت میں جوں شاخِ سرِ ہو بڑھے

کر رہا ہے حسن کے دیواں میں خطِ پشتِ لب
ایک مطلع اور زیرِ مطلعِ ابرو بڑھے

بڑھتے بڑھتے بڑھ گئی وحشت وگرنہ پہلے آہ
ہاتھ کے ناخن بڑھے سر کے ہمارے مو بڑھے

تجھکو دشمن وہاں شرارت سے جو بھڑکاتے ہیں روز
چاہتے ہیں دشمنِ شوخِ آتش رو بڑھے

واہ ساقی کیا ہی دی ہے داروئے فرحت فزا
جس کے ایک قطرہ سے سیروں جسم میں لہو بڑھے

یوں دمِ گریہ ہوا دل سے مرے نالۂ بلند
جس روش پانی کے باعث سرد آب جو بڑھے

حسنِ کیفیت سے ہو معمور اگر مینائے دل
پھر تو جامِ جم سے قدرِ کاسۂ زانو بڑھے

یہاں بڑھے دل کی طپش اور قہر ہے غیر کے ساتھ
گرمیِ صحبت تری اے شوخِ آتش خو بڑھے

چرخ پر نورِ قمر راتوں بڑھے راتوں گھٹے
حسن تیرا روز بروز اے ہلالِ ابرو بڑھے

کچھ تپِ غم کو گھٹا کیا فائدہ اس سے طبیب
روز نسخہ میں اگر فرفہ گھٹے کا ہو بڑھے

چاہتا ہے دل بڑھے اُلفت کی اُنسے رسم و راہ
پر وہاں قابو نہیں کس طرح بے قابو بڑھے

پیشوائی کو غمِ جانکاہ چشمِ دل سے ذوق
جب بڑھے نالے تو اُن سے پیشتر آنسو بڑھے

آتے ہی تو نے گھر کے پھر جانے کی سُنائی
رہ جاؤں سُن نہ کیونکر یہ تو بُری سُنائی

مجنون و کوہکن کے سنتے تھے یار قصے
جیتک کہانی اپنی ہم نے نہ تھی سُنائی

جس بات پر تمہاری سب غش ہیں ہم سے پوچھو
ہم کہویں آنکھوں دیکھی وہ سب سنی سُنائی

شکوہ کیا جو میں نے گالی کا آج اُس سے
گالی کے ساتھ اُس نے ایک اور بھی سُنائی

کیا جانے کیا کہیگا۔ کچھ کہنے کو ہے ناصح
دیتا نہیں مجھے تو اے بیخودی سُنائی

کہنے نہ پائے اُس سے ساری حقیقت ایکدن
آدھی کبھی سنائی۔ آدھی کبھی سُنائی

صورت دکھائے اپنی۔ دیکھیں وہ کس طرح سے
آواز بھی نہ جس نے۔ ہم کو کبھی سُنائی

قیمت میں جنسِ دل کی مانگا جو ذوق بوسہ
کیا کیا پھر اُس نے ہم کو کھوٹی کھری سُنائی

ہنگامِ بوسہ گرم جو وہ ایک ذری ہوئے
شکّر تو تھی پسینہ سے شکّر تری ہوئے

ثبت اس بیاضِ چشم میں ہیں خطِ سرمہ سے
جو انتخابِ نسخۂ افسونگری ہونے

دکھلائے ہم نے لیکے جو دامن پہ اشک
قائل ہماری آنکھ کے سب جوہری ہوئے

ایک خال زیرِ زلف سے ظاہر مرے لئے
اے یار سو طریقۂ بداختری ہوئے

جا بجائے خاکِ وحشیِ چشمِ بتاں پہ گھاس
لیکن ہرن[1] کھری نہ رہے بن ہری ہوئے

کچھ رکھتے آدمیت اگر ہوتے آدمی
یہ حور وش تو حور ہوئے یا پری ہوئے

ہم جیتے جی جہان سے معدوم ہو گئے
اتنے نقطے سے گم بسببِ لاغری ہوئے

رسوا نہ ہوتے کرتے نہ گر جیب و سینہ چاک
ہم آپ اپنی باعثِ پردہ دری ہوئے

مطلب کفر سے ہے نہ اسلام سے ہے کام
دل دیکھے اے صنم تجھے سب سے بری ہوئے

طالع ہوئے نہ اپنے سعادت سے ہمقریں
ہر چند سو قران مہ و مشتری ہوئے

اے ذوق آج سامنے اُس چشمِ مست کے
باطل سب اپنے دعوئی دانش وری ہوئے

غزل مرقوم الذیل پر نظرِ ثانی کی شعاع نہیں پڑی۔

ایک صدمہ درد دل سے مری جان پر تو ہے
لیکن ملائے ہاتھ کہ زانو پہ سر تو ہے

آنا ہے اُن کا گرچہ قیامت پہ منحصر
ہم خوش ہیں یہ کہ آنے کی اُنکے خبر تو ہے

[1] ہرن کھری۔ ایک گھاس ہے۔ اسکے پتے کی شکل ہرن کے سُم سے ملتی ہے اس لئے یہ نام پایا ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے۔ کہ عاشقِ چشم کے دل میں آگ لگ رہی ہے۔ قبر پر جو سبزہ اُگے گا جلجائے گا۔ تاہم ہرن کھری ضرور لے گی کہ ہرن کی آنکھیں خوب ہوتی ہیں۔ اور یہ آنکھوں کے عاشق ہیں ۱۲

ہے سر شہیدِ عشق کا زیبِ سنانِ یار
صد شکر بارے نخلِ وفا بار و رتو ہے

اے شمع دل ہے رونے میں جلتا تو کیا ہوا
ہو جاتی رات اس میں ملے سے بسر تو ہے

ہے دل میں درد اگر نہیں ہمدرد میرے پاس
دلسوز اگر کوئی نہیں سوزِ جگر تو ہے

اے دل ہجومِ رنج و الم سے نہ تنگ ہو
خانہ خراب خوش ہو کہ آباد گھر تو ہے

اس بت نے غائبانہ کہا یا نہیں کہا
چپ ہو کیا وہ بارے مجھے دیکھکر تو ہے

تربت پہ دل جلوں کی نہیں گر چراغ و گل
سینہ میں سوزشِ دل و داغِ جگر تو ہے

کشتیِ بسمل ہے مرے حق میں تیغِ یار
کر دیتی ایکدم میں اِدھر سے اُدھر تو ہے

وہ دل کہ جس میں سوزِ محبت نہ ہو وے ذوق
بہتر ہے اُس سے سنگ کہ جس میں شرر تو ہے

یہ غزل عنفوانِ شباب کی ہے نظرثانی نہیں ہوئی۔

خدا نے میرے یا سینہ لالہ زار مجھے
بتو نہ بن کے نظر آؤ تم بہار مجھے

وہ خط جو لکھتے نہیں جز خطِ غبار مجھے
سمجھتے بارے کہ ہیں اپنا خاکسار مجھے

نگہ نے اسکی مجھے سخت بیقرار کیا
بلا سے مار دے آکر کوئی کٹار مجھے

جمالِ یار نے مڑکر بھی دیکھنے نہ دیا
پکارتے رہے دیر و حرم ہزار مجھے

تمہارے عشق میں ہاہی سے تا بہ ماہِ فلک
دکھائی دیتے ہیں لہائے اغدار مجھے

نظر جو لطف کی ہے روزِ وصل پر موقوف
تو کر نہ کیا تھا نظر بند انتظار مجھے

عیاں ہے آئینۂ رخ پہ جب سے خطِ غبار
وہ خط میں لکھتے۔ مگر درخطِ غبار مجھے

ہوئے وادیٔ وحشت مجھے موافق تھی
دکھائے ہیں چمن کی یہ کیا بہار مجھے

نہ دیتا عشق اگر چشمِ اشکبار اے ذوق
جلا ہی لکھی تھی مری آہِ شعلہ بار مجھے

لڑکپن کی غزل ہے نسخہ ثانی نہیں ہوئی ۔

مرضِ عشق جسے ہو اُسے کیا یاد رہے
نہ دوا یاد رہے اور نہ دعا یاد رہے

تم جسے یاد کرو پھر اُسے کیا یاد رہے
نہ خدائی کی ہو پروا نہ خدا یاد رہے

لوٹتے سینکڑوں نخچیر ہیں کیا یاد رہے
چیر دو سینہ میں دل کو کہ پتا یاد رہے

رات کا وعدہ ہے بندہ سے اگر بندہ نواز
بند میں دے لو گرہ تا کہ ذرا یاد رہے

قاصدِ عاشقِ سودا زدہ کیا لائے جواب
جب نہ معلوم ہو گھر اور نہ پتا یاد رہے

دیکھ بھی لینا ہمیں راہ میں اور کیوں صاحب!
ہم سے نہ پھر کے جانا یہ بھلا یاد رہے!

تیرے مدہوش سے کیا ہوش و خرد کی ہو اُمید
رات کا بھی نہ جسے کھایا ہوا یاد رہے

کشتۂ ناز کی گردن پہ چھری پھیر و جب
کاش اس وقت تمہیں نامِ خدا یاد رہے

خاک برباد نہ کرنا میری اُس کوچہ میں
تجھ سے کہدیتا ہوں میں بادِ صبا یاد رہے

گور تک آئے تو چھاتی پہ قدم بھی رکھدو
کوئی بیدل ادھر آئے تو پتا یاد رہے

تیرا عاشق نہ ہوا سو وہ بزیرِ طوبےٰ
خلد میں بھی ترے کوچہ کی ہوا یاد رہے

باز آجائیں جفا سے جو کبھی آپ تو پھر
یادِ عاشق کو نہ کیجے گا بھلا یاد رہے

داغِ دل پر میرے پھاہا نہیں ۔ ہے انگارا
چارہ گر لیجو نہ چٹکی سے اُٹھا یاد رہے

زخمِ دل بولے ترے دیکھ کے نمک خواروں سے
لو بھلا کچھ تو محبت کا مزا یاد رہے

حضرتِ عشق کے مکتب میں ہے تعلیم کچھ اور
یہاں لکھا یاد رہے اور نہ پڑھا یاد رہے

گر حقیقت میں ہے رہنا تو نہ رکھ خود بینی
بھولے بندہ جو خودی کو تو خدا یاد رہے

عالمِ حسن خدائی ہے بتو نکی اے ذوق
چلکے بتخانہ میں بیٹھو کہ خدا یاد رہے

چشمِ قاتل ہمیں کیونکر نہ بھلا یاد رہے
موت انسان کو لازم ہے سدا یاد رہے

میرا خوں ہے ترے کوچہ میں بہا یاد رہے
یہ بہا وہ نہیں جسکا نہ بہا یاد رہے

کشتۂ زلف کے مرقد پہ تو اے لیلیٰ وش
بید مجنوں ہی لگانا کہ پتا یاد رہے

خاکسار ہی عجب وصف کہ جوں جوں ہو سوا
ہو صفا اور دلِ اہلِ صفا یاد رہے

ہو یہ لبیکِ حرم یا بہ اذانِ مسجد +
میکشو قلقلِ مینا کی صدا یاد رہے

یاد اُس عہد فراموش نے غیروں سے بدی
یاد کچھ کم تو نہ تھی اور سوا یاد رہے

خط بھی لکھتے ہیں تو لیتے ہیں خطائی کاغذ
دیکھئے کبتک انہیں میری خطا یاد رہے

دو ورق میں کفِ حسرت کے دو عالم کا ہے علم
سبقِ عشق اگر تجھ کو دلا یاد رہے

قتلِ عاشق پہ کمر باندھی ہے ایدل اُس نے
پر خدا ہے کہ اسے نام مرا یاد رہے

طائرِ قبلہ نما بن کے کہا دل نے مجھے
کہ تڑپ کر یونہی مر جائیگا جا یاد رہے

جب یہ دیندار ہیں دنیا کی نمازیں پڑھتے
کاش اُس وقت انہیں نام خدا یاد رہے

ہم پہ سو بار جفا ہو تو رکھو ایک نہ یاد
بھول کر بھی کبھی ہو وے تو وفا یاد رہے

محو اتنے بھی نہو عشق بتاں میں اے ذوق
چاہئے بندہ کو ہر وقت خدا یاد رہے ۔

تدبیر نہ کر فائدہ تدبیر میں کیا ہے ۔
کچھ یہ بھی خبر ہے تیری تقدیر میں کیا ہے؟

اے اہلِ نظر عالمِ تصویر کو دیکھو !!
تصویر کا کیا دیکھنا تصویر میں کیا ہے؟

ہے شانہ کہ میرا دلِ دیوانہ ہے اُلجھا
معلوم نہیں زلفِ گرہگیر میں کیا ہے

پارہ کی جگہ گشتہ اگر ہو دلِ بیتاب
پھر آپ ہی اکسیر ہے اکسیر میں کیا ہے

اے صید فگن کرتا ہے کیوں اتنی چھری تیز
اب باقی بھلا اس تیرے نخچیر میں کیا ہے

کچھ سلسلہ جنبانِ جنوں ہے ترا مجنوں
غل دیکھ بپا خانۂ زنجیر میں کیا ہے

بیٹھا ہے درِ کعبہ پہ چیراں ترا شیدا
لبیک میں کیا ہوتا ہے تکبیر میں کیا ہے

صیاد عبث گرد ہے تو اس کے شب و روز
تو دیکھ تو کچھ اس سے نخچیر میں کیا ہے

ہے صید نگہ کہتا قضا سے یہ تڑپ کر
اس تیر میں کیا لطف ہے اُس تیر میں کیا ہے

یہ غنچۂ تصویر کھلا ہے نہ کھلے گا
کیا جانے دلِ عاشقِ دلگیر میں کیا ہے

خنجر ہے ترے ہاتھ میں لا وہم نہ خنجر
تاخیر ہو کیوں؟ فائدہ تاخیر میں کیا ہے

اُترا تھا گلے سے کہ جگر ہو گیا ٹھنڈا
کیا جانے اُس آبِ دمِ شمشیر میں کیا ہے

زاہد کی طرف دیکھو نہ تم ایسے دمِ ذبح
لو نام تم اللہ کا تکبیر میں کیا ہے

ذوق اُس لبِ شیریں کا جو تو وصف ہے کہتا
کیا کہئے حلاوت تری تقریر میں کیا ہے

پر یہ رو کیا ستمگر پیشتر ایسے نہ ہوتے تھے
ولیکن جیسے تم ہو فتنہ گر ایسے نہ ہوتے تھے

وہ جب و ہاں بے تکلف رات بھر ایسے نہ ہوتے تھے
صبا کے جھوکے یہاں وقتِ سحر ایسے نہ ہوتے تھے

کسی کی فندقیں ہا وآگئیں ہیں سینہ و مژگاں پر
نمایاں قطرۂ خونِ جگر ایسے نہ ہوتے تھے

جو دیں ہیں گالیاں سن سن نہاں کو آج کیا کہئے
کبھی نادم ہم اُسکو چھیڑ کر ایسے نہ ہوتے تھے

خدنگِ عشق کھا کر زخمِ دل فرہاد کے باہم
لگے کہنے کہ شیریں شکر ایسے نہ ہوتے تھے

سفر ہے آپکے جان کا حضرتِ دل بیٹھے حیراں ہیں
پریشاں و رنہ جوں گردِ سفر ایسے نہ ہوتے تھے

کتابِ دل شمارِ عشق سے ہے جل اُٹھی شاید
کہ مضموں سوزِ دل کے پیشتر ایسے نہ ہوتے تھے

ہمارے کاہ نیں آب ہے یا آبداری ہے
کہ پہلے خارِ صحرا تیز تر ایسے نہ ہوتے تھے

ستم دنیا کے جو جو تھے ستمگر دل پہ گذرے ہیں
مگر صدمے ہماری جان پر ایسے نہ ہوتے تھے

زمانہ میں ہیں سنتے شور بہت سے قیامت کا
پر اس قامت سے جو ہیں شور و شر انیسے ہوتے تھے

ہمارے شعر سنکر ذوق جیسے بزم عالم میں
ہوئے قائل ہیں اب اہل نظر ایسے نہ ہوتے تھے

نہ کھینچو عاشق تشنہ جگر کے تیر پہلو سے
نکالے پر رہے مثل ماہی تصویر پہلو سے

نہ لے اے ناوک افگن دل کو میرے چیر پہلو سے
کہ وہ تو جا چکا ساتھ آہ کے جوں تیر پہلو سے

دل سیپارہ کو لے ٹانک تعویذ و نمیں سکل کے
نہ سرکا یہ حمائل اے بت بے پیر پہلو سے

وہ ہوں بے دست و پا بسمل سائی جب ہاتھ آئی
کیا تا پائے قاتل از تہ شمشیر پہلو سے

اسیر زلف دیوانے ہیں دیکھ اے پاسبان شبکو
دبا کر بیٹھا انکے پانو کی زنجیر پہلو سے

مصور لیلی و مجنوں کی ناکامی پہ حیراں ہیں
کبھی بیٹھا نہ ملکر پہلوئے تصویر پہلو سے

یہ دل لب تشنہ تیغ یار کا ہے رات بھر کرتا
صدائے العطش جوں نالۂ شبگیر پہلو سے

عجب حسرت کا عالم تھا کہ مجنوں کہتا تھا بہیم
چھٹے پہلو سے محمل کا یا تقدیر پہلو سے

نہ کہنا استخواں انکو یہ عالم لاغری کا ہے
کہ ہے دکھلا رہا میرا دل دلگیر پہلو سے

خیال ابروئے جانا نہیں دل بھولتا اک دم
سپاہی ہے جدا کرتا نہیں شمشیر پہلو سے

تمام اہل سخن بزم سخن میں ذوق حیراں ہیں
ملا جو قافیہ تو نے کیا تحریر پہلو سے[1]

برق میرا آشیاں کب کا جلا کر لیگئی
کچھ جو خاکستر بچا آندھی اڑا کر لیگئی

اسکے قدموں تک نہ بیتابی بڑھا کر لیگئی
ہائے دو پلٹے دیئے اور پھر ہٹا کر لیگئی

ناتوانی ہم کو ہاتھوں ہاتھ اٹھا کر لیگئی
چیونٹی سے چیونٹی دانہ چھڑا کر لیگئی

[1] ارکین کا کلام ہے۔ مگر یہ پہلو جس طرح بیٹھا ہے جانے والے ہی جانینگے۔ اسکی قدر ہے، جسکو جب چاہے دیدے ۱۲

صبحِ رخ سے کون شامِ زلف میں جاتا تھا آہ
ایدلِ شامت زدہ! شامت لگا کر لیگئی

خونِ فرہاد کے رنگیں ہوا دامانِ کوہ
کیونکر موجِ شیر یہ دھبا چھڑا کر لیگئی

تم نے تو چھیڑا ہی تھا اے ہمرہانِ قافلہ
لیکن آوازِ جرس ہمکو جگا کر لیگئی

نوکِ مژگاں جب ہوئی سینہ فگار سے دوچار
پارہ ہائے دل سے گلدستہ بنا کر لیگئی

دیکھی کچھ دل کی کشش لیلیٰ کہ ناقہ کو ترے
سوئے مجنوں آخر رستہ بھلا کر لیگئی

وہ گئے گھر غیر کے اور یہاں ہمیں دم بھر کے بعد
بدگمانی اُن کے گھر سو گھر پھرا کر لیگئی

واہ اے سوزِ دروں کو چیں اُنکے برقِ آہ
رات ہم کو ہر قدم مشعل دکھا کر لیگئی

جو شہیدِ ناز کوچہ میں تمہارے تھا پڑا
کیا کہوں تقدیر اُسے کیونکر اُٹھا کر لیگئی

دشت وحشت میں بگولا تھا کہ دیوانہ ترا
روحِ مجنوں بہرِ استقبال آکر لیگئی

آگ میں ہے کون گر پڑتا مگر پروانہ کو
آتشِ سوزِ محبت تھی جلا کر لیگئی

اے پری پہلو سے میرے کیا کہوں تیری نگاہ
دل۔ اُڑا کر لیگئی یا پر لگا کر لیگئی

ذوق مرجانے کا تو اپنے کوئی موقع نہ تھا
کوئے جانا میں اجل ناحق لگا کر لیگئی

عالم شباب کی غزل ہے۔ شاہ نصیر مرحوم کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا۔ وہیں پڑھی تھی۔ اُن کی شاگردی کا تمغا ایک قطعہ بھی موجود ہے۔

حدِ رقمِ وصفِ جبیں ہے صنم پرے
برحق ہے شاخِ سدرہ سے لوح و قلم پرے

رفتار وہ کہ فتنہ رہے سو قدم پرے
قامت کہے ہے شورِ قیامت کو تھم پرے

کہتا ہے کسکو نازسے تو دمبدم پرے
تو دو قدم کہے میں رہوں سو قدم پرے

بسمل ترے تڑپکے بھی پہنچے نہ پا تو تک
یا دو قدم ترے رہے یا دو قدم پرے

کیوں گردمِ اضطرابِ اسدِ جگر اے شرار
ہستی سے کتنی دور ہے ملکِ عدم پرے؟

پھر کر ہمارے کعبۂ دل میں غزالِ یار
کہتے ہیں دیکھ رہیو غزالِ حرم پرے

قاتل جو تیرے ہاتھ میں پٹی ہو زہر کی
مرہم کو زخمِ دل سے اُٹھا رکھیں ہم پرے

ہے موجِ ریگ باد یہ کیا۔ ایک گام میں
ہونگے سوارِ کشتیِ نقشِ قدم پرے

یارب کدھر کو جائے یہ جانبازِ درد و غم
باندھے کھڑی ہے چار طرف فوجِ غم پرے

اتنا بھی دم نہیں ہے کہ تیرا مریضِ غم
سر کے نظر سے صورتِ نقشِ قدم پرے

شب گھر پہ اُن کے غیر نے تو آلیا تھا پر
دیوارِ بام پر تھے چڑھے ہم کہ دھم پرے

ق

کچھ اپنی شرحِ سوزِ دلِ بیقرار آج
آیا تھا جی میں بیٹھ کے کیجے رقم پرے

اللہ رے اضطراب کہ جوں آتشیں قلم
ہاتھوں سے جا پڑا مرے چھُٹ کر قلم پرے

یہ کیا شبِ وصال! کہ دونو بہم تو ہیں
پر ہم سے وہ ہیں بیٹھے پرے اُن سے ہم پرے

کعبہ نہیں۔ یہ کعبۂ دل ہے مقامِ دوست
رہنا ذرا یہاں سے طوافِ حرم پرے

تم آؤ گر تو آؤ۔ نہیں مجھکو لو بلا
گھر سے تمہارے گھر ہے مرا کے قدم پرے

برگشتہ بخت وہ ہوں کہ پھر جائے نازسے
مژگاں تک اُسکی آکے نگاہِ کرم پرے

میں نے کہا جو ان سے نکلتا ہے میرا دم
بولے خدا کے واسطے رکھئے یہ دم پرے

دیکھو! نہ جاؤ حضرتِ دل لفِ یار میں
رستہ نہیں ہے آپکے سر کی قسم پرے

کرتا ہے کیا مسافتِ منزل کا فکر ذوق
ہے اب تو یہاں سے ملکِ عدم دو قدم پرے

ذکرِ مژگاں تیرا جسکے روبرو نکلا کرے
اُسکے بے نشتر رگِ جاں سے لہو نکلا کرے

گر فغاں اچھا نہیں تو چپ بھی رہنا ہے بُرا
کچھ تو سینہ کا بخار اے دل کبھو نکلا کرے

لائے گر بادِ صبا اُس زلفِ مشکیں کی شمیم
شمع کے گُل سے گُلِ شبّو کی بو نکلا کرے

دیکھے میرے آنسوؤں کی آبداری کو اگر
آبِ دریا سے گہر بے آبرو نکلا کرے

چشمِ مستِ یار اگر دکھلائے تاثیرِ نظر
تا قیامت پھر دلِ آہو سے ہُو نکلا کرے

اے صنم پیدا کرے جو دل میں تیری آرزو
پھر نہ اُسکے لب سے حرفِ آرزو نکلا کرے

خطِ مشکیں کا تمہارے وصف اگر کیجے رقم
خطِ مشک افشاں قلم سے مو بمو نکلا کرے

حضرتِ دل ہم تو جب جانیں کرامات آپکی
کھا کے دھکے روز اُس گھر سے عدو نکلا کرے

تیرے ترکِ چشم کو گر شوقِ خونریزی نہو
باندھ کر تلوار کیوں اے جنگجو نکلا کرے

خدمتِ پیرِ مغاں سے لو وہ دار و چلکے ذوق
نشۂ مے جس سے بے جام و سبو نکلا کرے

یہ غزل بھی عالمِ شباب کی ہے طرحِ مشاعرہ میں لکھی تھی ۔

خمِ ابرو ترا جب یار نظر آتا ہے
کوئی کھینچے ہوئے تلوار نظر آتا ہے

جب ترا شعلۂ رخسار نظر آتا ہے
سرو خورشید کا بازار نظر آتا ہے

گھر میں جو روزنِ دیوار نظر آتا ہے
چشمِ افعی مجھے بے یار نظر آتا ہے

مستِ چشم اُس کا جو میخوار نظر آتا ہے
ہے تو دیوانہ پہ ہشیار نظر آتا ہے

کیا تمہیں اے اُلے الابصار نظر آتا ہے
یہاں تو اغیار میں بھی یار نظر آتا ہے

ضعف سے تارِ تنِ زار نظر آتا ہے
سرِ مو تن پہ گرہ وار نظر آتا ہے

سبزۂ خطِ گلِ رخسار پہ ایک عالم ہے
خطِ ریحاں خطِ گلزار نظر آتا ہے

معنیٔ رنگِ خموشی سے جو دل ہو آگاہ
برگِ گُل میں لبِ اظہار نظر آتا ہے

بیخبر بے ہوش ہوا تا ہی سوا ہو آرام
مست ہاتھی ہو تو بے وار نظر آتا ہے

کہ خطِ تری باتوں کا جب یار نظر آتا ہے ۔

زلف کے دام میں ہے مرغِ دل آتا ہی نہیں یاد — جب کوئی مرغِ گرفتار نظر آتا ہے
خوابِ غم میں بھی ہے آرام۔ اگر آجائے — ہے وہ بے چین جو شیدا نظر آتا ہے
آنکھ اُٹھا کر تو ذرا دیکھ کہ زیرِ افلاک — جو ہے سرکش وہ نگونسار نظر آتا ہے
میرے رونے پہ جو ہنستے ہیں وہ سوزن روتا — تا رِ اک آنسو ٹپکتا نظر آتا ہے
صیدِ بیکس پہ ترے کون ہے کہتا تکبیر — یہ تو ہوتا یوہیں مردار نظر آتا ہے
تیرے مجنوں کو ہے سامانِ جنوں آرائش — داغِ سودا گلِ دستار نظر آتا ہے
ہے غضب سرمہ نے چمکایا تری آنکھوں کو — آج فتنہ ہمیں بیدار نظر آتا ہے
بارِ احساں ہے صبا کا بھی سرِ نکہتِ گل — کون گلشن میں سبکبار نظر آتا ہے
خنجرِ موجِ تبسم سے ترے گلشن میں — دیکھا ہر گل کو دل افگار نظر آتا ہے
میری آنکھوں میں نظر آتا ہے عالم ویراں — دل کا ویرانہ جو بے یار نظر آتا ہے
عالمِ دل میں کبھی آ کے فلک کو دیکھو — کیا پسِ پردۂ زنگار نظر آتا ہے
ہائے اے دستِ جنوں تا رِ نفس چھوڑ دیا — تن پہ تو مجھ کو نہیں تا نظر آتا ہے
بڑھلے جو چمکا زمانہ میں دکھائی دیا کم — روزِ کب اخترِ دُم دار نظر آتا ہے
جو جوانمرد علائق میں پھنسا ہے وہ مجھے — شیر پنجے میں گرفتار نظر آتا ہے
دیکھکر اے بتِ مغرور یہ اندازِ ستم — شرم سے چرخ نگونسار نظر آتا ہے
کاٹنے دوڑتا ہے گھر۔ جو نہیں وہ گھر میں — حلقۂ در دہنِ مار نظر آتا ہے
دل پہ وسوسہ کا عقدہ ہے قفلِ وسواس — اِسکا کھلنا مجھے دشوار نظر آتا ہے
مژدہ اے آبلہ پائی کہ پھر آنکھوں میں مری — دامنِ وادیٔ کہسار نظر آتا ہے
کم نمائی سے ہوا اے مہ نقاعت کے چاند — کہ بدن میں کبھی اِکپار نظر آتا ہے

دل نے ہے دیکھ لیا دفترِ تقدیر تمام
فلک ایک نقطۂ بیکار نظر آتا ہے

چشمِ ساقی نے یہ میخانہ میں پھیلایا کفر
گردنِ شیشہ میں زنار نظر آتا ہے

صحبتِ اہلِ صفا دیتی ہے سرکش کو اُلٹ
نخل پانی میں نگونسار نظر آتا ہے

تنگ جو زیست سے ہیں تختۂ تابوت انہیں
مر کے ایک تختِ ہوا دار نظر آتا ہے

دُرِ مضموں ہیں ترے ذوق زبس بیش بہا ۔
کم کوئی ان کا خریدار نظر آتا ہے ۔

دکھلا نہ خالِ ناف تو اے گلبدن مجھے
ہر لالہ یہاں ہے نافۂ مشکِ ختن مجھے

ہمدم ! وبالِ دوش نہ کر پیرہن مجھے
کانٹا سا ہے کھٹکتا مرا تن بدن مجھے

پھرتا لئے چمن میں ہے دیوانہ پن مجھے
زنجیر پا ہے موجِ نسیمِ چمن مجھے

تسبیح دور بزم میں دیکھو امام کو
بخشی ہے حق نے زیبِ سرِ انجمن مجھے

اے میرے یاسمن[1] ترے دندانِ آبدار
گلشن میں ہیں رلاتے گلِ یاسمن مجھے

محرابِ کعبہ جب سے ہے تیرا خمِ کماں
صیدِ حرم سمجھتے ہیں ناوک فگن مجھے

ہے تن میں ریشہ ہائے نئے خشک استخواں
کیوں کھینچتا ہے کانٹوں میں اے ضعفِ تن مجھے

اے لبِ مسی کو پھینک ۔ کہ نیلم ہے کم بہا
یاقوت دے دیا کوئی لعلِ یمن مجھے

ہوں شمع یا کہ شعلہ خبر کچھ نہیں ۔ مگر ۔
فانوس ہو رہا ہے مرا پیرہن مجھے

اک سرزمینِ لالہ بہار و خزاں میں ہوں
یکساں ہے داغِ تازہ و داغِ کہن مجھے

خسرو سے تیشہ بولا جو چاٹوں نہ تیرا خون
شیریں نہ ہووے خونِ سرِ کوہکن مجھے

[1] اس شعر کو پڑھکر ایک دن فرمایا ۔ کہ ایسے موقع پر اب تک زبان اردو کے شاعر اے یاسمن کہتے ہیں ۔ مگر خیر یہ بھی ایک انداز نکلا ۔ ہو گیا تو ہو گیا ۔ رہا تو رہا ۱۲

رخ پر تمہارے دام جو ڈالا ہے سبزہ نے
آتا نظر ہے دیدۂ عنقا دہن مجھے

یہ دل وہ ہے کہ کر دے زمین آسماں کو خاک
ایک دم کو برق دے جو پنہا پیرہن مجھے

کوچہ میں تیرے کون تھا لیتا بھلا خبر
شب چاندنی نے آکے پنہایا کفن مجھے

دکھلاتا آسماں سے ہے روئے زمیں کی سیر
اے رشکِ ماہ تیری جبیں کا شکن مجھے

رکھتا ہے چشمِ لطف ۔ پہ کس کس ادا کے ساتھ
دیتا ہے جام ساقیٔ پیماں شکن مجھے

ہے جذبِ دل درست تو چاہ فراق سے
کھینچے گی تیری زلف شکن در شکن مجھے

دکھلاتا ایک ادا میں ہے سو سو طرح بناؤ
اس سادہ پن کے ساتھ تیرا بانکپن مجھے

جیسے کوئیں میں ہو کوئی تارا چمک رہا
دل سوجھتا ہے یوں تہِ چاہِ ذقن مجھے

آکر اسے بھی دو کبھی آنکھیں دکھا دکھا ۔
آنکھیں دکھا رہا ہے غزالِ ختن مجھے

آ اے مرے چمن کہ ہوا میں تری ہوا
صحرائے دل ہوائے چمن در چمن مجھے

یارب یہ دل ہے یا کہ ہے آئینہ نظر
دکھلا رہا ہے سیر و سفر در وطن مجھے

آیا ہوں نو لیکے میں بزمِ سخن میں وقؔ
آنکھوں پہ سب بٹھائینگے اہلِ سخن مجھے

یہ غزل بھی آغازِ شباب کی ہے مضمون مطلع بھی گواہی دیتا ہے ۔

مار کر تا وہ دلبرِ جانی مانگے
کہہ دو ہم سے نہ کوئی دیکے نشانی مانگے

اے صنم دیکھے ہر دم کی تری کم سخنی
موت گھبرا کے نہ کیوں خیر فغانی مانگے

خاکِ شہ دیدار کے سبزہ جو اُگے
تو زباں اپنی نکالے ہوئے پانی مانگے

مار ڈالیگا مگر تو اے زلف
ہے وہ کافر کہ نہ کاٹا تیرا پانی مانگے

دہر میں نکل گئے آور مانگے کسی سے دلکو
وہ جو مانگے تو باندازِ نہانی مانگے

دل مرا بوسہ پہ پیغام نہیں دیتے ہمدم
یار لیتا ہے تو لے اپنی زبانی مانگے

جلوہ اُس عالمِ معنی کا جو دیکھے اے ذوق
لطفِ الفاظ نہ لے حُسنِ معانی مانگے

ندیں گواہی جو داغ کہن نہیں دیتے
دکھائی کیا مرے تن پر چمن نہیں دیتے

جفا میں بات ہو کیا حکمۃً نہیں دیتے؟
کہ دردِ جاں ہمیں بے زخمِ تن نہیں دیتے

جو بولوں کچھ تو مجالِ سخن نہیں دیتے
سیوں بھی میں پہ وہ سینے دہن نہیں دیتے

سحر ہے روز دکھاتا نئی چمک خورشید
دکھا اسے مرا داغ کہن نہیں دیتے

ہیں منع کر رہے رونے کو یہ جو ناداں دوست
بجھانے کیوں مجھے دل کی جلن نہیں دیتے

یہ پڑ گئیں تنِ لاغر میں جھرّیاں ہیں مرے
کہ اتنے زلف میں بھی وہ شکن نہیں دیتے

شہیدِ ناز کے چہلم پہ ہے نظر شاید +
کہ سرمہ آنکھوں میں تم جانِ من نہیں دیتے

اجل ہے پوچھتی پھرتی مرا پتا یارو[1]
بتا اُسے میرا بیت الحزن نہیں دیتے

عدم کی راہ میں بھی کچھ تو ہے خطر کا گذر
کہ ساتھ لینے بجز یک کفن نہیں دیتے

جو مانگا آبِ دمِ تیغ اُس سے بسمل نے
تو بولا زخمی کو اے خستہ تن نہیں دیتے

بیانِ شیخ جو ہے وصفِ حور و شعلۂ طور
ذرا دکھا اُسے اپنی پھبن نہیں دیتے

وہ تیر کھینچے ہے پہلو سے کہدے بسملِ زار
کہ ہے نشانیٔ ناوک فگن نہیں دیتے

ہوا اُنکی زلف سے کیا زخمِ دل کو چشمِ امید
لگا پہلے کو وہ مشکِ ختن نہیں دیتے

پڑے ہیں دامنِ کہسار و دامنِ صحرا +
تیرے شہید کو دو گز کفن نہیں دیتے

زباں حلاوتِ الفت کا لے مزہ کہ نہ لے
لب اپنی حد سے گذرنے سخن نہیں دیتے

[1] یہ غزل بھی شاہ نصیر مرحوم کے عہد کی ہے۔ استاد مرحوم کی آخر عمر میں جانِ من اور یار و غیرہ طلبا کے دائرہ سے

پلایا زہر دکھایا ہے مے کا پیمانہ
یہ دھوکے اے بتِ پیماں شکن نہیں دیتے

سنبھال ناخنِ وحشت کو اب تو دستِ جنوں
کہ سینے پر مرا چاکِ کفن نہیں دیتے

گلوں سے بن چکے جب دونو ہاتھ گلدستہ
تو بولے ذوق جلاتن بدن نہیں دیتے

اے صنم ہجر میں ہم جیتے بھلا پتھر تھے
سینہ تھا ہاتھ تھا سر اپنا تھا یا پتھر تھے

وہ بھی دن یاد ہیں جب کوئے صنم میں ہم دل
بسترِ خاک تھا اور تکیہ کی جا پتھر تھے

دلِ مجروح نے جو کھائے جنوں میں پتھر
اُسکو وہ سنگ جراحت سے سوا پتھر تھے

پوچھا اُس بت نے تو نکلی نہ زباں سے ایک بات
حضرتِ دل وہاں کیا بارِ خدا پتھر تھے

جن دلوں نے ہے کیا چور مرا شیشۂ دل
اے بتو دل تو نہ تھے وہ بخدا پتھر تھے

عمر بھر کھاتا رہا سرو قد دل کے دشنام
اس سبب سے مری قسمت کے سدا پتھر تھے

کون ہمدم شبِ غربت میں تھا بیکس کا ترے
یا تو سنتا تھا یا دیتے صدا پتھر تھے

تھے دلِ سنگ میں جب تک تو رہے قطرۂ خوں
تاجِ شاہی میں لگے لعل تو کیا پتھر تھے

خاک اُس زیست پہ جب سنگ دل اسکے ہوئے
مرکے ہم خاک میں جیتے نہ تو کیا پتھر تھے

میرے نالوں نے تو پتھر سے بہائے چشمے
اے بتو تم ہی پسیجے نہ ذرا پتھر تھے

کعبۂ عشق کا اے ذوق کیا ہم نے طواف
آئینہ خاک تھی اور سنگ صفا پتھر تھے

دل کے مفلس جو تونگر تھے تو کیا پتھر تھے
اب تو کنکر ہیں جو گوہر تھے تو کیا پتھر تھے

مرکے گر خاک میں تو چھاتی پہ پتھر ہی دھرا
کھاتے گلیوں میں جو پتھر تھے تو کیا پتھر تھے

تاجِ شاہی میں جگہ پائی تو کیا ہاتھ آیا
اور دھرے گر ترے در پہ تو کیا پتھر تھے

کہہ نہ تجنّا میں اے شیخ بتو نکو دلِ سنگ
وہاں تیرے کعبے کے اندر تھے تو کیا پتھر تھے

کتنا رویا ہوں ولیکن نہ پسیجے وہ سنگ
سنگدل گر نہ ستمگر تھے تو کیا پتھر تھے

ساقیا خاک ہے گر شیشۂ دل میرا تو کیا ؟
اور بلوریں ترے ساغر تھے تو کیا پتھر تھے

سنگدل وہ رہے اے ذوق صداحق میں مرے
غیر کے حق میں جو گوہر تھے تو کیا پتھر تھے

بزم میں کر مرا لب پہ وہ لائے تو سہی ۔
وہیں معلوم کروں ہونٹ ہلائے تو سہی

سنگ پر سنگ ہر ایک کوچہ میں کھائے تو سہی
پر بلا سے ترے دیوانے نہ کھائے تو سہی

گر جنازہ پہ نہیں قبر پہ آئے وہ سہی
شکوہ کیا کیجیے غنیمت ہے کہ آئے تو سہی

کیونکہ دیوار پہ چڑھ جاؤں کوئی کہتا ہے
پانو کاٹوں گا انگوٹھے کو جمائے تو سہی

پارۂ مصحفِ دل تھے ترے کوچہ میں پڑے
آتے پانو کے تلے شکر کہ پائے تو سہی

آ کے غرفہ میں نہ بیٹھے تو نہ بیٹھے وہ شوخ
روزن در سے ذرا آنکھ لڑائے تو سہی

گر گھٹاتا ہے گئے مہ کو بڑھاتا ہے فلک
پر شبِ ہجر کو ہم دیکھیں گھٹائے تو سہی

کروں ایک نالہ سے میں حشر میں برپا سو حشر
شورِ محشر مجھے سوتے سے جگائے تو سہی

تھے تمہی نکلے جو اُس دام بلا سے اے ذوق
ورنہ تھے پیچ میں اُس زلف کے آئے تو سہی

یہ غزل بھی اُسی زمانہ کی ہے ۔

خیال دل میں پری نہ لاؤ ہمارے دل میں تمہارا گھر ہے
تم آتے آؤ نہیں نہ آؤ ہمارے دل میں تمہارا گھر ہے ۔

یہ دل ہے آئینہ تم ہو صورت نہیں ہے یہاں نام کو کدورت

کسی کو گھر میں بُلا بٹھاؤ ہمارے دل میں تمہارا گھر ہے

خلل بنائے مکاں کو پہنچے تو ہو گا نقصاں مکیں کو پہلے

مکاں کو دل کے نہ تم گراؤ ہمارے دل میں تمہارا گھر ہے

غلط ہے تہمت ہے افترا ہے کہ ہم نے دل اور کو دیا ہے

کسی کے کہنے پہ تم نہ جاؤ ہمارے دل میں تمہارا گھر ہے

گئی ہے رات اب بہت زیادہ کدھر کا کرتے ہو تم ارادہ

نہ گھر کے جانے کی اب سناؤ ہمارے دل میں تمہارا گھر ہے

تم اپنے رُخ میں ہو کر رہے دن - ہو زلف میں شب کے عقدے گن گن

ہزار دل سے ہمیں بھلاؤ ہمارے دل میں تمہارا گھر ہے

مکان دیدہ پسند خاطر اگر نہیں ہے کہ ہو گئے ظاہر

تو خیر تشریف تم نہ لاؤ ہمارے دل میں تمہارا گھر ہے

تم اُسکو دو داغ مثل لالہ دیا کرو بیٹھکر اُجالا +

بگاڑو تم اس کو یا بناؤ ہمارے دل میں تمہارا گھر ہے

یہی زباں سے ہے ذوق کہتا تمہارا رہے وہاں ایسیں تہا
جدا مکان اور کہیوں بناؤ ہمارے دل میں تمہارا گھر ہے

متفرقاتِ یا

زباں پیدا کروں جو اُسکا سینہ میں پیکاں سے
دہن کا ذکر کیا یہاں سرہی غائب ہے گریباں سے

اُڑائے خوب گلچھرّے نکل مجنوں نے زنداں سے
برستے پھول ہیں سر پر شرارِ سنگ طفلاں سے

فلک کیا فتنہ سازی میں ہو ہم چشم فتاں سے
گرا تھا یہ بھی شاید سرمہ لو اُسکی مژگاں سے

چمکتی ہے سرِ مجنوں پہ بجلی سنگِ ہاں سے
لگیگی ابر رحمت کی جھڑی اب چشمِ گریاں سے

یہاں تک ناتواں ہیں ہم گذر جائیں اگر جاں سے
اُٹھائے مولا شہ کو ہمارے دستِ مژگاں سے

اسی باعث سے دایہ طفل کو افیون دیتی ہے
کہ نا ہو جائے لذت آشنا تلخیٔ دوراں سے

سب کو دنیا کی ہوس خوار لئے پھرتی ہے
کون پھرتا ہے یہ مردار لئے پھرتی ہے

پھر گشتِ زمانہ میں بھلا کیوں خورشید
ہوسِ گرمیٔ بازار لئے پھرتی ہے

وہ میرے اختر طالع کی ہے واژوں گردش
کہ فلک کو بھی نگونسار لئے پھرتی ہے

کر دیا کیا ترے ابرو نے اشارہ قاتل
کہ قضا ہاتھ میں تلوار لئے پھرتی ہے

جا کے پھرتا نہ تھا اکبار جہاں وہاں مجھکو
بے قراری ہے کہ سو بار لئے پھرتی ہے

کون وقت اے اے گذراجی کو گھبراتے ہوئے
موت آتی ہے اجل کو یہاں تلک آتے ہوئے

آتش خورشید سے اُٹھا نہیں دیکھا دھواں
آ کھڑے ہو بام پر تم بال سکھلاتے ہوئے

وہ جاگے رات اور یاں ضد سے بختِ خفتہ کی
بج گیا آخر گجر زنجیر کھڑکاتے ہوئے

چاک آتا ہے نظر پیراہنِ صبحِ بہار
کس شہیدِ ناز کو دیکھا ہے کفناتے ہوئے

پیشوائی کو بڑھے گر کششِ دل آگے
دوڑے مجنوں کی طرف ناقہ سے محمل آگے

جاتے اسطرح سے اُس کوچہ میں ہیں دل اور ہم
دل سے ہم آگے کبھی۔ ہم سے کبھی دل آگے

گرچہ ہے وادیٔ عنقا سے پرے سو سو قاف
لیک ہے گم شدگی کی ابھی منزل آگے

تجھ سا ناقص بھی غنیمت ہے اب اس وقت میں ذوقؔ
کاملیت ہے کہاں ہو چکے کامل آگے

ناقص کا صفا کیش سے مطلب بر آئے
جو کور ہو عینک سے اُسے کیا نظر آئے

فردوس میں ذکر اُس لبِ شیریں کا گر آئے
پانی دہنِ چشمۂ کوثر میں بھر آئے

بتخانہ میں گر آہ کروں عشقِ صنم سے
ناقوس کا دل آبلہ کی طرح بھر آئے

ممکن نہیں کم ہووے تپِ سوزِ محبت
جوں شمع مجھے لاکھ پسینا اگر آئے

نعل جب شکلِ ہلالِ نو ترے توسن کو لگے
چار چاند اور فلک پر مہِ روشن کو لگے

بوسے مانگتے ہی پھیر نے رقیبوں کو لگے
ایسے کیا لعل لبِ غیرتِ گلشن کو لگے

آشیاں ہو جیو مرغانِ ہوا کا برباد
بند کرنے تری دیوار کے روزن کو لگے

زاہد کو اگر صدق و صفا بھی ہے تو کیا ہے
بے درد اگر دل بہ خدا بھی ہے تو کیا ہے

آزارِ محبت کا مزا کیا کہوں جس کی
ہے درد دوا۔ دیکھو دوا بھی ہے تو کیا ہے

سیراب ہو جس سے کوئی تشنہ مقصود | اے ذوق جو وہ آب بقا بھی ہے تو کیا ہے

گر رخ کا بوسہ دیتے نہیں لب لگا دبے | ہے شکل وہ کہ پھول نہیں پنکھڑی سہی
فرہاد! ضرب تیشہ سے ہے سخت ضرب چشم | سچ پوچھئے تو چوٹ ہمیں نے کڑی سہی
تم دو گھڑی کو آؤ تو میں لب پہ جان کو | ٹھیرا رکھوں کہ اور بھی یہاں دو گھڑی سہی

کیا وہ دنیا جسمیں کوشش ہو نہ دیں کے واسطے | واسطے وانکے بھی کچھ یا سب یہیں کے واسطے؟
خوں کے دریا بہ گئے عالم تہ و بالا ہوئے | اے سکندر کیلئے؟ دو گز زمیں کے واسطے؟
ذوق عاصی ہے پر اسکا خاتمہ کیجو بخیر | یا الٰہی اپنے ختم المرسلیں کے واسطے

سوز دل سے مرے نالے جو شرربار ہوئے | مدعی جل گئے اچھا ہوا فی النار ہوئے
ٹکڑے اڑ جائیں قفس کے تو اُٹھینگے نہ کبھی | ہم ہیں صیاد کی اُلفت کے گرفتار ہوئے
چمن دل سے ہوئے کم نہ گل لختِ جگر | دو اگر خشک ہوئے اور ہرے چار ہوئے

لڑکپن کی غزل تھی ۳ شعر یاد رہ گئے —

چھپا کے پھولوں میں منہ صبا سے جو مسکرائے سحر کلی ہے
تبسم اُس گل کا یاد کر کے عجب ہوئی دل کو بے کلی ہے
تپش دکھائی جو میں نے دل کی تو لوٹا پروانہ داغ کھا کر +
دکھایا تم نے جو رو نے روشن تو شمع محفل میں کیا جلی ہے

+ پروانہ کی جگہ پر بار ہوئے اور داغ کی جگہ شرر تھا تو فی النار ہوئے —

بناؤ فِلم چوصندل سے میرا تابوت اے عزیزو
کہ قتل مجھ کو کیا کسی نے دکھا کے رنگ اپنا صندلی ہے

فرماتے تھے ہمارا لڑکپن تھا مشاعرہ میں طرح ہوئی ہمنے بھی غزل لکھی تھی۔

ساتھ تیرے ہم بھی جوں سایہ مقرر جائینگے
آگے جائیں پیچھے جائیں جائینگے پر جائینگے

لیکے جب یہ زر میں ہم دیدۂ تر جائینگے
خشک ہیں جتنے کوئیں۔ پانی سے سب بھر جائینگے

ابر رحمت ہے تجھے اسدم لگا دے تو جھڑی
کہتے ہیں جانے کو وہ دیکھیں تو کیونکر جائینگے

لڑکپن کی غزل ہے۔ والدمرحوم کبھی کبھی پڑھا کرتے تھے۔ ۲ شعر ہی یاد تھے۔

گرد رد ہے کھنڈا دلِ مضطر سے کسی کے
پانی تو پلا دار کے سر پر سے کسی کے

دل بس میں پڑا اسکے کہ جو بس میں نہ آیا
جادو سے نہ ٹونے سے نہ منتر سے کسی کے

اللہ کرے یہاں ہمیں پیوند زمیں کا
جب وصل ہو بستر ترا بستر سے کسی کے

جو دل نہ کشمکشِ طرّۂ دوتا میں پڑے
تو پھر بلا کو غرض ہے کوئی بلا میں پڑے

ہوائے سایۂ طوبےٰ نہیں ہے مستوں کو
رہینگے تاک کے نیچے کہیں ہوا میں پڑے

بتوں کے دزدِ نظر سے ہے دل میرا نالاں
یہ چور وہ ہیں کہ جو خانہ خدا میں پڑے

ایک کلکِ آہ بس ہے شرحِ غم کے واسطے
کون نیزے واسطی ٹوٹے قلم کیواسطے

سر تو ہے تن پر میرے تیغ ستم کے واسطے
پر لگا رکھتے ہیں وہ جھوٹی قسم کے واسطے

تم بیٹھے بغل میں جو رقیبِ دغلی کی
کی گرم بغل ہم نے بھی گو بغلی کی

اے ذوق نکر نور میں آمیزشِ ظلمت
کیا کام تبرّہ کو محبت میں علی کی

مقابل اُس رخِ روشن کے شمع گر ہو جائے
صبا وہ دھول لگائے کہ بس سحر ہو جائے

وہ دل میں رکھتا ہوں میں آہ آتشیں اے ذوق
کہ برق دیکھے تو فی النار واستقر ہو جائے

اسیری پر تری تا ہوں اے تمری لڑکپن سے
جدا تب سے ہوئی گردن تُرا طوقِ گردن سے

مجھے گہوارہ بھی تھا کشتیِ طوفان زدہ آسا
رہا جوں طفلِ اشک آفت رسیدہ میں تو بچپن سے

یہاں لگ چکے سب دین و دل و جان ٹھکانے
اب تک نہیں کافر ترا ایمان ٹھکانے

کیا جانے خبر لایا ہے کیا واں سے کہ قاصد
آتے نہیں تیرے نظر اوسان ٹھکانے

مرنے حسنِ عمل سے معصیت بھی عار کرتی ہے
مری توبہ پہ توبہ - توبہ استغفار کرتی ہے

اگر انسان قانع ہو تو نے اکسیر سے بہتر
ہوا و حرص لیکن اُسکی مٹی خوار کرتی ہے

ہم ہیں غلام اُن کے جو ہیں فاکے بندے
اسکو یقین کر نا گر ہو خدا کے بندے

مت بھول بندگی پر غرہ میں آکے بندے
زاہد سے تا بہ فاسق سب ہیں خدا کے بندے

ہم تو نکو اپنے جذبِ دل سے کھینچے جائینگے
پر تجھے پتھر ہیں یہ مشکل سے کھینچے جائینگے

(۱) ردیف سے پہلے حرف میں حرکت کا اختلاف ہو تو قافیہ درست نہیں ہوتا

(۲) ردیف کلمات وضعی ہو تو وہ کلمہ ہے

دیکھیں تو کبتک نہیں کرتے ترے دل میں اثر
ہم بھی نالے اپنے جذبِ دل سے کھینچے جائینگے

کام لیجے گا کہیں اور ہی دانائی سے
ناصحو جاؤ نہ لپٹو کسی سودائی سے

کیونکہ عینک کو نہ آنکھوں سے لگاؤں اے یار
چار آنکھیں ہوئیں تجھ قوتِ بینائی سے

کونسے دن نگہ تیز نہ خونریز رہی +
مجھ پہ ظالم تری ہر روز چھری تیز رہی

آتشِ عشق تو ہے گلشنِ جنت کی ہوا
یہاں مگر آتشِ دوزخ سے بھی کچھ تیز رہی

ہمکو کیا یہاں راہ پر ہے کوئی یا گمراہ ہے
اپنی سب سے راہ ہے اور سب سے یاد اللہ ہے

کیا بشر مانند یوسف کیا بشر ہاروت و ار
عشق کے ہاتھوں سے ہو جاتا اسیرِ چاہ ہے

عزیزو ناقۂ لیلی کے دیکھو گے شتر غمزے
اگر ملجائیگی مجنوں کو خدمت ساربانی کی

کہاں ہم۔ اور کہاں غم میکشو نکو غم سے کیا نسبت
مگر اے حضرتِ دل آپ نے یہ مہربانی کی

یہ دو شعر سب سے اخیر کا کلام ہے اس کے بعد کچھ نہیں کہا۔ حافظ ویران نے کئی دن پہلے کہا تھا کہ حضرت اس محاورہ کو کیونکر باندھیں۔ پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ بیماری کا دوسرا یا تیسرا دن تھا۔ فرمایا حافظ تم نے اُسدن کیا کہا تھا؟ پھر یہ دو شعر پڑھے اور مجھے کہا لکھ لو یاد داشت میں۔

رہے خاطر نہ بے شغلِ محبت کیونکہ بند اپنی
کلید قفلِ دل فریاد ہے مثلِ سپند اپنی

زمیں کیا ہے؟ فلک پاؤں کے نیچے سے نکل جائے | ہماری خاک پر دکھلا دو رفتار سمند اپنی

جو دل سے اپنے دم آتشیں نکل جائے | فلک کے پانو تلے سے زمیں نکل جائے
ستم نے سیم تنوں کے کیا ہے ناک میں دم | اگر کسی تن سے مرا دم کہیں نکل جائے

اٹھا تا عشق کی کیوں اے دانا داں جوکھوں سے | ابھی تو مال جوکھوں ہے پر آگے جان جوکھوں ہے

پیش اکرام سے ساری کرامت ہے یہی | عادت بد ترک کر تو خرق عادت ہے یہی

پھرتے ہیں لکھے پڑھے سودے میں مال و جاہ کے | طفل مکتب رہتے ہیں گنبد میں بسم اللہ کے

لحد کو چاہیے یوں پیر پشت جسم دیکھے | سرا کو جیسے تھکا اونٹ دمبدم دیکھے

بلائے آشکارا ہم کو کس کی ساقیا چوری | خدا کی جب نہیں چوری تو پھر بندہ کی کیا چوری

رہی اس طرح بعد از مرگ دنیا کی ہوسناکی | شہوانی کر کے تو جسطرح ہو جائے ترياکی

راتوں کو نہ ہو حق کرا ے شیخ مناجاتی | سوتے ہوئے چونکیں گے رندان خراباتی

کیا ہم سخنی کرتا ہے اس گل کے دہن سے
غنچہ سے یہ کہدو کہ چٹخ جائے چمن سے

قطرہ قطرہ آنسو جسکے طوفاں طوفاں شدت ہے
ٹکڑے ٹکڑے دل جو پڑا ہے تو وہ تو وہ حسرت ہے

جسے ہم چاہتے ہیں وہ بت گمراہ بھی چاہے
ہمارے دل نے تو چاہا مگر اللہ بھی چاہے

کل کے جو وصل کے عالم ہیں نظر میں پھرتے
آج تنہا خفقانی سے ہیں گھر میں پھرتے

ہم اور غیر یکجا دونو بہم نہ ہونگے
ہم ہونگے وہ نہونگے وہ ہونگے ہم نہ ہونگے

جنوں کے دست مبارک ہیں پیرہن کو لگے
رہا بھی تار نہ باقی کہ جو کفن کو لگے

لاشہ کو دفن کیجے میرے کہ پھینکدیجے
مردہ بدست زندہ جو چاہئے سو کیجے

معلوم ہوا بینی وابرو دے بتاں سے
ایک تیر ہے گویا۔ کہ چڑھا ہے وکماں سے

ڈسا ہو کالے نے جسکو کافر تو وہ فسوں کے اثر سے کھیلے
دہان وگیسو کا نیچ مارا نہ منہ سے بولے نہ سر سے کھیلے

بیقراری کا سبب ہر کام کی اُمید ہے | نا اُمیدی سے مگر آرام کی اُمید ہے

اگر اُٹھے تو آزردہ جو بیٹھے تو خفا بیٹھے | لگا یا جی کو اپنے روگ جب سے جی لگا بیٹھے

باقی ہے دل میں شیخ کے حسرت گناہ کی | کالا کریگا مُنہ بھی جو ڈاڑھی سیاہ کی

عیاں ہے اشک کی گرمی ہو پیدا سوزشِ دل سے | کہ آتا اپنا اشکِ سوختہ مانند فلفل ہے

درد دل سے لوٹتا ہوں میرا کسکو درد ہے | میں ہوں نقطہ درد جس پہلو سے دیکھو درد ہے

دل گرفتار ہوا یار کی عیاری سے | ہم گرفتار ہوئے دل کی گرفتاری سے

جو کہو گے تم۔ کہینگے ہم بھی ہاں یونہی سہی | آپ کی یونہی خوشی ہے مہرباں یونہی سہی

جس در پہ غل تھے کہ آتی کان پڑی آواز نہ تھی -
عقل سمجھی اُس در پہ تھی حیران کھڑی آواز نہ تھی

رازِ درونِ خم سے کسے اس پردہ میں آگاہی ہے
یوں تو ہر ایک زعم میں اپنے افلاطون اکھی ہے

وہ لعل شیریں کسی کے دل کی اٹھی کیا ہو گیا دوا ہے؟
کہ میٹھا میٹھا سا درد کل سے مرے کلیجہ میں ہو رہا ہے

کتنے مفلس ہو گئے کتنے تونگر ہو گئے | خاک میں جب مل گئے دونو برابر ہو گئے

اب ہے جا زیر مغیلاں ترے دیوانوں کی | مدتوں چھان چکے خاک بیابانوں کی

الفت کا نشہ جب کوئی مر جائے تو جائے | یہ درد سر ایسا ہے کہ جائے تو جائے

رات جوں شمع کٹی ہم کو جو روتے روتے | بہ گئے اشکوں میں ہم صبح کے ہوتے ہوتے

کوئی جو اسکو پڑھکر عاشق کا خط سنائے | ایک حرف مدعا پر سو بے نقط سنائے

لاشے کے ساتھ بھی نہ میری قبر تک چلے | ہوتے ہی اذن عام کے گھر کو کھسک چلے

نہیں ہچکی یہ ہچکی شام سے ایک دم ٹھہرتی ہے | ترے بیمار غم کو موت شاید یاد کرتی ہے

ناخن سے منقار کی میرے داغ جنوں کو زاغ کھجائے
عشق یہ تیری فطرت ہے تو سر سہلائے بھیجا کھائے

وفق یہ تیری طبیعت ہے تو سر سہلائے بھیجا کھائے

چاہئے زیبا نِ بتانِ سیم تن کیواسطے
یہاں قلندر ہیں نہیں کوڑی کفن کیواسطے

پھر بہار آئی کفِ ہر شاخ پر پیمانہ ہے
ہر روش پر جلوۂ بادِ صبا مستانہ ہے

ہوتا نہ اگر دل تو محبت بھی نہ ہوتی +
ہوتی نہ محبت تو یہ آفت بھی نہ ہوتی

مصروف چارہ دیکھا۔ کیا چارہ گر کو میرے
مرچیں سی لگ رہی ہیں زخمِ جگر کو میرے

مٹی سے اپنی مٹی جو تربت میں مل گئی
جو کچھ کہ تھی مراد محبت میں مل گئی

بد نہ بولے زیرِ گردوں گر کوئی میری سُنے
ہے یہ گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سُنے

لال کتا ب اپنی اب بادۂ لالہ رنگ ہے
میکدہ اپنے واسطے مدرسۂ فرنگ ہے

کیا تا بِ دل جلوں سے جو برق لاگ رکھے
دوزخ بھی ہو تو اُن کی چلموں پہ آگ رکھے

کرے کعبہ میں کیا جو ستِ بتخانہ سے آگ ہے
یہاں تو کوئی صنم بھی نہیں ہاں اللہ ہی اللہ ہے

ہمیشہ کام مجنوں کو رہا صحرا نوردی سے
بسایا خانۂ زنجیر ہم نے پائے مردی سے

جنوں سے میرے مجنوں بھاگتا جیسے بگولا ہے
کہ میں صورت ہوں وحشت کی وہ یوں ہی اک بگولا ہے

خاکساری تا دشت میں جب تیرا سودائی پھرے
پھر بگولا تو ہے کیا آندھی بھی لو لائی پھرے

جہاں دنیا میں دیکھا سچ کے اوپر جھوٹ غالب ہے
کہ پہلے صبح کاذب ہے تو پیچھے صبح صادق ہے

ذکر کچھ چاکِ جگر سینے کا سن سن اپنے
کر کے میں ضبط ہنسی دیکھوں ہوں ناخن اپنے[1]

بیمار۔ غم جو اسکا کھا کر زمین دیکھے
خوش خوش وہ مقبرونکی جا کر زمین دیکھے

کترے پر رکھنے میں صیاد یہ اغماض کہ ہائے
ملتی اسپر کفِ افسوس ہے مقراض کہ ہائے

وحشت اگر پتنگ کو ہوویگی داغ سے
زنجیر گھڑ کے ڈالینگے دو چراغ سے

تری عمر دو روزہ غافل ایک پتلی ہے وکل کی
کہ اک کل روزِ آخر کی ہے ایک کل روزِ اول کی

[1] کتب تصوف میں لکھا ہے کہ جب انسان کو بہت ہنسی آئے۔ تو ناخنوں کو دیکھنے لگے۔ ہنسی تھم جائیگی۔ سبب اسکا یہ لکھا ہے کہ جب حضرت آدم بہشت سے نکلے تھے۔ تو اُن کا جسم مبارک ایسا صاف اور روشن تھا۔ جیسے ناخن۔ دنیا میں آکر بدلنا شروع ہوا۔ اور اولاد کا رنگ بدلتے بدلتے ایسا ہو گیا کہ ظاہر ہے۔ جب انسان ناخنوں کو دیکھتا ہے تو روحانی آگاہی سے دل متنبہ ہوتا ہے اور افسوس میں ہنسی۔ جاتی رہتی ہے ۱۲ استاد رحمۃ اللہ علیہ

دکھانے کو نہیں ہم مضطر حالت ہی ایسی ہے | مثل ہے روئے ہو کیوں۔ کہا صورت ہی ایسی ہے

پہلے بتوں کے عشق میں ایمان پر بنی | پھر ایسی آ بنی کہ مری جان پر بنی +

جو تیرے ناخنِ پا تیرا مائل دھو کے پی جاوے | تو اُسکے دست و پا پھر ماہِ کامل دھو کے پی جاوے

جس طرح ماہ سارے ستاروں میں ایک ہے | یوں میرا مہ جبیں بھی ہزاروں میں ایک ہے

آپ آتا ہے عیادت کو نہ تُو آتی ہے | تیری خاطر سے اجل تجھ سے فراموش ہوئے

قسمتِ برگشتہ دیکھو ایک نگہ کی تھی اِدھر | سو بھی آکر تا سرِ مژگاں حیا سے پھر گئی

اِس شعر پر خاتمہ اُن کا اور اُن کی شاعری کا ہو گیا +

کہتے ہیں آج ذوق جہاں سے گذر گیا | کیا خوب آدمی تھا خدا مغفرت کرے

۱۸۳۹ء میں بادشاہ کا ایک بیٹا مرزا بلاقی نام ۱۲-۱۳ برس کی عمر میں مر گیا۔ حسین بھی تھا اور بادشاہ کو بھی اُس سے بہت محبت تھی۔ رنج ہوا۔ اور ایسا ہوا کہ کئی ہفتے تک شعروں میں ٹپکتا رہا۔ انہی دنوں میں اُستاد مرحوم ایک دن قلعہ سے پھرتے ہوئے والد مرحوم کے پاس آئے۔ مجھے یاد ہے اول بادشاہ کے ملالِ طبع کا حال بیان کیا۔ پھر ایک مطلع سُنایا

کہ اُسی وقت غزل درست کرکے آئے تھے۔

گل کچھ تو اُس چمن کی ہوا کھا کے جھڑ پڑے	وہ کیا کریں کہ غنچہ ہی کملا کے جھڑ پڑے

پھر کہا ردیف مناسب مقام نہیں۔ اور ذرا سوچ کر آپ مطلع پڑھا اور خود کتاب یادداشت میں لکھدیا۔

گل بھلا کچھ تو بہاریں اے صبا دکھلا گئے	حسرت اُن غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

یا اللہ کیا وقت تھے۔ اور کیا کیا موقع پیش آتے تھے۔ پھر فرمایا۔ حضور کا ایک قطعہ بھی ابھی درست کرکے آیا ہوں۔

پڑھتا ہوں ایک مطلع و مقطع میں حسب حال	دیکھے تماشے میں نے جو مُلکِ وجود کے
ایک دن وہ تھا کہ ٹوٹتے تھے دانت دودھ کے	پھر یہ ہوا گذرنے لگی کھیل کود کے
اب حال یہ ہے عالمِ پیری میں اے ظفر	باقی نہیں حواس بھی گفت و شنود کے

کئی دن کے بعد جو پھر آئے۔ فرمایا قلعہ سے آتا ہوں۔ مرزا شاہرخ[1] آج کہنے لگے۔ بہی اُستاد۔ میں نے مولوی صاحب کو حضور کا وہ قطعہ سُنایا تھا۔ اُنہوں نے کہا "شنود۔ نہیں۔ شنید چاہیئے"۔ اُسی وقت مجھے شعر یاد آیا۔ میں نے کہا مولوی صاحب سے تعجب ہے کہ ایسا کہا ہو ؎

گر عشق نبودے و غمِ عشق نبودے	چندیں سخن نغز کہ گفتے و شنودے

مطلع مرقوم الذیل میں خدا جانے بادشاہ کو کیا پسند آگیا تھا۔ اُستاد فرماتے تھے کئی دفعہ حضور نے اس کے مضمون کو ہیر پھیر کرکے لینا چاہا۔ ہم نے ہر دفعہ اپنے مطلع کا پہلو بچایا

[1] مرزا شاہرخ بادشاہ کے ایک بیٹے ولیعہد وقت سے چھوٹے تھے۔ وہ مولوی امام بخش مقتول کے شاگرد تھے۔ اُن سے فارسی پڑھا کرتے تھے۔

یہ بھی اتفاق ہے کہ استاد نے ایسا کیا۔ ورنہ اُن کا یہ طریقہ نہ تھا۔ میں نے ایک دفعہ سبب بھی پوچھا فرمایا خدا جانے جب ہوا کچھ ایسا ہی خیال ہوگیا۔

کیا کہوں اُس بُرے پیوستہ کے دل میں ہے	ایک طعمہ مچھلیاں و کشمکش آپس میں ہے

ایک دن فرمایا کہ ہمارا عالمِ شباب تھا۔ ایک بزرگ کہن سال نے کسی پرانے شاعر کا مطلع سُنایا۔

آبلے دکھلائے جب اِس دل رنجور نے	دانتوں میں تنکا لیا خوشۂ انگور نے

ہمارے چشمۂ طبع میں لہر آئی اور اُسی وقت یہ مطلع ہُوا

اشک کے قطرے جو مژگاں پر اٹکنے ہوگئے	خوشۂ انگور کے بھی دانت کھٹے ہوگئے

اُس زمانہ کے لوگ بڑے با انصاف ہوتے تھے۔ سنکر بہت تعریف کی۔

قطعہ

کہوں کیا ذوق احوالِ شبِ ہجر	کہ تھی ایک ایک گھڑی سو سو مہینے
نہ تھی شب ڈال رکھا تھا ایکاندھیر	مرے بختِ سیہ کی تیرگی نے
شبِ غم شمع ساں ہوتی نہ تھی کم	اور آتے تھے پسینوں پر پسینے
یہی کہتا تھا گھبرا کر فلک سے	کہ اے بے مہر اختر کمینے
کہاں میں اور کہاں یہ شب۔ مگر تھے	مری جانب سے تیرے دل میں کینے
سوا ظلمت کے پردہ میں کئے ظلم	اے ظالم تری کینہ وری نے
عوض کس بادہ نوشی کے مجھے آج	پڑے یہ زہر کے سے گھونٹ پینے
حواس و ہوش جو مجھ سے قریں تھے	قرینہ سے ہوئے سب بے قرینے
مری سینہ زنی کا شور سنکر	پھٹے جاتے تھے ہمسایوں کے سینے

اُٹھایا گاہ اور گاہے بٹھایا — مجھے بیتابی و بے طاقتی نے
کہا جب دل نے تو کچھ کھا کے سو رہ — بہت الماس کے توڑے نگینے
نہ ٹوٹا جان کا قالب سے رشتہ — بہت سی جان توڑی جانکنی نے
بہت دیکھا نہ دکھلایا ذرا بھی — طلوعِ صبح سے منہ روشنی نے
کہا جی نے مجھے یہ ہجر کی رات — یقیں ہے صبح تک دے گی نہ جینے
لگے پانی چوانے منہ میں آنسو — پڑھی یاسیں سرہانے بیکسی نے
مگر دن عمر کے تھوڑے سے باقی — لگا رکھے تھے میری زندگی نے
کہ قسمت سے قریبِ خانہ میرے — اذاں مسجد میں دی ہائے کسی نے
بشارت مجھکو صبحِ وصل کی دی — اذاں کے ساتھ یمن و فرخی نے
ہوئی ایسی خوشی اللہ اکبر — کہ خوش ہو کر کہا خود یہ خوشی نے

مؤذن مرحبا بر وقت بولا
تری آواز مکّے اور مدینے

کل ایک تارکِ دنیا سے میں نے پوچھا ذوق — کہ تو اُٹھ کے اُدھر سے اِدھر ہوا پیوست
گذرتی ہوگی بآرام زندگی تیری + کہ تجھکو اب نہ غمِ نیست ہے نہ شادی ہست
کہا یہ اُس نے کہ قیدِ حیات میں انساں — کبھی نہ ہوگا دلِ آسودہ کو ہوست الست
اُٹھائے ہاتھ جہاں سے ولیک کیا امکاں — کہ با فراغ کرے گنجِ عافیت میں نشست
چھٹا جو کوئی گرفتاریوں سے دنیا کی — تو سلسلہ میں فقیری کے وہ ہوا پابست
رہا وہ خدمتِ مرشد کی قید میں برسوں — کہ حق پرست ہو وہ پہلے جو ہو پیر پرست
گر ایک عمر میں پہنچا مقامِ عالی پر — کہا یہ شوق نے ہو ہمتِ بلند نہ پست

جو دستگاہ تصرف میں بھی ہوئی اسکو
تو یارا دہ ہوا اور بھی ہوں بالا دست

ہمیشہ جنگ ہی بعد صلح کل کے بھی
کہ نفس دشمن سرکش ہے اسکو دیجے شکست

جو ہوشیار ہے تو ہے وہ شرع کا پابند
پھنسا ہوا ہے وہ کیفیتوں میں گر ہے مست

نہیں ہے دام علائق سے مطلق آزادی
مجال کیا کہ نکلجائے کوئی کر کے جست

کہا ہے خوب کسی نے یہ شعر برجستہ
گیا زباں سے نکل اسکی جیسے تیر از شست

کہ کرد قطع تعلق کدام شد آزاد
بریدۂ زہمہ ۔ باخدا گرفتار است

دیکھتے ہیں جلوۂ گلہائے رنگا رنگ ہم
مثل نرگس جبتلک ہے اس چمن میں چشم وا

آخرش ہوگا وہی اک دن خزاں کے ہاتھ سے
جو کہ عالم اپنا اس نشو و نما سے پہلے تھا

ہے غنیمت کوئی دم نظارۂ رنگ بہار
پھر کہاں یہ گلشن اور گل اور یہ سبزہ یہ ہوا

در عدم بودیم و دیگر در عدم خواہیم رفت
ایں تماشائے جہاں را مفت مے بینیم ما

رباعیات

کیا فائدہ فکر بیش و کم سے ہوگا
ہم کیا ہیں جو کوئی کام ہم سے ہوگا

جو کچھ کہ ہوا ۔ ہوا کرم سے تیرے
جو کچھ ہوگا ترے کرم سے ہوگا

اعلےٰ جو عقلی کی ہے امامت کا مقام
رکھتے ہیں جبرئیل سے یہاں خاص عام

جو لوگ صف اوّل میثاق میں تھے
پوچھے کوئی ان سے کہ وہ کیسا تھا امام

سبطین نبیؐ یعنے حسنؑ اور حسینؑ
عینک ہے تماشائے دو عالم کیلئے

زہراؑ و علیؑ کے دو نو وہ نور العین +
اے ذوق لگا آنکھوں سے اُنکے نعلین

دل کو سرِ بازارِ جہاں کرنا اچاٹ
اے ذوق فلک کے جب ہیں بارہ بجتے

جس طرح بنے سود و زیاں میں دن کاٹ
سودا ہو نہ کیوں زیرِ فلک بارہ باٹ

جبتک تھے گرہ میں احمقوں کی پیسے
مفلس جو ہوئے تو پھر کسی نے انکے ذوق

سب کہتے تھے اُن کو آپ ایسے ایسے
پوچھا نہ کہ تھے وہ کون ایسے تیسے

اے ذوق کبھی تو نہ خوش اوقات ہوا
جبتک تھا جوان تھا جوانِ بدمست

ایک دم نہ تیرا صرف مناجات ہوا
اب پیر ہوا - پیرِ خرابات ہوا

آنکھ اُسکی نشہ میں جب گلابی ہو جائے
دکھلائے جو وہ روئے کتابی انکے ذوق

صوفی اسے دیکھے تو شرابی ہو جائے
سب مدرسہ کافرِ کتابی ہو جائے

جن دانتوں سے ہنستے تھے ہمیشہ کھل کھل
پیری میں کہاں اب وہ جوانی کے مزے

اب درد سے ہیں وہی رُلاتے ہل ہل
اے ذوق بڑھاپے سے ہوئے نا کل کل

اے ذوق فرشتے ہیں یہ کہکر روتے
اے کاش کہ انساں ہی ہم بھی ہوتے

غفلت میں یہ رہتا ہے یہاں تک ہشیار | شیطان کے چلا دیتا ہے سوتے سوتے

ان آنکھوں سے رُوئے لالہ گوں بھی دیکھا | اور پھر انکو پُر اشکِ خوں بھی دیکھا
کیا کیا دیکھے نہ رنگ ہم نے اے ذوق | یوں بھی دیکھا جہاں میں یوں بھی دیکھا

دنیا کے الم ذوق اُٹھا جائینگے | ہم کیا کہیں کیا آئے تھے کیا جائینگے
جب آئے تھے روتے ہوئے آپ آئے تھے | اَب جائینگے اَوروں کو رُلا جائینگے

دِل جنکا ہے آہن کی طرح سخت و سیاہ | وہ لطفِ سخن سے نہیں ہوتے آگاہ
بد اصل کو کیا نامِ خدا کوئی بتائے | بندوق کا طوطہ نہ کہے حق اللہ

اس جہل کا ہے ذوق ٹھکانا کچھ بھی | دانش نے کیا دل کو نہ دانا کچھ بھی
ہم جانتے تھے علم سے کچھ جانینگے | جانا تو یہ جانا کہ نہ جانا کچھ بھی -

---

مشکل ہے یہاں پائے خرد کا جمنا | اس وحشیٔ رم دیدہ کو کیسا رَمنا
ہم پے روِ عشق و عشق اپنا ہادی | جو عشق کہے ذوق کہو سَلْمَنا

کھُلتا نہیں اے ذوق یہ ہم پر مضموں | ہر شخص جو مذہب کا ہے اپنے مفتوں
کُئے کسے حق پہ اور باطل پہ کسے | کل حزب بما لدیھم فرحون

آئے اہد تم سے کیا جھگڑ کر لوں میں	غصہ سے کروں کسلئے دل کو خوں میں
میخوار و صنم پرست کہتے ہو مجھے ؟	تم ہو تم ہو ۔ جو کچھ کہ ہوں میں ہوں میں

رباعی[1] مرقومۂ حاشیہ میں نے ایک دن اُستاد مرحوم کے سامنے پڑھی اور کہا کہ حضرت اس میں وہ گرمی و تیزی اور صفائی نہیں جو آپ کی زبان کا جوہر ہے ۔ فرمایا ۔ کاٹ دو ۔ میں نے کہا مضمون تو بہت خوب ہے ۔ فرمایا ۔ رباعی کی بحر میں تو یہی ہوگا اچھا قطعہ کر دیتے ہیں ۔

دنیا سے ذوق رشتۂ الفت کو توڑ دے	جس سر کا ہے یہ بال اُسی سر میں جوڑ دے
پر ذوق تو نہ چھوڑیگا اس پیرہ زال کو	یہ پیرہ زال اگر تجھے چاہے تو چھوڑ دے

جنکو ہو وقت میں اسلام کا دعوے ہے کمال	عورت دیکھا تو اے ذوق ہے اُن کا یہ حال
جیسے محفل میں ہنسانے کو مسلمانوں پر	نقل کرتا ہو مسلمان کی کافر نقال

تو بھلا ہے تو بُرا ہو نہیں سکتا اے ذوق	ہے بُرا وہ ہی جو تجھکو بُرا جانتا ہے
اور اگر تو ہی بُرا ہے تو وہ سچ کہتا ہے	کیوں بُرا کہنے سے تو اسکے بُرا مانتا ہے

[1] رباعی مرقومۂ قبل دیوان مروج و مطبوع میں مع تغیروں کی بے خبری سے درج ہو گئی تھی ۔ الحمد للہ کہ اس میں اصلاح ہوئی ۔ بندہ آزاد کو یاد تھی ۔ ایسی اصلاحیں انکی ہمیشہ جاری تھیں ۔

اے ذوق کر یگا کوئی دنیا کو تو ترک	دنیا ہے بُری بلا ارے کیسا ترک
کیا دخل کہ ہو ترک کسی سے دنیا	جبتک نہ کرے آپ اُسے دنیا ترک

قدم سنبھال کے رکھ راہِ عشق میں اے ذوق
گذرنا اس رہِ پُرخار سے نہ آساں ہے

جو کوئی آبلہ پائے مور بھی ہے یہاں
ترے ڈبونے کو وہ بھی تنورِ طوفاں ہے

نذر دیں نفس کسکو دنیا دار
واہ کیا تیری کارسازی ہے

سچ کہا ہے کسی نے یہ اے ذوق
مالِ موذی نصیبِ غازی ہے

دل سے میں اپنے رسولِ عربی کا ہوں غلام
دل کہو۔ جان کہو جانیں ہیں اس بات کو سب

میں حضوری میں ہوں اسکی نہ کس طرح مدام
ہے یہ مشہور مثل مال عرب پیشِ عرب

ایک دوست کا چند اشخاص سے کچھ تنازع تھا۔ استاد کے مزاج میں سلامت روی و صلح جوئی بہت تھی دوست کو مجبور کر کے صلح کروادی۔ اور اس قطعہ سے اس کی بھی دلجوئی فرمائی۔ گویا اس کی زبانی کہتے ہیں۔

ناصحا مجھکو ملامت تو نہ کر
کسطرح میں عشق سے بیزار ہوں

بسکہ مجھکو عشق بازی کا ہے ذوق
کیا کروں میں ذوق سے ناچار ہوں

نواب بیبی محل کو بادشاہ کے مزاج میں بہت دخل تھا۔ مرزا جواں بخت اُن کے بیٹے تھے۔ اور باوجودیکہ بہت مرشد زادوں سے چھوٹے تھے۔ مگر بیگم کی خاطر سے اُن کی ولیعہدی کے لئے کوشش کر رہے تھے۔ اُن کی شادی کا موقع آیا۔ بڑی دھوم دھام کے سامان ہوئے۔ بیگم کی ایما سے غالب مرحوم نے یہ سہرا لکھکر۔ زرنگار کاغذ پر لکھکر۔

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہگری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

آزادہ رو ہوں اور مرا مسلک ہے صلحِ کل
ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے

کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں
مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے

استادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال
یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے

جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر
سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے

میں کون اور ریختہ ۔ ہاں اس سے مدعا
جز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے

سہرا لکھا گیا زرہِ امتثالِ امر
دیکھا کہ چارۂ اطاعت نہیں مجھے

مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات
مقصود اُس سے قطعِ محبت نہیں مجھے

روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ
سو انہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے

قسمت بُری سہی پہ طبیعت نہیں بُری
ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول کا غالبؔ خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

مثنوی

نواب حامد علی خان مرحوم نے عاشقانہ موقع پر ایک مثنوی خط کی استاد مرحوم سے فرمایش کی ۔ بادشاہ کی متواتر فرمائشیں ایسے کاموں کے لئے کب فرصت دیتی تھیں مگر اتفاق کہ انہی دنوں میں رمضان آگیا اور بادشاہ نے روزے رکھنے شروع کر دیئے ان کی زبان کب رہ سکتی تھی ۔ اس کے علاوہ اس نئے چمن کی ہوا کھانے کو اپنا دل بھی چاہتا تھا ۔ انہوں نے وہ نامہ لکھنا شروع کر دیا ۔ اور کئی دن میں ۔۔ ۳ شعر

ہو گئے ۔ لیکن ادھر رمضان ہو چکا ۔ ادھر بادشاہ نے پھر غزلیں شروع کر دیں ۔ مثنوی وہیں رہ گئی ۔ بیچیں کبھی کبھی پھر طبیعت میں اُمنگ اٹھی مگر ۔ ایک دن کبھی دو دن ۔ ۲۰ ۔ ۲۵ شعر ہوئے ۔ پھر رہ گئے ۔

میں نے جب ہوش سنبھالا اور ہر وقت پاس رہنے لگا ۔ تو اکثر اسکا ذکر کیا کرتے ۔ اور کہیں کہیں کے شعر بھی پڑھا کرتے میرے بار بار کہنے سے اُسے نکالا تو دیکھا کہ ۳ تختیاں مشق اطفال کی تھیں دونو طرف سے سیاہ تھیں اور کچھ کاغذی مسودے تھے تختیاں اکثر جگہ سے پڑھی بھی جاتی تھیں ۔ فرصت کے وقتوں میں وہ سوچ سوچکر بتاتے گئے ۔ میں لکھتا گیا ۔ ۵۰۰ شعر سے زیادہ ہوئے ۔ نامہ تمام تھا ۔ مگر ایک ایک مصرع ریزۂ جواہر تھا ۔ میرے صاف کئے ہوئے جزبھی اُنہی غزلوں میں تھے ۔ جو میں خلیفہ صاحب کے ہاں جا کر صاف کیا کرتا تھا ۔ سب کے ساتھ وہ بھی گئے ۔

اس کا نام نامۂ جانسوز تھا ۔ اول حمد و نعت تھی ۔ پھر ساقی نامہ ۔ پھر القاب معشوق اسی میں اُسکا سراپا ۔ اس کے بعد ایام وصل ۔ اسمیں چاروں موسموں کی بہار معنوں کی نزاکت ۔ لفظونکی لطافت ۔ ترکیبوں کی خوبیاں ۔ اندازوں کی شوخیاں ۔ کیا کہوں ۔ سامری کا جادو ۔ اس کے آگے دھواں ہو کر اُڑتا تھا ۔ چند متفرق شعر دیوان مطبوعہ میں ہیں ۔ چند شعر مجھے یاد تھے ۔ یکجا لکھدیتا ہوں کہ جو یادگار رہ جاوے وہی غنیمت ہے ۔

مثنوی

چاہئے نام اُسی کا اے خامہ زینتِ نامہ زیبِ نامہ	ہے فلک ایک نمونہ قدرت کا یا قلمدان ہزار صنعت کا

رخِ قرطاس کو سفائی دی — اور سیاہی کو روشنائی دی
دیا قمری کو مصرعِ نالا — مصرعِ قدِ سرو پر بالا
کی عطا نوخطوں کو کلکِ ادا — کیا عاشق کو تختۂ مشقِ جفا
نمک افشاں ہے عشقِ شور انگیز — زخمِ دل کرتے ہیں پر پر بریز
عکس ہے سبزۂ لبِ جو کا — دسمہ قوسِ قزح کے ابرو کا
آئے گلشن میں فصلِ گل سو بار — بلبلیں ہوں ترانہ سنج ہزار
ساقیا جلد اُٹھ درنگ نہ کر — عرصہ مطلب کا دیکھ تنگ نہ کر
طاق سے تو اُتار لے شیشہ — طاق پر رکھ کتابِ اندیشہ
شیشہ مے کی یہ دراز زباں — اور پھر یہ ستم کہ پنبہ دہاں
میں ہوں مانندِ ساغرِ لبریز — جاں بلب جاں بلب کو کیا پرہیز
جھوم جھوم ایسے بادل آنے لگے — پانو توبہ کے لڑکھڑانے لگے
کردے یہاں تک مجھے نشہ میں چور — تاکہ مانندِ خوشۂ انگور
دل کے سارے پھپولے پھوٹوں میں — نکتہ باقی کوئی نہ چھوٹوں میں
شبِ ہجراں بسر نہیں ہوتی — نہیں ہوتی سحر نہیں ہوتی
بسترِ رنج و کنجِ تنہائی — رات کیا آئی ایک بلا آئی
شام سے حال ہے یہ صبح تمک — نہیں لگتی مری پلک سے پلک
کیوں نہیں بجتے سحر کے طبور — کیا شفق نے بجھا دیا سیندور
گر لکھوں خط میں بیقراریٔ دل — نامہ بر ہو کبوترِ بسمل
مضطرب جب ہوا دل ہے — دل ہے یا مرغِ نیم بسمل ہے

دل کی دانشد کی کیا کروں تدبیر
غنچۂ دل ہے غنچۂ تصویر

جانِ بیتاب جیسی بیکل برق
وہ بھی گرمِ رہِ فنا کا لبرق

نبضیں چھوٹی ہوئیں غشی طاری
ایک فرقت ہزار بیماری

دل سے رخصت ہے تاب و طاقت کی
بیقراری نے استقامت کی

ہوئیں سیرِ باغ ہے کس کو
دل ہے کسکو داغ ہے کس کو

کاٹ کھانے کو دوڑتا ہے گھر
سگِ دیوانہ بن گیا ہے گھر

اب ہو یک لخت دل کہ ہو صد لخت
تن بتقدیر سنگ آمد و سخت

ہو چکی دلکی اپنے عشق میں خیر
رہوں دریا میں اور مگر سے بیر

ماہِ سیمبر ملکہ دشمن مہر
ہر ستم میں ستم شریک سپہر

برق کا وہ ذرا چمک جانا
اور بغل میں ترا دبک جانا

فتنہ اُستاد نرگس فتاں
گردِ مژگاں ہجوم شاگرداں

رخ تعالی و زلف صل علے
قد وہ سُبحَانَ رَبِّیَ الاَعلےٰ

زلفِ جنباں میں رخ کی بُرّاقی
کرے مشائیوں کو اشراقی

گو اَنَا رَبُّکُم نہ مُنہ سے کہے
لیک جاری زبانِ ہر مُو سے

مچھلی بازو کی یا ہے دُوالفین
غرقہ کش بحرخوں سے مردمِ عین

کمر و ناف از پئے دلِ زار
رشتۂ کار و عقدۂ دشوار

و زلف و رخسار و وصل علے

رنگِ پاں لعل روح افزا پر
خون ثابت کرے مسیحا پر

قصیدہ نمبر (۱)

نظر ثانی سے نور نہیں پایا۔ اکبر شاہ مرحوم کی مدح میں ہے۔

سحر جو گھر میں۔ بشکل آئینہ۔ تھا میں بیٹھا۔ نزار و حیراں
تو ایک پری چہرہ۔ جو رطلعت۔ بشکل بلقیس و ماہ کنعاں
پری کی صورت۔ چمن کی رنگت۔ گراس کا شیوہ تو اسکا جلوہ
زبانِ شیریں۔ بیانِ رنگیں۔ کلامِ رنداں۔ خرامِ مستاں
انیس خلوت۔ جلیس جلوت۔ حریفِ حکمت۔ ظریف صحبت
بہ بزمِ یاراں۔ بدل بہاراں۔ باہل عزلت۔ گلے بداماں
حسیں بشکل دمِ منور۔ عرق کے قطرے ہیں اس میں اختر
ہلال ابرو۔ نگاہ جادو۔ خدنگ مژگان۔ و چشم فتاں
بروئے رنگیں۔ نگار بستاں۔ شگوفہ خنداں۔ گرنہ خنداں
بموئے پیچاں ہے عشق پیچاں۔ جو ہیں پریشاں تو دل پریشاں
وہ گوش پر زیب کج کلاہی۔ جو دیکھو بینی تو یا آنکھی۔
دہن میں غنچہ۔ لبوں میں گلبرگ و۔ روئے روشن میں مہرباں
نگاہ ساغر کشِ تماشا۔ بیاضِ گردن۔ صراحی آسا۔
وہ گول بازو۔ وہ گوری ساعد۔ وہ پنجہ رنگیں بخون مرجاں
کمرِ نزاکت سے لچکی جائے۔ کہ ہے نزاکت کا بار اٹھائے
اور اسپہ سونا رلہر کھائے۔ پھر اسپہ ہیں وہ قمر فروزاں

وہ ران روشن ۔ وہ ساق سیمیں ۔ وہ پائے نازک ۔ حنا میں رنگیں
وہ قد قیامت ۔ وہ فتنہ قامت ۔ دلوں پہ شامت جو ہو خراماں
جو نام پوچھا ۔ کہا خوشی ہوں ۔ جو وصف پوچھا ۔ تو دلبری ہوں
سبب جو پوچھا ۔ تو ہنسکے بولا ۔ کہ ذوق تو بھی عجب ہے ناداں
وہ شاہ جو ہے ۔ محمد اکبر ۔ جہاں میں رشکِ جم و سکندر
جلوس جشن اوسکا ہے فلک پر ۔ اُسی کے پرتو ہیں سب یہ ساماں
یہ سنتے ہی میں نے بالبداہت ۔ لکھا وہ مطلع شفق شباہت
کہ جسکو احسن کے سخنور سہ پڑھے بہ تحسیں ہر ایک سخنداں

مطلع

شہنشہا تیرے سر پہ دوراں ۔ ہے چتر دن کے ہوتا قرباں
کہ ہفت اختر بہ ہفت کشور ہیں آج یکسر مطیع فرماں
وہ ہے ترا اختر ہمایوں ۔ کہ ہو کے روشن چراغ گردوں
مدام کانپے ہے شعلہ آسا ۔ بزیر فانوسِ چرخ گرداں
سحابِ ہمت جو دُر فشانی ۔ کرے بہنگامِ حکمرانی +
تو ہو نجالت سے پانی پانی ۔ ہوا پہ یکدست ابر نیساں
تری عدالت میں ہے یہ قدغن ۔ کتاں کو دیکھے نہ ماہ روشن
وگرنہ ہالہ ہو طوق گردن ۔ کہ تا ہو دل میں بہت پشیماں
جو تیغ بُرّاں کو اپنی شاہا ۔ کرے علم تو بروزِ ہیجا
تو زیرِ دامان ابر اپنا ۔ دکھائے جلوہ نہ برق رخشاں

یہ تیرِ خنجر سے ہے یا کہ شہپر۔ کہ جس کے لگتے ہی دم میں اُڑ کر +
قفس سے ہوتا ہے تن کے پرّاں۔ ترے مخالف کا طائرِ جاں
ہے عیدِ قرباں میں تیری میموں۔ رکھا بزرگوں نے شتر گردوں
کہ کھا کے گاؤ زمیں نہ ہیبت۔ کہیں بہ زیرِ زمیں ہو لرزاں
رکھے گا غفور چینی خانہ۔ تو حکم دے اے شہ زمانہ
بنا صفاہاں پہ آستانہ۔ کہ بیٹھے دارا بجائے دہباں
تری سخاوت کا سُن کے عالم۔ اُمنڈ پڑا ہے تمام عالم
عرب سے آیا ہے چل کے حاتم۔ بلب سوال و بدست داماں
جو آئیں بخشش میں لعل شیریں۔ چمک ہو اُن کی کلام رنگیں
تو حکم دیوے تو ہو ویں آئیں۔ تو ہنسکے بولے تو گل ہو خنداں
جو ہو سوارِ سمندِ تازی۔ کرے تو میداں میں اسپ تازی
تو سمجھے دورِ فلک کو بازی۔ بپائے گوئے و بدست چوگاں

یہاں چند شعرا ایسے تھے کہ پڑھے نہ گئے

وہ تیرا ہے فیلِ کوہ پیکر۔ کہ جسپہ کہتے ہیں سب نظر کر +
فلک پہ دُمدار ہیں دو اختر۔ دو یا نمایاں ہیں اُس کے دنداں

یہاں چند شعرا ایسے تھے کہ پڑھے نہ گئے

تیرا جو وصفِ خجستہ شاہا لکھے۔ قلم کو کہاں ہے یارا
ثنا و دعا پر ہے ختم کرتا۔ جو ذوق تیرا ہے تہنیت خواں
کہ روز تجھ کو خوشی ہو افزوں۔ حسود ہوں سرنگوں و محزوں

یہ جشن ہو فرخ و ہمایوں۔ سدا بصد فر و شوکت و شاں

قصیدہ نمبر ۲

اکبر شاہ مرحوم کی مدح میں ہے۔ افسوس کہ منظر ثانی سے نور نہ پایا۔ ورنہ عجب جلوہ دکھاتا۔ اکثر شعرا اس کے زبانی سنا کرتے تھے۔ دل روشن ہو جاتے تھے۔ کئی شعر مسودہ موجودہ میں نہ تھے۔ بندہ آزاد کو اُن کی زبانی سُنے ہوئے یاد تھے۔ وہ بھی درج کئے ہیں۔

صبح سعادت نورِ ارادت تن بریاضت دل بہ تمنا
جلوۂ قدرت عالمِ وحدت چشم بصیرت محو تماشا
قصرِ رفیع و صحنِ وسیع طرفہ سجع سطح مربع
باغ ارم یا روضہ رضواں خلد بریں یا جنتِ ماوٰے
مرغ خوش الحاں بر سر بستاں ہر گل بستاں خورم و خنداں
گوش شقایق۔ محو سرود و دیدۂ نرگس مستِ تمنا
لحن قماری شکل مسجع صوت عنادل وردِ مہلل
سرو بقامت نخل دعاؤ نگہت گل یادم بہ مسیحا
فصل ربیع و موسم اُردی معتدل ایک جا گرمی و سردی
میل عناصر سوئے طبائع ربطِ قوائے با عالم اشیا
چہرہ گلشن آتش رخشاں سرخی گل میں لعل بدخشاں
سبزہ بہ شبنم رشک جواہر لالہ بہ ژالہ لولوئے لالا

ن رنگ بہ گل دامان مسیحا

قلب کو فرحت روح کو راحت عقل کو قوت طبع کو جودت
جلوۂ ساقی نغمۂ مطرب نالہ بہ چنگ و نشہ بہ صہبا
خندۂ گل پر نشار مل پر سرو چمن پر لطف سخن پر
نغمۂ بلبل نالۂ صلصل قہقہۂ قلقل برلب مینا
غلغلہ اندر محفل مستاں وجد میں خیل بادہ پرستاں
نغمہ طرازاں بار بدآسا چنگ نوازاں شکل نگینا
جام بلوریں بانے لعلیں صبح بہارو گلشن رنگیں
پنبۂ مینا بر سرمینا اختر صبح و گنبد خضرا
ساقی مہوش مست شبانہ مطرب دلکش صرف ترانہ
مژدۂ عید اقبال مجسم وقت سعید انوار سراپا
ایک بت ترسا۔ با دل سنگیں۔ نعبت کافر باہمہ تمکیں
صورت لات و شکل منات و رشک یعوق وغیرت عزّے
کان ملاحت بحر صباحت جوئے فصاحت گلشن راحت
شور میں لیلےٰ نور میں سلمےٰ لہجہ میں شیریں جلوہ میں عذرا
وہ لب میگوں عارض گلگوں وہ قد موزوں چشم پرافسوں
برگ گل تر لالہ احمر سرو صنوبر نرگس شہلا۔
خال بلب ہے۔ نقطۂ مشکیں۔ یا ہے ہلال وچشمۂ شیریں
مردم دیدہ محو بدیدہ لالہ بہ داغ و دل بہ سویدا
فوج نظارہ جوں رم آہو۔ آہوئے کعبہ نرگس جادو

چین بر جبیں محراب بہ کعبہ ۔ طاق دو ابرو مسجدِ اقصےٰ
چاہِ زنخداں آبِ زلال ۔ اور اسپہ تکلّم چشمۂ شیریں
ناصیہ روشن جوں کفِ موئے زلف شکن در خطِّ چلیپا
پان کی سرخی لب سے گلو تک دست و گریباں قوس قزح سے
دام برائے گردن عنقا چشم و چراغ دیدۂ حورا
بیت زلالی لب بہ تکلم ۔ فرد خیالی رنگ تبسّم
موئے میاں جوں معنیٔ نازک تنگ دہاں سربستہ معما
عارضِ گلگوں چشمِ پر افسوں سیزۂ ترسے طرزِ نظر سے
مایۂ نازو ۔ غمزہ طرازو ۔ گلشنِ رازو ۔ راز بدلہا
فتنہ سراپا ۔ قہر سراسر ۔ سست و فا میں چست جفا میں
شرم سے ڈوبا بحرِ حیا میں ۔ ناصیہ رو بر عالم بالا
رمز سے ہو کر صرفِ تکلّم ۔ ناز سے ہو کر لب بہ تبسّم
مجھ سے کہا ہو زمزمہ پیرا ۔ تو بھی تو بول اے بلبل شیدا
میں نے پڑھا ایک مطلع روشن مدح میں تیرے جس سے ہو گلشن
روح معنّےٰ اے شہ عالم ۔ عشق ہو جریر اور شاد ہو غنچے

اے شہ عالم ۔ درہمہ عالم ۔ عالی اعلےٰ ۔ والی والا
لب بہ ستائش ۔ دل بہ نیائش ۔ جلوہ طراز عرش معلےٰ

نفس خلافت از رہ رتبت تخت خلافت عرش بہ عظمت
تو ہے بہ حکم وجہ جو صورت وہ ہے بہ نفس رتبہ ہیولےٰ

روح مجسم عقل مکرّم نفس منقدس جسم مطہر
باطن صافی جان موانی پردہ بہ دنیا جلوہ بہ عقبے
علم حقیقی علم مجازی تیرے طفیل ساری وطاری
اصل مبانی نقل معانی عقل کو تیرے عیش مہنیا۔
سارے پڑھے اسمائے الٰہی سب ہیں موثر لے شہ اکبر
اسم جو اعظم ہے تو وہی ہے جس سے ہے تیرا اسم مسمّے
فہم میں لے کر صافی طینت رکھ کے نظر میں اوج قرینت
غرق حیا ہیں زمزم و کوثر سر بہ زمیں ہیں سدرہ و طوبے
خلق کریم و نفس نفیس و ابر مفیض و فائز رحمت
آب بقا و خاک شفا و نار خلیل و باد مسیحا۔
تو سر دنیا ظل الٰہی حکم ترا تا ماہ بماہی
تخت ترا ہے تا بہ ثرے۔ اور فوق ہے تیرا تا بہ ثریا
حکم پہ حاضر نظم پہ ناظر۔ تیرے جلوس جشن کی خاطر
فوج سکندر لشکر دارا۔ تخت فریدوں مسند کسرے
تجھ سے ہی قایم شام و سحر ہے۔ تجھ سے ہی دایم تازہ ترہے
بار مراد و برگ نشاط و۔ شاخ امید و نخل تمنّا
تو بہ ریاست تو بہ فراست۔ تو بہ مقالت تو بہ سیاست
فطرت لحیاں فکر جماعت حسن بیاض و غصہ حمرا
رو بہ رضا و لب بہ دعا و دست بہمت پا بہ اقامت

لب بہدایت دل بہ درایت صرف بہ زہد و محو بہ تقوٰے
تو بہ حقیقت تو بہ طریقت تو بہ شریعت تو بہ ودیعت
پاک سرشت و نیک نوشت و جسم مطہر قلب مصفّٰے
رو بہ تجمّل خو بہ تحمّل کف بہ تکلّف لب بہ تکلّم
ردکش یوسف ہمسر صالح ہمرہ موسٰے ہمدم عیسٰے
تیری محافظ آیۂ کرسی ۔ تیری معاون آیتِ قدسی
زیب نمایم سورۂ یاسیں ۔ حسن عزائم سورۂ طٰہٰ
جانب اعدا تو سر میداں کھینچ لے جسدم صارم براں
نعرہ ہو اس کا اَقتُلْ اَقتُلْ ۔ ندیہ اس کا نحن قتلنا
جلوہ سے تیرے ہو نہ منور شام و سحر آفاق تو کیونکر
مہ ہو دوائے دیدۂ شپّر مہر ضیائے حیرت حربا
تو دم فرحت تو دم عشرت تو دم صولت بر سر دولت
ماہ بسرطاں زہرہ بمیزاں تیر بہ قوس و شمس بہ جوزا
فہم ترا وہ عقل ارسطو بالغہ جس سے جوہر ثانی +
عقل ترا دے درس فلاطوں فلسفہ جس کی ابجد اولے
حال دو عالم تجھ میں ہے پیدا ۔ اور ہے بہ تو رکشف ہویدا
غیر قیافہ غیر سرودہ ۔ غیر تفاؤل غیر بہ رویا
تیری شمیم خلق سے طاری ۔ تیری نسیم طبع سے جاری
باد بہاری مشک تتاری ۔ عود قماری عنبر سارا

فکر فرنگ و دانش یوناں آگے ترے ہے طفل دبستاں
تو ہے وہ باہر۔ تو ہے وہ باہر۔ تو ہے وہ بینا تو ہے وہ دانا
تیغ سے تیری پیکر دشمن ۔ حلقہ بہ حلقہ جب ہو بہ جوشن
پیش یکیماں کب رہے ثابت ۔ عقل سے جزو لا یتجزا ے
زینت لوح شوکت و شاں تو زیب سر توقیع جہاں تو
اسپہ مزین جوں گل طغرا ے ۔ اسپہ مستجل جوں خط امضا
حاتم دوراں منذر نعماں رستم دستاں شیر نیستاں
توبہ سخاوت توبہ عنایت تو دم جرات تو سر ہیجا
حسن ادائیں نکتہ موزوں طرز بجائیں گوہر مکنوں
شغل و عمل میں نظم مسجع ۔ حرف سخن میں نثر مقفےٰ
تیرا ہے توسن سایہ ذوالمن ۔ برسر جستن در دم رفتن
برق جہان و آب روان و شعلہ آتش موجۂ دریا
باد بوقت تیز روانی ابر بوقت قطرہ فشانی ۔
جب تو اڑا دے کوہ و جبل پر جب تو رواں ہو جانب صحرا

یہاں سے دو شعر رہ گئے ۔

فیل ہے تیرا ابر بہاراں ۔ پر بہ خیال بادہ گساراں
ہووے درخشاں برق بہ ہاراں دے جو ہلا زنجیر مطلا
بحر بوسعت کوہ برفعت ۔ پردہ کوہ نور بہ ظلمت
اسپہ طلوع جلوۂ طلعت ۔ طور پہ گویا نور تجلے

پشت پہ اُسکی ہو وہ زریں قوس قزح سے مستک رنگیں
تیرا طلوع اے خسرو خاور صبح شفق میں کردے ہویدا
تھا جو سخن آغاز ثنا سے ختم سخن ہو حسن ادا سے
ذوق سخندان تیری دعا سے طرز سخن موزوں ہو سراپا
دل ہے ترا یا نور کا عالم بلکہ فروغ طور کا عالم
پیش نظر ہے دور کا عالم سُن تو سہی افلاک پہ ہے کیا
ورد ملایک نام خدا ہے دیکھ زباں پر کسکی ثنا ہے
دل کہ سراپا دست دعا ہے دست دعاؤ دامن شبہا

تاکہ زماں منضم بہ زمیں ہو دور میں چتر چرخ بریں ہو
شاہ کا عالم زیر نگیں ہو سطح زمیں ہو عالم بالا

قصیدہ نمبر (۳)

اکبر شاہ مرحوم کی تعریف میں ہے۔ افسوس کہ نظر ثانی سے محروم ہے۔ آغاز جوانی کا کلام ہے

خضر نصیب کی گر۔ دنیا میں رہبری ہو
اور شاہ راہ دلبر۔ چشم ہنروری ہو

منظور ہر نظر میں تب شکل آئینہ ہوں
روشن قلم سے میرے تاج سکندری ہو

تارہ کی طرح چمکے ذرہ میرے سخن کا
اور نام میرا روشن جوں مہر و مشتری ہو

میں رستم معانی۔ اور سیستان سخن ہے
دیتا جو زور قسمت دل کو تنا وری ہو

برگشتہ بخت اپنا۔ گر آئے راستی پر
گردوں بھی سرنگوں پھر دیکھ اپنی سُری ہو

یہ کہہ رہا تھا میں جو۔ یکبار عقل بولی
وہ بات کہہ کہ جس میں میری بھی لبری ہو

تجھکو خبر نہیں کیا۔ ہے دورِ شاہ اکبر
رفعت سے پست جسکی شانِ سکندری ہو

ہے فکر کیا جب ایسا۔ فیاض ہو جہاں میں
اور دل کا اُس کے مقصد خود بندہ پروری ہو

مثلِ سحاب جاکر باندھے ہوا فلک پر
جسپر کہ اُسکی چشمِ الطاف سرسری ہو

دربار میں تو اُسکے۔ ہو بہرہ یاب جاکر
پھر وہ ہی ہو مے میری اور تیری بہتری ہو

لیکن بروز رسائی۔ اُس وقت ہوگی روشن
جب خضرِ راہ تیری۔ طبعِ سخنوری ہو

تو بھی تو سوچ دل میں تیرے دُرِ سخن کا
اُسکے سوا جہاں میں کون آج جوہری ہو

اس کی نظر چڑھیں گر یہ تابدار گوہر
پھر نام تیرا روشن مانندِ انوری ہو

تب بحرِ فکر میں دل۔ غوّاص ہو کے اُترا
معلوم تا کہ سبکو۔ زورِ شناوری ہو

مطلع یہ ہاتھ آیا شہوار بن کے موتی
شرمندہ جس کے آگے۔ صدفِ جوہری ہو

شاہا نظر کرم کی جس ذرہ پر ذری ہو
وہ آسماں پہ جاکر خورشیدِ خاوری ہو

دیکھی ہے جیں ابرو آئینہ جبیں میں
کیونکر نہ تن میں اسکے ہیبت سے تھرتھری ہو

کیا تاب ہے فلک کی جنبش کرے جگہ سے
گر بہر پائے بندی ایما سرسری ہو

یہ آستانِ دولت ہے سجدہ گاہ عالم
دل کو تیری عقیدت اورنگ سروری ہو

دارا کو تیرے در تک ہو کس طرح رسائی
درباں جو تیرے در کا۔ کرتا سکندری ہو

سورج مکھی کا تیرے ایک پھول مہر انور
قربان چترِ دولت۔ نہ چرخِ چنبری ہو

باغِ جہاں میں نرگس۔ کے کیوں نہ جامِ زرّیں
جب ہر گدا کو دیتا ایک ساغر زری ہو

دکھلائے آبداری۔ جب تیغ شعلہ دم کی
شیروں کے دل میں ٹھنڈا خونِ دلاوری ہو

کشتِ اَمل کو سرسبز۔ آب گہر سے کردے
ابرِ کرم کی تیری جب فیض گستری ہو

بیشہ میں ملت کے۔ وہ شیر ہے تو شاہا
نو شیرواں کو جس سے ہرگز نہ ہمسری ہو

شیوہ مہوسوں کا پھرکرم میں تیرے
تیری گداگری ہو کیوں کیمیاگری ہو

گر آفتاب تیرا۔ ڈالے کرن کو اپنی
تاجِ گدا کا جلوہ۔ جوں تاجِ قیصری ہو

تیری ثنا میں شاہا۔ لکھتا ہوں جب مطلع
جسکی چمک سے کاغذ۔ جوں کاغذِ زری ہو

پابوس نقش پا سے۔ تیرے جو کنکری ہو
جا کر فلک پر اُسکو۔ تاروں سے برتری ہو

ابرِ کرم سے تیرے۔ کیا دور ہے کہ شاہا
کشتِ فلک میں پیدا۔ سرسبزی تری ہو

سورج کی جو کرن ہے۔ گردوں سے لے زمیں تک
مانندِ عشق پیچاں۔ پھر بسر ہری ہو

مریخ کو فلک پر جس تیغ سے ہو ہیبت
دشمن کو بھاگ کر پھر۔ کیا اُس سے جاں بری ہو

نعرہ سے تیرے ہووے۔ ہیبت کا چاک سینہ
دل پر دلاوری کے وہ تیغ حیدری ہو

تیرے سوا جہاں میں۔ کون آج ہے توانا
جو دل کے ناتواں کو دیتا تونگری ہو

جاروب کش ہے تیرے میشکوئے خسروی کا
زیبا ہے ماہ کو گر۔ فرمانِ مہتری ہو

خورشید نذر لاوے۔ جب افسر شعاعے
منشورِ افسری پر توقیعِ خاوری ہو

ابرے دو تاج بخشی جسدم کرے اشارت
کشتی میں لے کے حاضر وہ افسری ہو

لائیں پئے سواری۔ تو سن کو جب سجا کر
صورت میں ہووے پتلی۔ پرواز میں پری ہو

چلتا ہوا ہے افسوں۔ اُڑتا ہوا چھلاوہ
پھر اس سے آگے بڑھکر۔ کیا سحر سامری ہو

کیا برشِ قلم وہاں دکھلائے شہسواری
جب توسن تصور کہاں اسکندری ہو

خاکِ قدم ہو اس کی۔ اہلِ نظر کو سونا
جو نقشِ سُم ہے اُسکا وہ مُہرِ اکبری ہو

تو اسپہ برسرِ زیں۔ جوں حل پر ادب سے
اُمّ الکتاب لیکر جبریل نے دھری ہو

کس وصف کی ہو سیر ھی ہاتھی تیرے موزوں
کرتا نہ فیل گردوں جسکی برابری ہو

اس طرح جلوہ گر ہے۔ تو بر سر عماری
بیچ حمل میں جیسے۔ خورشید خاوری ہو

چار آئنہ بدن پر دشمن کے گر سجا ہو
اور سر پہ اُس کے ٹوپی فولاد کی دھری ہو

پر جیسے آئینہ سے۔ تیر نگاہ گذرے
یوں غرق اس میں تیری۔ ہر تیر کی سری ہو

کیا سعد و نحس کا یہاں رہے حساب باقی
جب چھائی آسماں پر۔ فرخندہ اختری ہو

ختم ثنا ہے کرتا اب ذوق اس دعا پر
تو مدعا پہ اسکی گر ملتفت ذری ہو

جو ہو ترا دعا گو گلرنگ ہو وہ کھلکر
بدخواہ اگر ہو خنداں سد برگ و جعفری ہو

ہو سیر بخت تیری گر اوج میمنت پر
رفتار بختِ اعدا بر رسم قہقری ہو

قصیدہ نمبر (۴۱)

یہ قصیدہ ایام طالب علمی کا ہے مطالب اس کے محمد کوثر پر شاہد حال ہیں افسوس کہ نظر ثانی سے نور نہ پایا۔ اکبر شاہ مرحوم کی مدح میں ہے۔

تا زبان دہر میں ہو فلسفی کا یہ کلام
ہے پئے افلاک لازم نفی خرق والتیام

تا خط محور پہ ہو گرم گردش آفتاب
تا نہ قطبین فلک تک پہنچے دور صبح و شام

سبعہ سیارہ ہوں سائر تا سر ہفت آسماں
ہو ثوابت کا سپہر ہشتمیں پر ازدحام

منجمد ہو کر میان طبقہ ہائے زمہریر
قطرہ افشاں تا بخار ابر ہوں بنکر غمام

آب باراں سے گذر کر منتشر تا ہو شعاع
انعکاس رنگ سے قوس قزح پائے نظام

تا حقیقہ کیلئے لطف سخن ہو وے مجنا
صنعتیں ہوں اُس سے پیدا بامرام و بے مرام

تاکریں روشن معانی و بیاں سحر بدیع — جنسے ایراد معانی ہو تحسین الکلام
تا ان ولن کے اذن دیں فعل مستقبل کو نصب — جازم فعل مضارع ان ولم لما ولام
تاکہ علم شعر ہو داخل بہ اوزان بحور — تا افاعیل و تفاعیل اس سے پائیں انتظام
اور زحافوں کا عمل لیکر ردیف و قافیہ — گر عرب گا ہے عجم میں انکو دے موزوں مقام
تا اطبا رزماں کو ہووے علم طب کی ساتھ — نحو نبض و فکر بحراں۔ فکر الوان قوام
تا خس و حکاک لانزغ۔ رحوہ و ثاقب ثقیل — جبتلک امراض مہلک کا اطبا میں ہو نام

یہاں سے چند شعر پڑھے نہیں گئے

کلیات خمسہ ہوں منطق میں ایسا نو جیا — یعنی جنس و فصل و نوع و خاصہ اور عرض عام
مادی و فاعلی علت کو تا صورت کے ساتھ — علت غائی پہ دیویں اہل دانش انصرام
تا ریاضی و طبیعی سے بزور فلسفہ + — فیلسوفاں جہاں علم و عمل میں لیویں کام
تاکہ بیت سعد اکبر ہوں فلک پر قوس و حوت — تاکہ جوزا اور حمل میں شمس کو ہو احتشام
سنبلہ کو تا منجم کہوے ہے شاید عقیم — تاکہ ہو دست و بغل جوزا فلک پر شاد کام
حکم ہو برجیس و کیواں کا رواں برچین و ہند — تاکہ تیر و ماہ روم و بلخ پر رکھیں مقام
تا خراساں مہر کو۔ بہرام کو ہو ملک ترک — ماوراء النہر پر ناہید کو تا ہو قیام
تاکرے معلوم صطرلاب سے اختر شناس — ارتفاع ہر ستارہ روز و شب یا صبح و شام
تا زحل کے ساتھ شکل عقدہ وانکیس کو — زائچہ میں دیتے ہوں صاحب محل نسبت مدام
ہووے دائر عرصہ برزخ میں تا بحث حکیم — ہوں مذبذب جبر اور تفویض میں اہل کلام
رد کریں تا دعوئی رویت کو اہل اعتزال — اور ملاحد وسوسوں سے دیں بنی کو اتہام
محو ہو جبتک کہ جوگی شغل استدراج میں — سینہ و سر میں رکھے مرغ نفس کو اپنے تھام

تاکہ سالک مسلک تقوے میں کرتا ہو سلوک
تا ہے مجذوب مستِ بادۂ غفلت مدام

تا وجود پاک سے ابدال اور اوتاد کے
انتظام اہل عالم ہووے عالم میں تمام

تا خراسان و عراق و زابل و تبریز سے
نغمہ ریز فارس آباداں کہے اپنے مقام

مدتہم و پنجم کھرچ گندھارد ہیوت اذنکھاد
نغمۂ ہندی کا ہووے سات سُر سے انتظام

تاکہ فروردی۔ابا روآب ایلول اودیبل
ماہ شمسی ہو مطابق ہر ولایت میں مدام

یارب اُسکا رتبۂ عالی ہمیشہ ہو فزوں
دولت اُسکی ہو کنیز اقبال ہو ادنے غلام

کون وہ یعنی محمد شاہ اکبر دیں پناہ
نیک صورت نیک سیرت نیک طالع نیک نام

زور دینداری سے جسکی ہے کھاتی خود بخود
بیخ و بنیان ضلال و کفر شکل انہدام

کیا تعجب ہے اگر اُس کی بہار فیض سے
گلشنِ گیتی ہو رشکِ روضۂ دار السلام

مرغزار عالم اسکی فیض سے ہے بسکہ سبز
پائے ہے رنگ مرد پارۂ سنگِ رخام

کہکشاں سے لے عصائے نقرئی پیر فلک
کرتا ہے قتِ سواری شکل چاؤش اہتمام

لے شمیم خلق اگر اُس سے تو ہو جائے ابھی
طبلۂ عطار کی صورت معطر مشام

گلشن مدح و ثنا سے اس کے اے گلچین فکر
لا گل مضمون تازہ جلد بہر اشتمام

محترم یوں ذات عالی ہے بہ جمہور انام
حلقۂ تسبیح میں جوں سر بر آوردہ امام

مائدہ اور من و سلوے کی کسے ہے احتیاج
مطبخ عالی سے تیرے سبکو پہنچے ہے طعام

بہرہ ور خورشید سے کوہ بدخشاں ہے فقط
نیر اجلال کی تیرے نظر عالم پہ عام

غنچہ تصویر کو بھی مثل گلہائے چمن
ہے نسیم لطف سے تیرے ہوئے ابتسام

ہے ملا دست سخا کے ساتھ تجھکو زور حکم
دست قسام ازل سے بسکہ وقت اقتسام

فیض تیرا ہے کہ پائے خرقۂ ماہی درم
حکم تو دیوے تو رہوے نیر دریا تشنہ کام

دشمنِ بدبیں کو آبِ خضر بھی ہرآب ہے
اور دمِ عیسےٰ گلے میں بہر شِ آبِ حسام

پر ہوا خواہو نکو تیری مرحمت سے خسروا
فیضِ انفاس آکھی ہیں نفوسِ انتسام

دستِ صحت ہے رگِ ہر سنگ کوہِ دشت میں
نبضِ سالم کی طرح جنبش دکھائیگی دوام

دیں مریضونکو دمِ عیسےٰ تو یوں نکلیں وہاں
قطرۂ ریزش گریں جسطرح مے قت زکام

مستفید نور کب ہے شمس سے جرمِ قمر
نیرِ اجلال سے ترے جلا لیتا ہے دام

روبرو دستِ کرم کے ہوتی گرد و باد ہے
آبروئے ابر گوہر بار افے والاحترام

تو جھروکو نمیں جو بیٹھے آکے بہرِ عدل و داد
شیر و آہو گھاٹ پر جمنا کے ہوں آپس میں رام

تا نہ آئے زخمِ عاشق کے دلِ ناکام پر
تیغِ ابرو پر بتاں رکھتے ہیں وسمہ سے نیام

اے فریدوں تو جو کردے راہ خونریز کو بند
اور لبوں سے جام کے چھلکے رحیق لالہ فام

شانہ ضحاک کی مانند ایک ایک اسکی موج
مارِ پیچاں بن کے ہوے متحد باخطِ جام

معجزِ انصاف سے تیرے سر دشت و جبل
ہر غزالہ ناقۂ صالح ہے گویا بے زمام

قصد صید اسکا کرے کوئی معاذ اللہ اگر
ہو خدا کا قہر نازل اسپہ بہر انتقام

آیا جب تیرے مقابل اے نہنگ بحر رزم
شکلِ خرچنگ اُلٹے پانوں ہٹ گیا دستانِ سام

گنجِ استقلال پر ہے قفل اگر تیری سپر
وقت پر شمشیر ہے مفتاح ابوابِ مہام

جوں عصا حضرتِ موسےٰ سر دریا نیل
نیزہ تیرا لشکر اعدا میں کر جاتا ہے کام

ہے خدنگِ تیر تیرا یا ہوا پر ہے عقاب
دمبدم دے ہے قضا کا اُڑکے اعدا کو پیام

گر عدو سد سکندر کو کرے چار آئینہ
آگے تیری تیغ کے وصلی ہے پر کاغذ ہے خام

تیرے صفدا کا اندازی پہ تیر انداز فکر
مطلع برجستہ کو ہے لکھکے دیتا انتظام

بر سر پرواز ہوں جب تیرے شہباز سہام
جوشن جسم عدو میں ہووے دم محبوس دام

دست دہقاں میں فلاخن شعلۂ جوالہ ہو
لیں تڑے برق غضب کا کشت اعدا پر جو نام

گر سحاب قہر تیرا ہو نگرگ افشاں تو ہو
حال اہل قاف وہ اے خسرو عالی مقام

وادی بطحا میں جیسے بر سر اصحاب فیل
معجز طیراً ابابیل آیا وقت انہزام

جنبش خامہ سے میرے سرد ہو برق جہاں
گر کروں شاہا رقم وصف سمند تیز گام

نرگ تازی میں پڑی تھی اُسکی شوخی پر نظر
ابلق چشم بتاں کی ہوگئی ترکی تمام

صفحۂ غبرا پہ کھائے نقطۂ رمال شک
دیکھے نقش سم جو اُسکا جلوہ گر وقت خرام

سرعت طی منازل کا لکھوں گر اُسکے وصف
حال مستقبل کا داخل فعل ماضی میں ہو نام

عرصۂ چوگاں میں جب اسکو بوقت معرکہ
لائے جولانی میں دیکر جنبش دست لگام

گاہ سرپٹ گاہ اوڑاں اور گاہ میٹھا پوئیہ
گاہ دُلکی ایبیہ اور گاہ جائے شاہ گام

اور اشارہ ہو اگر اس قاف سے اُس قاف پر
اسطرح اُڑ جاے جوں مرغ نظر بالائے بام

فیل کو تیرے شب یلدا تو کہتا ہے جہاں
پر جو ہے نقش قدم اُسکا وہی ماہ تمام

یا سیہ خیمہ ہے لیلی کا وہ یا ہے تھم گئی
جان قیس تفتہ دل بنکر دھواں شکل غمام

حلقۂ زلف بتاں کب کھائے ہیں یوں پیچ و تاب
جب اُٹھا خرطوم کو اپنے کرے ہے وہ سلام

منزل توصیف کو کیونکر تری طے کر سکے
دم کہاں پیک خرد میں یہ خیال اسنا ہے خام

تہنیت کو ہے عاپر ذوق کرتا مختصر
ہو مبارک تجھکو با عیش و طرب عید صیام

جو کہ ہوں بدخواہ وہ ناشاد اور غمگین رہیں
اور رہو اخواہوں کے دل ہو ویں ہمیشہ شاد کام

قصیدہ نمبر (۵)

افسوس کہ نظر ثانی سے محروم رہا ✤

صبحدم فکر جو تھا سیر فلک کا مشتاق
عرش پر اُڑ گیا ایک آن میں مانند براق

چمک اُس برق جہاں کی ہو بیاں کیا کہ اگر
افق طبع پہ کھلائے فروغ اشراق

شعلۂ رنگ حنا کر کے اُڑا دیوے ابھی
قفس دل میں جو ہیں بند طیور اشواق

رات مجھکو یہ فلک گرد وہاں لیکے گیا
کہ عقول عقلا کی تھی جہاں طاقت طاق

فلسفی دہر کے جو جو تھے ہوئے مشائیں
نور اشراق سے تھے ہوگئے سب اہل رواق

تھے سعادت سے جو سب برج فلک مالا مال
بخت و دولت سے یہ پیر تھا قمر ثاق

تھی تعجب کی نہ جا بار جلالت سے ہو گر
حرکت چرخ گرانبار کی قطبین پہ شاق

انجم ثابت و سیار سعادت سے بہم
یوں نظر آئے کہ جوں دست و بغل اہل وفاق

نجم ناہید لقب جسکا ہے قاص فلک
تھا چپ و راست پہ آہنگ ہے وہ عشاق

بدر تھا پل میں قمر پل میں نظر آتا ہلال
خدمت دائرہ داری میں تھا ہر رنگ سے طاق

اسکا طنبور جو دیتا تھا سُروں کو بہتات
جرم خورشید سے ہوتی تھیں شعاعیں اشراق

نیر گردوں کا خوشی سے تھا جو دل لہراتا
دیکھے ترتیب خریا کو باقسام ایاق

جلتر نگ ایسی بجاتا تھا کہ سب وجد میں تھے
لعبتان فلکی صورت اہل اذواق

نظر آجاتا تھا گر اختر مدار کوئی
دیتا میخ دم تیغ سے اُسکو الحاق

ہاتھ پھر مار کے چو رنگ کا اک پھرتی سے
دم میں تھا اپنے طپنچہ پہ چڑھاتا چقماق

جو چلا پارۂ تن اسکا سوئے عالم خاک
یہ اڑا اسپہ تڑاقا وہ اڑا اسپہ تڑاق

سعد اکبر کہ جسے کہتے ہیں قاضیِ فلک — حسن کو عشق سے دیتا تھا بہم ربط و وفاق
ہوتا زاہد بھی تھا آمادہ پئے دامادی — زال دنیا کو جو تھا بیٹھ رہا دیکے طلاق
چرخ ہفتم پہ فلک ہے تو بطی الحرکت — عالم خاک میں ہے تک و دو کا مشتاق
نفخ تفریح سے پر باد ہے گردوں کا شکم — لیکن اسوقت میں نفخہ بہت اسکو ہے شاق
ہے جو ہر کوچہ میں آرائش نوبت خانہ — خالی آواز دمامہ سے نہو کوئی رواق
یوں جو آراستہ افلاک پہ ہو بزم طرب — گلشن عیش و طرب کیونکر نہو بزم آفاق
آج وہ روز ہمایوں ہے جسے کہتے ہیں عید — بذلہ سنجی میں شگفتہ ہے دل اہل مذاق
بزم خسرو میں چل اے بار بد بزم سخن — سب یہ کہتے ہیں کہ تو نکتہ سرائی میں ہے طاق
تیرا قانون ترے پاس خط مسطر ہے — پھیرے زابل و نیریز و خراسان و عراق
تیرے نغمے ترے مضموں ہیں شہنشاہ تکلم — دمکشی پر ہے سرمست کمر بستہ و چاق
زمزمے مدح کے لکھ اسکی جسے کہتے ہیں سب — نائب ختم رسل فضل خدائے خلاق
کون وہ یعنے شہنشاہ محمد اکبر — دست بخشش سے خجل جسکے ہے بحر آفاق
طبع وقاد کی کرامت کی رقم ہو توصیف — مہر اختر کا ہو اور ماہ سے آئے مہراق
تیز جاہ سے خورشید ہلال آسا ہے — کاہش رشک سے رکھتا ہو اسد قاق
عطر سے شیشہ افلاک ہو دم میں لبریز — جو دے گر نغمہ سا اس کی نسیم اخلاق
خسرو رات کو تھا منزل دل میں میرے — کاروان شہر سمرقند کا رکھتا اتراق
انکے خرمینوں سے چن چن کے میں لایا ہوں متاع — مدح حاضر کیلئے ترے بہ صد استغراق

تو ہے وہ نسل خواقین بہ تتار آفاق — جس نے توراں سے کیا ہند میں آکر قشلاق

گر تیرا مہر طبیعت ہو بہ جوزائے غضب
زمہریر از پے آرام جہاں ہو ییلاق[1]

گر نہ دے حکم تو پھر ابر کے سینہ میں کبھی
رحمتِ عام نہ ہو مایۂ ہمراق

تر زبان وصف میں سب ہیں ترے طفلانِ نبات
دایۂ غیب سے پلوا تا ہے شیر اشفاق

تیرے شیلان[2] کرم پر ہے زمانہ مہماں
مہ و انجم سے فلک پر ہیں مہیا اطباق

گر سبق لیں نہ تیرے فلسفہ حکمت سے
اہل یوناں پہ نہ ہو وے حکما کا اطلاق

ہوں نظر سے کبھی باہر غوامض کے طیور
تیرے شہباز فراست کا ہے یہ استحقاق

ورک امراض کریں جبکہ انامل تیرے
نبض آسا متحرک ہو رگ سنگ ساق

دیکھکر نجم سعادت کا تیرے حسن طلوع
مادر شب پسر مہ کو کرے شرم سے عاق

تو جو محراب عبادت میں رکھے سر بہ سجود
طاق مسجد میں جھکے آکے سر ہفتم طاق

پاس دیں تیرا جو زنار کی چاہے تبدیل
دوش گردوں پہ خط منطقہ ہو خط نطاق

ہو گیا تیغ سیہ تاب[3] ترے آگے حسود
دم نہ مارے گا ترے آگے حسود بقباق

رعب شمشیر ترا یوں ہو سپہر سے وہ چند
جیسے نقطہ سے کریں ایک کو دس اہل سیاق

ہو ترے فیض تکلم سے شفا عام تو ہو ۔
زہر کی جا دہن مار میں پیدا تریاق +

عدل نے تیرے شہا دفع یہ کی خونریزی
فصد کی نسخ اطبا نے پئے رفع خناق

اللہ اللہ ترے لشکر کا ترے خیل و حشم
ہم عدد جس سے نہ اذیک ہو نہ ہمسر قلماق

تیرے دربار جلالت کے جو ہیں نیر غضب
کہکشاں کو ہیں سروش لئے مثل چماق

اور ایک مطلع دل کش نے طبیعت سے مری
ہے ترے عدل کی تعریف میں پایا الصاق

---

[1] حاشیہ متعلقہ صفحہ ۳۱۵ قشلاق ۔ گرم ملک جہاں سرد پہاڑ ہیں کہ گرمی کے دن بسر کریں ۱۲
[2] ییلاق ۔ سرد ملک جہاں گرمی دنوں میں آرام کریں ۱۲ [3] شیلان دسترخوان ۱۲

اُٹھ گیا مدرسہ سے یہ شر و شقاق
زید سے عمر کے دل میں نہیں باقی ہے نفاق

چرخ کے گنبدِ بے در میں رہینگے محبوس
دم نہ مارینگے مگر گونج کے شور و شلتاق

گر لکھوں وصف ترے اسپ جہانگرد کا میں
دے فلک اڑنے پے پامال قلم ہفت اوراق

تن میں اسطرح سے ہے اسکے پھڑکتی شوخی
قفسِ تن میں ہو جوں طائرِ جانِ عشاق

ماہی زیرِ زمیں لوٹ کے ہو جائے کباب
جھاڑے گر سنگ پہ وہ نعل سے اپنے چقماق

وقت کو باندہ کے فتراک میں راکب اسکا
چرخ پر اڑے کھینچا کرے مانند نطاق

اُس فلک سیر کو گلگشت میں گر تو شاہا
جودتِ طبع کی جنبش کا چھوا دے مطراق

یوں اُڑے سو فلک جیسے بہ تفریحِ مشام
بوئے گل جائے تنفس میں دمِ استنشاق

کیا لکھوں وصف ترے فیلِ فلک پیکر کا
کہ گرانباری ہے اُسکی تنِ البرز پہ شاق

عرصۂ مطبخِ عالی میں رہا نعمت خواں
صفتہ الطعمہ پر خام رہا جوں بسُلق +

ہیں ستارونکی بھی آنکھیں انہی ہاتھونکو لگیں
نورِ ہمت کا زمانہ میں جو ہے عام انفاق

برسرِ دشمنِ بدکیش بہنگامِ وغا +
گر تشوں ہووے جلو ریز بہ دشتِ قبچاق

تو عجب کیا ہے کہ اُس کشورِ برفانی میں
شعلۂ تیغِ شرر بار ہو برقِ حراق

دل مرا ہو گیا اس وقت ہے وہ عالمِ نور
جس کی مشرق سے کریں نورِ معانی اشراق

کردِ عا صدق ارادے سے کہ ہے وقتِ دعا
کیوں خموشی پہ کیا ذوقِ زباں کو مشاق

دوشِ گردوں پہ ہوا فرغلِ سنجابِ غمام
سبزۂ تا خاکپہ ہو پیرہنِ استبراق

دخترِ رز کو بہ سرمحفلِ اہلِ تقوے
جبتلک سینۂ مینا میں رہے دردِ فواق

تجھکو آفاق میں ہووے نہ رضواں بھی مہ عید
ہوتے رویت دیدار پہ عیدِ آفاق

اور ترے نیرِ اقبال کے آگے دشمن — یوں رہے جیسے کہ ہو ماہ بایام محاق

صفحۂ دہر سے پھر گردشِ افلاک اسے
حرفِ باطل کی طرح دیوے جہاں سے ازہاق

قصیدہ نمبر (۶)

اس قصیدہ پر بھی نظر ثانی نہیں ہوئی۔ اکبر شاہ مرحوم کی مدح میں ہے۔

گردش میں چشمِ مست کی ہو دل مرا گرہ — اور کھولے ہائے دانہ کی یوں آسیا گرہ
سینہ میں دل اگر نہ گرہ تھا تو کس لئے — ہر اشک میری آنکھ سے ہو کر گرا گرہ
اپنا دلِ گرفتہ چمن میں نہ وا ہوا — غنچہ ہزار جا پہ کھلا اور ہوا گرہ
چلتا نہیں ہے پنجۂ مژگاں کا کچھ عمل — ہے ایسی چشمِ تر سے بہم آشنا گرہ
قمری ہے لائقِ چاکِ گریباں چمن میں آہ — اے سرو گل سے دے سرِ بندِ قبا گرہ
ہوں وہ گرفتہ دل کہ مژہ پر ہجومِ اشک — ہوتا ہے شکلِ خوشۂ انگور آ گرہ
میں مجمرِ فنا میں ہوں کیا دانۂ سپند ؟ — کھولے ہے کاربستہ کی میری صدا گرہ
تصویرِ غنچہ ہوں چمنِ روزگار میں — وا کر سکے گی میری بھلا کیا صبا گرہ
مرقد پہ میرے طرۂ شمشاد کی طرح — پھوٹے گی نخل شمع میں بھی جا بجا گرہ
آیا ہوں میں سرشت میں لیکر گرفتگی — ہو وینگے استخواں بہ گلوئے ہما گرہ
رہویگا شکلِ دستِ حنا بستہ حشر تک — قاتل کے دست و دل میں مرا خوں بہا گرہ
گر میں گرفتہ دل ہوں۔ تو جوں دانۂ انار — محفل میں ہو گا خندہ دنداں نما گرہ
میں عکسِ اپنا دوں تو ہو جوہر سے آئینہ — جوں دامِ موج و شکلِ خطِ بوریا گرہ

عکس دل فسردہ سے مینائے بزم مے
رہ جائے شکل دانۂ انگور کھا گرہ

یہ زہر غم چڑھا ہے کہ سبزہ بزیر زلف
سوجھے ہے یوں کہ زہر کی تھا یہ بلا گرہ

ہیں دل گرفتہ آہ اگر کارواں میں ہوں
حیرت سے اینٹھ کر ہو زبان درا گرہ

رویا میں شکل شیشہ کبھی کھول کر نہ دل
میرے گلو میں گریہ ہمیشہ رہا گرہ

دل بستگی کا اپنے قلمبند کر کے حال
بازو پہ مرغ دل کے اگر دوں لگا گرہ

کھائیں کبوتران گرہ باز کی طرح
سینے سے آنکر سر دوش ہوا گرہ

وہ دل گرفتہ ہوں کہ اگر نکلے پاس سے
جوں غنچہ ہو رہوں بہ جبین صبا گرہ

پھیلاؤں گر شمیم مضامیں کو ہند میں
ہووے ختن میں نافہ مشک خطا گرہ

رجعت سے نجم بد کی مری ماہی سپہر
خرچنگ بنکے بیٹھ رہے ایکجا گرہ

پیدا ہوں سو گرہ اگر ایک دل سے کھونے
جوں کوکنار لالہ و تخم حنا گرہ

گنتا نا مہر و مہ کا ہے کہتا کہ دیکھیو!
قینچی کی طرح کرتے ہے چرخ دوتا گرہ

آہیں تو کھینچیں سینۂ صد چاک سے بہت
کھلنی تھی میرے دل کی مگر کیا بھلا گرہ

سوزن کا رشتہ بنکے کھچا خبتری میں آہ
ہے زیر پائے رشتہ بیاد سرا گرہ

قطروں سے خون دل کے ہوں سو سو گرہ عیاں
ایک آبلے نے دل کے جو کھولوں ذرا گرہ

یہ عقدہ مثل ابروے خوبان کینہ جو +
ہے ڈالتا بہ ناخن عقدہ کشا گرہ

رمال قرعہ ڈالے جو اس عقدہ پر تو ہو
انگلی سے پوری پوری میں اسکی جدا گرہ

ہر قطرۂ سرشک مرے روے زرد پر
خاطر گرفتگی سے ہے جوں کہربا گرہ

یار پہ شانہ پاؤں کہاں میں جنوں سے آہ
دے کھول شکل عقدۂ زلف دوتا گرہ

وابستہ تار موے میاں سے ہوں شکل ناف
چشم کشاد کار رکھے مجھ سے کیا گرہ

نقطہ کی طرح مرکز گردش رہا سدا
میں تھا مگر بہ دائرہ دیر پا گرہ

دل تھا گرہ خیال میں جو آکے عقل نے
یوں کھولدی بہ ناخن فکر رسا گرہ

اُس آفتاب پر تو نظر کر کہ جوں نگرگ
پل بھر میں ایک ماہ کی ہے کھولتا گرہ

وہ کون یعنے اکبر ثانی کہ جس نے وا
تیرے بھی کام دل سے ہے کی بارہا گرہ

گل کی گرہ بہار کرے گر صبا سے وا
وہ کھولدے دلونکی بہ فضل خدا گرہ

لایا ہوں بہر نذر میں وہ دُرِ آب دار
ہو جس کو دیکھ آبِ دُر بے بہا گرہ

جوں برق لکھ کے مطلع برجستہ خامہ نے
مطلع سے آفتاب کے دی ہے لگا گرہ

ہر طلعتوں میں حسن سے کی تو نے وا گرہ
کیوں میرے دل میں خال سویدا رہا گرہ

کھلجائے نام پاک سے ایک آن میں ابھی
گر ہو وے کوہ مروہ و کوہ صفا گرہ

ہیبت سے تیرے نطق کے تبخالہ بنکے ہے
دعوے کے لب پہ آ سخن مدعا گرہ

چاہے جو اسکو آب فصاحت کرے رواں
لکنت وہیں زبان پہ دیوے لگا گرہ

تیرے سحاب جود سے گلشن میں صبحدم
لے مشتِ زر رہے غنچۂ گل باندھتا گرہ

گر دل خنک کی جان فروبستہ کھچکے ہو
ماہین کوہ قاف میان شتا گرہ

تو ناخنِ نگاہ سے مانند آفتاب
دے کھول دم میں دیکھکے یہ ماجرا گرہ

کھولے ہیں کار بستۂ عالم سے دانہ وار
تیری ہوائے لطف و سحاب عطا گرہ

دست گرہ کشا نے ہے باقی کہاں رکھی
جز تکمہ ہائے پیرہن اغنیا گرہ

البتہ دل میں غنچۂ پیکاں کے ہے ترے
جانب سے حاسدوں کے صباح و مسا گرہ

یا جو تری کمانِ نگاریں میں ہے نمود
وہ ابروئے نگار پہ ہے خوشنما گرہ

ایکدم میں تیرے ناخنِ شمشیر سے ہوا
ہیں سر جو حاسدوں کے بروزِ دغا گرہ

تیرے فروغِ تیغ حشمت سے کیا عجب
گر مہر ہو سٹکے بہ شکلِ سُہا گرہ

اللہ رے تیری قوتِ بازو کہ مثلِ گوے
چوگاں کے آگے کوہ کو ہے جانتا گرہ

تو چاہے گر تو دامنِ ساحل میں بحر کو
دو نوطرف سے کھینچ کے دیوے لگا گرہ

پنجہ سے تیرے مہر کے گردوں پہ ہر سحر
کھل جاتی ہیں ستاروں کی لاانتہا گرہ

منقار ماکیاں کی طرح ناخنِ ہلال
ہے بیضۂ فلک کی سدا کھولتا گرہ

لائے جو شعلہ حرفِ شرارت زباں پر
تاثیر عدل سے ہو تری لب پہ آگرہ

اللہ رے بیم عدل کہ خونِ زمانہ میں
دشنہ بھی رکھے کرکے جبیں پر ابا گرہ

زلفوں کے دام جیسے حسینانِ نازنیں
ڈالیتے دیکے بسوئے قفا گرہ

مارِ سیہ کے سر میں اسی طرح زہر مار
ہو دیگا مثلِ مہرۂ مار ایجا گرہ

انجم سے تیری سالگرہ کے لئے فلک
ہر سال کہکشاں میں ہے دیتا لگا گرہ

توسن ترا زمیں پہ جو کاوے کا ڈالے نقش
سمجھیں کہ بیٹھا مار کے ہے اژدہا گرہ

جولاں پہ اپنے آئے تو جوں جنبشِ صبا
غنچوں کی کھولے باغ میں وہ بادپا گرہ

دامانِ ابر تر پہ وہ پاتا ہے برق نام
اُسکا شرار نعل جو دے ہے اُڑا گرہ

گر اُسکی گردِ سُم سے بمیدان کارزار
ہو گرد باد دامنِ صحرا میں کھا گرہ

لائے اُڑا کے تو اسے از شرق تا غرب
کھلنے نپائے یہاں بہ جبین ہوا گرہ

رفعت پہ تیرے فیل کی طبع سانے رات
پھینکا کمند وہم کو جو کرکے وا گرہ

آیا نظر کہ صفحۂ چشمِ زمانہ میں
ایک نقطہ مشک ناب کا ہے ہوہا گرہ

ہے بسکہ رکھتا عقدہ کشائی کا دل میں شوق
دیکھا جو نیشکر میں کہیں جا بجا گرہ

ق

کرتا ہے آشنا اُسے نداں سے وہ فقط
اسواسطے کہ اُسکی بھی ہو دل کی وا گرہ

سلکِ دُرِ سخن میں وہ لا صبح تا بہ شام
جوں سبحہ دیگا بیٹھا ہوا تا بجا گرہ

وا کر لبِ سوال بدرگاہ ذوالجلال
تا رہ نجاے سینہ میں دل کی دعا گرہ

غلطاں بزیرِ گنبدِ گردوں ہوا کرے
بن بن کے تا زمانہ کی صبح و مسا گرہ

تا چرخ واژگوں پہ سرِ شاخ کہکشاں
ہو خوشہ وار عقد ثریا سدا گرہ

میداں ہو تا سپہر کا اور گوے ماہ و مہر
اور دور مہ سے ہو ذنب و راس تا گرہ

تا دل گرفتگی سے زمانہ کی بزم میں
ہر دم گلوے شیشہ میں ہو قہقہا گرہ

حبِ نبات کو پئے دردِ مریضِ عشق
تا دیں بخالِ لب بُتِ شیریں ادا گرہ

جبتک شمیم کاکلِ پیچاں کے رشک سے
نافہ میں ہووے مشکِ ختن بے خطا گرہ

ہر سال تجھکو جشن مبارک ہو خسروا
اور مشکلاتِ خلق کی ہوں اُس سے وا گرہ

پر تیرے مدعی کی نہ وا ہووے جوں حباب
ہرگز محیطِ دہر میں غیر از فنا گرہ

قصیدہ نمبر (۷)

اس قصیدہ پر بھی نظر ثانی نہیں ہوئی۔ اکبر شاہ مرحوم کی تعریف میں ہے۔

قلم جو صفحۂ کاغذ پہ ہووے نکتہ نگار
تو اپنے نقش مٹا دیں جہاں کے جادوکار

سخنوروں نے جو باندھے سخن کے ہیں نیرنگ
زباں سے اُسکی ہیں وابستہ اُنکے سب اسرار

سوار توسنِ دستِ رواں پہ ہووے جب
کرے قلمروِ معنی کو دم میں باجگذار

جو شاخِ سدرہ پہ بیٹھا ہو طائرِ مضموں
تو اُڑکے صورِ ضمائر میں کرے یہ اُسکو شکار

زبانِ تیغ نگہ سے لیا فسوں شاید
کہ اسپہ اُٹھکے مضامیں ہیں کرتے جی کو نثار

ہیں دست بستہ کھڑے چاہوں باندھ لوں جسکو
کہ لفظ و معنی و مضمون ہیں بے شمار و قطار

ہے کرتی کام جہاں جاکے اُسکی نوکِ زباں
قلم دبیرِ فلک کا ہے وہاں پڑا بے کار

سخن زباں پہ ہے اور ہے نگاہ دل پہ
کہ سو ہیں دل تو ہر ایک کی ہے اپنی اپنی بہار

سخن شناس نہیں دیکھکر یہ کہتے ہیں
کہ جو گہر ہے وہی اس میں ہے درِ شہوار

کروں میں اُسکو مگر کیا کہ مشتری نر ہے
متاعِ بخت کو بیچوں جو میں تو کس بازار

شرابِ دَرد سے دل ہوگیا ہے مست ایسا
کہ شام روز جز اک نہ جسکا اُترے خمار

بنائے ناوکِ تقدیر خاک تو وہ جسے
بچا سکے اُسے کیا خاک بلبلے کا حصار

ہزار درد اسے بیدردی زمانہ دکھائے
زباں پہ لایا نہ لائے گا شکوہ یہ زنہار

ق

میں لایا سینہ میں تھا دل کی جا پہ آئینہ
کہ اہلِ دل اسے سمجھینگے مطلع الانوار

سو اُسکو توڑا ہے لوگوں نے سنگ بار اس سے
میں کہتا تھا کہ گہر بار ہونگے یا گلبار

صفا کا اُسکے ایک ادنےٰ سا وصف دیکھو
غبارِ غیر کی خاطر میں ہو تو اسپہ ہے بار

میں آبگینہ کے آگے ہوں آپ شرمندہ
کہ ایک بات سے پڑتے ہیں بال اس میں ہزار

مگر تردّدِ ایام کیوں کروں اے چرخ
نہیں رہا تری گردش سے کچھ مجھے سروکار

لے آیا حسنِ مقدّر اُس آستاں پہ مجھے
کہ سجدہ کرتے ہیں جھک جھک کے جبہسا ئیل و نہار

سحابِ جود سے اُس کے زمانہ ہے گلشن
نہال ابرِ کرم اُس کے ہیں صغار و کبار

یہ سُنکے مجھ سے کہا طبع نے کہ اے ناداں
کچھ اُس کے نام کی تصریح بھی تو ہے درکار

ہے اُسکے نام کا لینا بھی یوں تو بے ادبی
کہ چشمہ پاس نہ دریا نہ ابر دریا بار

سو میں زباں کو گیا لیکے دل کے دریا میں
مذاقِ آب گہر میں ملا لیا کئی بار

اور اُسکے بعد ہوں کہتا کہ نام پاک ہے وہ
جسے نمازوں میں لیتے ہیں سب پکار پکار

خدا کا سایہ ہے۔ اور نائب رسول خدا
محمد اکبر عالم نواز و عرش وقار

ملک صفات و فرشتہ سیر ولی خصلت
بدیں پناہ و بدیں دولت و بہ رخ انوار

خدا شناس و طریقت نما۔ حقیقت بیں
بدست جود ہے دریا۔ بہ تمکنت کہسار

نہ حق وصف ہو اُسکا ادا کبھی لب سے
زباں بہر سر مو آکے گر کرے گفتار

ہوا ہوں لیکے میں حاضر یہ تہنیت کے پھول
کہ اَور پاس نہ رکھتا تھا کچھ برائے نثار

شہا! ہے آج اُسی شاہزادہ کی شادی
جہانمیں جو ہے جہانگیر شاہ نیک اطوار

وہ شاہزادہ ہے پرہا بھی سے شاہ نشاں
وہ شاہزادہ جواں ہے ولے کہن کردار

پڑھوں حضور میں ایک مطلع دعائیہ
قبول جس سے دعائیں ہوں بر سر دربار

شہا خدا سے یہی ہے میری دعا ہر بار
کہ شادیاں ہوں شبستاں میں تیرے لیل و نہار

شکوہ شادئ شہزادہ کس زباں سے کہوں
کہ جوں شگاف قلم بند ہیں لب اظہار

(یہاں سے چند شعر پڑھے نہیں گئے)

جو لکھنے بیٹھا میں ساچق کا وصف رایش
تو نکلا خامہ سے جو حرف تھا خط گلزار

یکایک اُتریں پرستاں سے آنکر پریاں
ہوئیں جو تخت ہوائی پہ ناچنے کو سوار

ہجوم عیش و طرب سے تعدز میں پہ ہوا
دبیر چرخ سے بھی ہو سکا نہ اُسکا شمار

یہ لعبتان فلک پر ہوا خوشی کا جوش
سہاگ گانے لگی زہرہ بن کے موسیقار

(یہاں سے کئی سطریں پڑھی نہ گئیں۔ اگے چند شعر متفرق انشبازی کے ہیں)

شب برات کی وہ روشنی کہ صل علے
ہو روز عید اگر آئے سامنے شب تار

جو مٹیوں پہ ہوئی روشنی تو شور اُٹھا
فلک نے کھینچی زمیں پر ستاروں کی دیوار

دیا ہے لایا ارسطو طلسم یونان سے
کھلایا سدِ سکندر میں چین کا گلزار

لگے ستاروں کو جب آگ دینے آتش باز
تو بولے اہلِ نظر دیکھنا ہے طرفہ بہار

یہ دینگے آگ کا دانہ جب اپنے موروں کو
تو آکے ہو دینگے طاؤس خلد انپہ نثار

جب اکطرف کو لگی جگمگانے چادرِ گنج
زمیں پہ سب کو نظر آئی آسماں کی بہار

ہمارے کانونکے پردے تو اُڑ گئے اُسدم
پٹاخے کرنے لگے چھٹکے جب بہم ٹکرا ر

پکارے سب کہ قواعد ہے فوج میں شاید
کہ فیر اُڑ رہے ہر صف میں ہیں قطار قطار

عجب تماشا ہوا پتلیوں کو جب دی آگ
کہ ناچنے لگے مل کر ثوابت و سیار +

ہوائی کہتی تھی جا کر شہابِ ثاقب سے
کہ تو زیادہ ہے یا میں فزوں ہوں آتشبار

ہیں برطور سے بسے زمیں پہ نور کے پھول
زمیں تو تودۂ گل ہیگی آسماں گلبار

کئی شعر اور پڑھے نہ گئے

اب اس دُعا پہ قصیدہ کو ختم کرتا ہے ذوق
کہ دوست تیرے سرافراز اور عدو ہوں خوار

پر اس ہوس کی ابھی چھٹ رہی ہے مہتابی
قلم میں سال عروسی کا پھول دیوے بہار

اسی خیال میں تھا دیکھتا خدا کی طرف
کہ خموشی فکرت نے دا لب گفتار

کہو سرِ لب بستہ سے شادی فرزند
مبارک آپ کو ہو اے شہِ سپہر وقار

۲۴۳۰	جو ہو وہیں اُسکے ہوا خواہ وہ رہیں سرسبز ہوا اُسکے دشمن بدکیش خالدًا فی النار	۱۱۹۳ ۳۲ ۱۱۲۵

قصیدہ نمبر (۸)

اکبر شاہ مرحوم کی مدح ہے عالم شباب کا کلام اور نظر ثانی سے محروم ہے۔

افقِ دل پہ مرے عیش و طرب دونو بہم
آج یوں آئے مسیحا جیسے دو پیکر نوام

ایک کا ایک سے وہ ربطِ سخن تھا گویا
دو لبِ یار ہیں با حضرتِ عیسےٰ ہمدم

روشن ناز پہ ہمدوش تھے یوں جیسے کبھی
لام الف لکھتا تھا اسلام کا یاقوت رقم

یا تھے دو مصرع مربوط بہم دست و بغل
یا کہ پیوند تھے دو نخل گلستانِ ارم

ملکے دو تار نظر ایک ہوئے تھے دونو +
یا وہ اک بینی کے دو پرزے تھے باہم ہمدم

دونو پیچیدہ بہم ایسے سیہ مستی میں
کوئی مشاطہ بھی یوں گوندھے نہ جعدِ پرخم

ایک معنی کے وہ لفظ مترادف تھے دو
ایک مضمون کے دو فقرے تھے مگر مستحکم

تھے جڑے دو دُرِ شہوار کہ ہرگز نہ ملیں
ابرِ نیساں سے گریں لاکھ اگر قطرہ یم

ایسے تھے دونو وہ یکدل کہ دو قالب یکجاں
یک زباں دونو وہ اسطرح کہ جوں چاک قلم

آئے لپٹے ہوئے یوں عالمِ سرشاری میں
نالۂ زیر کی ہمراہ ہو جوں نالۂ بم

میں نے پوچھا جو سبب اُن کے بہم ہونیکا
تو یہ تالف نے کہا غیب سے ہو کر ملہم

کیوں معمون کے دلِ تنگ میں معنی ہوں بہ تنگ
جب سے معلوم تو بھر بات ہے کیوں مبہم

آج اُس شاہ کے فرزند کی ہے شادی طوئے
کہ شجاعت میں وہ رستم ہے سخا میں حاتم

کون وہ ظلِ خدا ۔ شاہ محمد اکبر
جس کی ہمت سے ہوں دریوزہ گر ارباب ہمم

شاہ کا پوچھو جو فرزند تو شہزادہ سلیم
ہو سلامت روی اُسکی بہ سلامت منضم

اس لئے عیش و طرب مثل قران السعدین
متفق ہو کے پئے تہنیت آئے اسدم

یُمنِ اس عقد نے بخشا ہے جہاں کو آئینا
جو گرہ آج لگائیں سو ہے لگتی محکم

آج وہ دن ہے مبارک کہ ابھی لائے ثمر
دو درختوں کو جو پیوند لگائیں باہم

دینا مشکلوں میں ہے پیوند بدیہ الانتاج
یہ مسلّم سمجھے نہ تہذیب نہ جانے سلّم

بزمِ عشرت کی طرف کرتا ہے جو نظّارہ
پڑھتا یہ مطلع رنگیں ہے وہ ہو کر خرّم

ہے اُٹھا عیش کا طوفاں بسرِ ساحلِ یم
زمزمہ موج کا بربط سے ہُوا ہے ہمدم

گٹکری کا سا ہے لچھا بہ گلوئے مینا +
ہچکیاں قلقلِ مینا جو ہے لیتی پیہم

لوگے جس ساز خدا ساز کو آغوش میں آج
تار چھیڑو گے کھرج کا تو سنو گے پنچم

اثر نغمۂ شیریں سے جہاں بھول گیا
کہ سوا راگ کی سم کے ہے کوئی اور بھی سم

جن مزامیر کو ہم سنتے تھے واعظ سے حرام
وجد میں آئیں سنیں آج گر آ ہوئے حرم

تار طنبور بنی آج رگِ سنگِ صفا
بے زباں زمزمہ ساز کہے سوزِ زمزم

نہیں کچھ دور کہ تبدیل ہو کعبہ کا لباس
تا کہ دکھلائی نہ دے صورتِ اہلِ ماتم

دھوم اس شادی کی یہ ہے کہ سُنے دھیمے سُروں
چھا گیا گلشنِ آفاق پہ ہے ابرِ کرم +

رقعۂ شادی کا ہے اس رنگ سے تحریر ہُوا
کہ جوانانِ چمن آئیں جو مل کر باہم

شاخِ گل پہنے کلائی میں کلی کا کنگنا
زرد جوڑے پہ بسنت اپنا دکھائے عالم

عطر دانہیں گل نرگس و بھرے عطرِ سہاگ
سارے گل بھبکنے لگیں بلبل پیتا بگا دم

بل بے تیاری پوشاک کہ چرخِ اطلس
لایا اطلس جو لگائے تو یہاں نکلی کم +

یہ خیاطِ فلک کی جلدی کہ کھلا جاتا ہے +
شکم کرم بریشم ہی میں تار ریشم

یہ چڑھاؤ کی ہے کثرت کہ جڑے ہے ہر صبح
دُگدگی پر گلِ داؤدی کے ہیرے شبنم

اللہ اللہ رے نوشہ ترا عالی رتبہ
جس کی انگلی میں نہا ہیگا سلیماں خاتم

ہوئی نوبت کی یہ نوبت کہ سحر اُسکی ٹکور
گوش افلاک سے بھرتی ہے سوا گوش اصم

فے قلیاں کو بھی گر مُنہ سے لگاتا ہے کوئی
تو وہ بھرتی ہے ہم آوازی شہنائے کا دم

پہنچا طنطنۂ کوس کا گردوں پہ دماغ
کہ نہیں رکھتا سر رہ ئے زمیں اپنا قدم

آتی اسطرح سے پیہم ہے جلاجل کی صدا
کہ پریزاد ہے آتی کوئی کرتی چھم چھم

کہتا ہر دم ہے یہ نقارچی پیر فلک
کہ تھا مدت سے تمامہ میرے پھولا شکم

سارے ارمان نکالوں گا وہ اشا دیمیں
اسکے سینہ سے جو نکلینگے آوازہ بم

چوگھڑے روپے کے اور سونے کی ٹہلیاں اُنمیں
صف بصف دیکھ کے اُنکو یہ پکارا عالم

ہے یہ سلک دُرِ شہوار بگوش بہجت
یا کہ ہنستی ہے خوشی دانت نکالے پیہم

ہر سبو چے پہ یہ جوبن ہے کہ جیسے کوئی شوخ
اپنے اُبھرے ہوئے پستاں پہ چڑھا دے محرم

دیکھ نقلوں کو سبوچوں میں یہ حیران ہے خلق
کہ بھرے موتیوں سے کیونکہ حباب لب یم

ایسے شیریں کہ اگر رکھے زباں پر اُنکو
وصف شیریں سخنی پاسے زبان ابکم

کردں تحریر جو رنگت کو حنا بندی کی
شاخ گل مہدی ہو پھولوں سے ابھی سر اقلم

ہوئے روشن جو کنول شکل رخ آتشناک
تو لٹیں اُنپہ دھوئیں کی ہوئیں زلفیں پرخم

کاغذ زرد کے پھولوں میں یہ گل کرتے تھے
آگیا تھا گل صد برگ کا پھر کر موسم

نخل آرایش اگر دیکھو تو ایسے دلکش
نوجوانان چمن جیسے بصد ناز و تنعم

بیاں کی شب وہ تجمل تھا کہ اللہ اللہ
کہتا تھا دیدۂ انجم سے یہ گردوں ہر دم

سچ کہو کرتے ہو نظارہ جہانکا جب سے
کبھی یہ جلوہ ہے دیکھا تمہیں آنکھوں کی قسم

دیکھے دولہہ کے نہیں دست حنا بستہ ابھی
ورنہ مٹھی کا ابھی غنچہ کے کھل جاتا بھرم

مُنہ پہ نوشاہ کے یوں سہرہ زرتار کی زیب
ہوا شبدیز فلک سیر پہ دولہا جو سوار
وصف میں اُسکے پڑھوں کیونکہ نہ اک مطلع میں
ہے وہ اُس نسل میں جس اصل میں رخش رستم

روئے خورشید پہ جوں خط شعاعی کی جھلم
روز نے صدقہ کیا شب نے اُدھم
تو سنِ طبع نے اب تیز نکالا ہے قلم

رمز راکب سے یہ آگاہ وہ صرصر رفتار
ہے تو وہ حور شمایل۔ نہیں پر زادہ حور
چادریں بھیجتا مہتاب کی ہے بسکہ فلک
نور کے قطرے فلک سے ہیں پہ برسے
سر اُٹھایا یہ ہوائی نے ہے آخر کہ ہُوا
ننھیاں جھومی ہیں اس رنگ سے نافرمانی
ہاتھی لڑتے نہ سمجھنا۔ بلِ عشر نے بزور
نخل پھولا ہُوا دم بھر میں نکل آتا ہے
چھوٹے گھن چکر اس انداز سے کھا کر چکر
پھولیں کیونکر نہ چمک کر گل آتشبازی
جھاڑ آبرک کے نہیں۔ چادر مہتاب میں ہیں
شجر طور کا جوں وادی ایمن میں ہو نور
ہیں جو سرگرمی شادی سے فتیلے روشن
باندھے سو شعلہ فندق بسر ہر انگشت

گذرے گردل میں تو قف تو وہیں بجائے تھم
خوئے آدم ہے ولیکن نہیں نسل آدم
چاہئے اُس کو زمیں پر نہ گلیم نہ گلم
چھوٹے گنج ستاروں کے کہاں ہیں پیہم
شعلہ اس کا علم کاہکشاں کا پرچم
جیسے رکھے ہوں تراشے ہوئے جامِ نیلم
سر کو دو کوہ کے ٹکرایا ہے مانند خم
ہے اناروں میں اچنبھے کا تماشا عالم
چرخ میں آیا جسے دیکھ کے گردون دژم
شاخ تھی گل کی قلم۔ بنگئی شورے کی قلم
جڑ تلک لپٹے ہوئے نخل گلستان ارم
شمع ابرک کے کنول میں ہے دکھاتی عالم
تاب کیا خانۂ گیتی میں رہے سایہ غم
پنج شاخوں کو کسوں میں نہ کبھی ست میں نم

کھولا مصحف تو نے ہے میں کہ سر لوح ورق
اسم اعظم نقاط عیاں خط شعاعی سے رقم

رونمائی پہ لگی رشک سے زہرہ گانے
غیرت از چشم کنم روئے تو دیدن ندہم

ایسی شادی کے تجمل کو لکھے کیا کوئی
دھوم ہے جسکی گئی تا سر ہفتم طارم

جی میں ہے تو سن خامہ کی عناں پھیر کے میں
مدح اک بیت ثانی کروں پھر بے قلم

جسکے باعث سے منور ہے چراغ خورشید
جسکی دولت سے ہے آراستہ بزم عالم

اُسکے میدانی کے نقارہ کی اللہ رے صدا
از عجم تا بہ عرب تا عجم و زعرب تا عجم

جس سے پوچھو تو اگر ہے یہ کہیگا کہ بلے
انت تعرف کہو جس سے وہ کہیگا کہ نعم

مدح میں اُسکی رقم کرتا ہوں ایک تازہ غزل
کہ غزل خواں ہے ہر ایک آج بجان خرم

تو ہے وہ ابر سخا۔ تو ہے وہ دریائے کرم
جس میں ہوں فلس کی جا کیسہ ماہی پہ درم

چارہ گر ہو جو ترا لطف تو پھر کیا ہے عجب
مشک سودہ کرے ہر زخم پہ کار مرہم

پہنچی ہے روح عدو سہم کے ناوک سے ترے
مثل آہوئے رمیدہ سر صحرائے عدم

تیرا خنجر ہے نہنگ ایسا کہ غرق زہراب
تیری شمشیر وہ اژدر ہے کہ ہے آتش دم

حق میں اعدا کے ترا تیر ہے پیغام قضا
اور ترا جو ہر شمشیر قضائے مبرم

توڑے دل شیشہ کا ہرگز نہ ترے عہد میں سنگ
رحم کھاوے کہ لیا اُس نے میرے گھر میں جنم

تیرے انصاف کا پرتو ہے جو عالم پہ محیط
تو نہ پایا ہے نہ پائینگے فروغ اہل ستم

روبرو بچہ آہو کے نہ روشن ہو چراغ
ڈالے روغن کی جگہ اس میں جو پیہ شیر نم

گلشن مدح میں دے تیرے ترا ذوق لگا
خرمن گل کی جگہ تازہ مضامیں کا اُلم

پر یہ سمجھا کہ ہے جز کرتا و الت گل پر
کہکے ایک شمہ تری وصف کا اے نیک شیم

یہ عاکر تا ہے دل سے کہ مبارک ہو تجھے | شادی مصلت فرزند بصد جاہ و حشم

ہوں شبستاں میں ترے دست و بغل عیش و طرب
گھر میں حاسد کے دل آشوب رہیں محنت و غم

قصیدہ نمبر (۹)

یہ قصیدۂ مبارکبادی ولیعہد شاہزادہ کی شادی میں لکھا تھا۔ بندۂ آزاد اُن دنوں طفل مکتب بھی تھا جب حاضر خدمت ہونے لگا تو حضرت مرحوم اکثر اُسکے اشعار پڑھا کرتے تھے ڈھونڈھنے کی فرصت نہ تھی ایکبرس وفات سے پہلے فرمایا۔ کہ اگر تو اُسے درست کرتے کہ طبیعت نے عالم جوانی میں بلند مضامین پیدا کئے تھے خیر اکثر اشعار اور مطالب جیالیمیں ہیں ایک قطعہ لکھدیتے ہیں۔ چنانچہ ۴۴ شعر کا قطعہ لکھا۔ اور عید قربان کی تہنیت میں ابوظفر بہادر شاہ کو سنایا۔ بعد انتقال کے قصیدہ بھی نکلا الحمدللہ کہ یہانتک پہنچا۔ اول قصیدہ لکھتا ہوں۔ پھر قطعہ

دل کہ اس شہر میں ہے گرسنۂ ناز بتاں | نم تیغ اسکو غنیمت ہے کہ دیکھا لب ناں

ہوں وہ لب تشنہ کہ میں دامن دریا سمجھوں | برق پر سوز کا ہاتھ آئے جو طرف داماں

وہ خنک دل ہوں کہ جسکے نفس سرد سے آہ | دم میں یخ بستہ ہو پیشۂ مہرخشاں

میں ہوں وہ شعلۂ جوالہ بزیر گردوں | کہ اگر دل کو قرار آئے تو چکر میں ہو جاں

میں وہ مجنوں جگر تفتہ ہوں جسکے دم فصد | ہر بن مو سے عوض خون کے نکلتا ہے دھواں

چشم سوزن سے نہ لو سلسلہ زنجیر کا تم | دل وحشت زدہ ہے لاغر بے تاب و نواں

ہوں وہ افتادہ کہ ہمت کبھی یاور ہو تو ہو | دستگیر آکے عصا مثرۂ مور چگاں

ہوں وہ تصویر سر صفحۂ عالم جس پر | موقلم دہ تو کرے کار سنان و پیکاں

دل گرفتہ ہوں وہ میں دہر میں مانند انار | ایک گرہ وا ہو تو ہو صد گرہ اندر داماں

ہوں وہ فرسودۂ غم جس کے بچشم پیش
کرتا سرو چمن و ہر ہے کارسوہاں

قطرۂ شبنم کا ہو گل پر تو مری نظروں میں
سنگ حسرت ہو کہ رکھتا ہوں بزیر دنداں

میں ہوں وہ کشت کہ بیگانہ ہے سبزہ جس سے
اور اگر ہے تو ہے آغشتہ زہراب سناں

فلک سبز کے نیچے ہوں میں تلوار کا کھیت
آب شمشیر مجھے دو کہ یہی ہے تری جاں

ہوں وہ خود رفتہ کہ جوں عمر تلف کردۂ مجھے
حشر تک ڈھونڈیں تو ممکن نہیں ہاتھ آئے نشاں

ماہ نخشب کی طرح ہوتا عیاں ہوں سر کوہ
اور ابھی پلپیں جو دیکھو تو عیاں ہوں نہاں

ہوں وہ سرگشتہ کہ گر ساقی و ساغر چاہوں
حلقۂ دور فلاخن ہو بدست دہقاں

اگلستانی روش پر گل بازی ہوں میں
نہ ادھر ہوں نہ اُدھر ہوں نہ وہاں ہوں نہ یہاں

دل نے لیموسے کیا رنگ طلا کا روشن
ترش روئی سے رخ زرد ہے میرا تاباں

میں وہ گردش زدۂ دہر ہوں جسکا پس مرگ
سنگ تعویذ بھی چکر میں ہو مانند فساں

میں وہ ہوں بسمل دل خوش شد جسکے خوں میں
تیغ قاتل روش کشتی دریا ہو رواں

اشک خونیں ہے مرا آتش یاقوت یمن
گرچہ ہوں آب میں لیکن ہوں ہمیشہ سوزاں

دل اڑا جاتا ہے جل جل کے جو بن آگ مرا
طائر رنگ حنا بنکے ہوا ہوں پرّاں

طفل معصوم کا ہے خواب مری موت دریغ
کہ یہی لب مرا خنداں ہے یہی ہے گریاں

وہ سیہ بخت ہوں میں خاک نے جسکی یکسر
ہے سیہ کر دیا آئینۂ چرخ گرداں

میں وہ بیمار ہوں مایوس شفا جسکے لئے
دم عیسےٰ نے کیا کار نفوس ثعباں

اُٹھ سکا سر نہ مرا مزرع گیتی میں ذرا
دل رہا دانۂ روئیدہ تہ سنگ گراں

شرح جانسوز سے مری نئے قلموں کی طرح
کیا عجب نائے قلم سے جو نکل آئے دھواں

دل مایوس یہ تھا کہ رہا مجھ سے کہ خرد
یوں لگے کہنے کہ بیفائدہ کیوں آہ و فغاں

پھر تو کر غور کہ مداح ہے کس شاہ کا تو
دیکھ وہ ابرِ کرم ملزم جود و احساں

وہ شہنشاہ کہ جشن اسکا ہے افلاک کی سیر
ہفتے مہوش ہیں تو کرتے ہیں ستارے رقصاں

ماہ گردوں پہ ہے اور آ کے زمیں پر مہتاب
کثرتِ عیش سے دریا میں ہے شبکور قصاں

سُن کے یہ مژدۂ جاں بخش ہر اک کو یہانتک
شوق نظارہ ہوا عام بہ گلزار جہاں

دیکھتا ہوں کہ شاخِ مژہ کاسۂ چشم
رخ نظارگیاں پر ہے بنا نرگس داں

آج عالم کا ہے دل شاد کہ جو عالم نور
جلوہ گر ہے سراور نگ بصد شوکت و شاں

ماہ فرخندہ لقب شاہ محمد اکبر
تاج شاہانِ زماں فخرِ سلاطینِ جہاں

دیکھا ہے دولت و صولت کا جو اسکے اقبال
دہرِ سرکش کا بھی قد ہو گیا خم مثلِ کماں

مدح حاضر کیلئے حاضر دربار ہو ذوق
تو ہے خاقانی ہند اور وہ ہے خاقانِ زماں

پوچھ لو آج فلک سے کہ ہے خورشید کہاں؟
گر ہے کچھ وزن تو آجائے بسوئے میزاں

تیرے جلوہ کے تجلی نے جو روشن کیا دل
ہو گیا شمع مرے سینہ میں تا رگِ جاں

آستیں اپنی ہلا دے جو ترا دست کرم
ہر شکن سے ہو عیاں لجۂ بحرِ عماں

کیوں نہ ارباب ہم ہوں تری ہمت کے غلام
حق یہی ہے کہ الانسان عبید الاحساں

آگے دریا ترے خود کھولے ہے لبہا سوال
کہوے کس منہ سے کہ پنجہ بھی ہے رکھتا مرجاں

سرخروئی ترے حاسد کو جگر خواری ہے
شیر کے بال سے ہے تیز تر اُسکو رگ پاں

کانپتے ہیں پڑے ہیبت سے پلنگ اور نہنگ
بحر و بر پر ہے تری تیغ کی برّش یکساں

ہے زرہ رکھتی اسی واسطے ماہی نہ آب
پہنے جوشن ہے نیستاں میں ہر ایک شیر ژیاں

تیغ ہندی تو کمر میں ہے پر ایک اک جوہر
رکھتا در زیر نگیں ہے صفحات صفہاں

کوہ پر بیٹھ کے یوں بیٹھے بہ پشتِ ماہی
جیسے ابرو سے تباں ہو تہ آئینہ عیاں

تری خنجر کو ملا شہپرِ قدرت سے ہے زور
مرغ دل سینوں سے جوں زاغ و زغن ہیں پراں

تیر ناوک کو ترے دیکھکے ہے لوٹ رہا
طائرِ قبلہ نما خاک کریگا طیراں

آتشِ قہر کی ہیبت سے تری نارِ سعیر
رکھتی شعلہ سے ہے انگشت بزیر دنداں

گنبدِ چرخ ہوا کلبۂ پر دو دا سے
روح کو سینۂ حاسد میں بجا ہے خفقاں

تیرا فرماں تھا کہ فرماں بر دولت کے سوا
ہووے اِک برگ نہ پیدا بگلستانِ جہاں

ہوئے یہ منکرِ اقبال ترے ناپیدا
کہ چمن میں نہیں اُگتا ہے گل نافرماں

تیرے مہتاب کرم سے جو ہو قلزم قہر
پردۂ نور میں اُبلا ہے تنور طوفاں

عدل نے تیرے کھائے ہیں بہم آتش و آب
آب آئینہ میں روشن ہے رخ برق و شہاں

دل افگار کا ہے سودۂ الماس علاج
سنگ ہے سنگ جراحت بہ سر زخم جہاں

تیری تاثیر محبت نے دیا ہے تریاک
ورنہ تھا زہر دلوں کو خط و خوباں

اُفق صبح کا نور کا لیکر مرہم
رکھتا مہتاب ہے بر سینۂ صد چاک کتاں

سرزنش عہد نے کی تیری یہانتک معدوم
کہ نظر آتا نہیں دشت میں کانٹوں کا نشاں

بے علف ناقۂ لیلی ہے مگر قیس غریب
نہیں دیتا بہ ضیافت سر خارِ مژگاں

خسرو انیری توانائی اقبال سے آج
ناتوانوں کو ہوئی دہر میں تاب تواں

مور کا سلسلۂ نقش قدم گر ہو کہیں
اپنے حلقہ میں جکڑ لیتا ہے صد پیل دماں

آگے جلوہ کے ترے پرتو خورشید ہے گرد
آگے رتبہ کے ترے خاک ہے جرم کیواں

اس تصور میں جو ہے پیش نظر عالم نور
اسکو ایک مطلع منوں میں ہوں کرتا میں بیاں

گر تیری ذات نہ ہو کعبۂ اقبال جہاں
آسماں ہووے نہ پھر پھر کے زمیں کے قرباں

ہوس ناصیہ سائی تری خورشید کو روز
موکشاں لاتی ہے در پر ترے سرگرداں

مہرگاں ہمت عالی کا جو بادل لاوے
ایسے نیساں سے وہ آفاق پہ ہو قطرہ فشاں

جنکی شادابی گوہر کو اگر دیکھے تو دور
طرفۃ العین میں ہو کاہ ربا کا یرقاں

آتش قہر و غضب تیری عیاذاً باللہ
مشتعل ہووے اگر سوئے گلستانِ جہاں

ہے یقیں صورتِ نخل گل آتشبازی
نخل فوارہ بھی پانی میں ہے شعلہ فشاں

ماجرائے خامہ نے شیریں سخنی کا تیری
صوتِ موج میں دریا کے دیا تھا بزباں

سخن و اہل سخن سب سر ساحل تھے کھڑے
دو نو لب اسکے حلاوت سے بہم تھے چسپاں

وصفِ شوخی ترے توسن کا ہو کس طرح رقم
کہ قلم صفحۂ کاغذ پہ ہے جوں برق طپاں

باندھوں کس طرح سے مضمون سواری میں اسے
تڑپ اٹھتا ہے کرے جنبش اگر طبع رواں

قلم و حرف نہیں پیش نظر ہیں اسدم
سر حاسد سے ہے دل کھیلتا گوئے چوگاں

کہوں شائستگی اس بادیہ پیما کی میں کیا
تازیانہ ہے بکار اسکو نہ در کار عناں

نہیں انسان ہے مگر کام میں انساں سے فزوں
پر نہیں۔ پر وہ پری سے ہے یا وہ پرّاں

خسرو اعتر رفتار ہو گر مدنظر
پہلے ہو قاف سے تا قاف سر میداں

جلوہ گر خانہ زیں پر ہو پھر اس شان سے تو
بر سر دوش صبا جیسے شمیم ریحاں

تازیانہ جو لگاوے تو کفل پر اُس کے
اور چمک کر کبھی اُڑ جائے وہ بجلی تہ راں

ابھی کوڑے کی صدا کوہ سے پھر کر نہ چلے
وہ کئی بار پھرے وہاں سے یہاں یہاں سے وہاں

کیا دکھاؤں تجھے ہائی کی بلندی شاہا
آنے کو سوئے نظر جب تو عیاں راچہ بیاں

جھومتا جھامتا آتا ہے درِ دولت پر
کہتے ہیں ساقیِ طنّاز سے یوں بادہ کشاں

سمت قبلہ پہ ہے ابر آیا سر دوش ہوا
خُم پہ خُم آج چلے ۔ جام نہ آئے بیاں

اسکی مستک پہ پسر اور وہ نگار خرطوم
کریں آنکھوں پہ قم قوس قزح کا عنواں

اور اگر یہ نہیں مضموں تو کسی موہوش کی
زلف پر گُل ہے دیا کاکل عنبر افشاں

اسکے دندان نہیں غور سے دیکھا میں نے
کشور زنگ میں آئے ہیں فرنگی پیکاں

کیا لکھوں آگے تیرا وصف کہ مُنہ میں میرے
پاس آداب سے جوں شعلہ زباں ہے لرزاں

ختم کرتا ہے ثنا تیری دعا پر اب ذوق
کہ زباں کو بس اب آگے نہیں یارائے بیاں

تجھکو یہ جشن مبارک ہو بصد جاہ وجلال
عقل ہو پیر تیری بخت رہیں تیرے جواں

جو دعا گو ہیں تیرے اُنکی دعائیں ہوں قبول
صبح جشن طرب افزا میں ہو دایم خنداں

اور بر رنگ شب دیجور تیرے شب بدخواہ
رو سیہ محفل عالم میں ہوں جو ماتمیاں

یہی قطعہ ہے کہ قصیدہ مذکور کی طرح میں وفات سے ایک سال پہلے تحریر فرمایا ۔

خسرو جلوہ ترا وہ طرب افزائے جہاں +
کہ جسے دیکھکے ہو عید بھی قرباں قرباں

حکم دے تو جو شہا واسطے قربانی کے
سعد ذابح بھی کرے ایسا چھُری کو بَراں

گاؤ گردوں نہ فقط خوف سے اُسم کانپے
بلکہ ہو زیر زمیں گاؤ زمیں بھی لرزاں

تو جو ہو حامی اسلام تو بت خانہ میں
بت کرے قصد نماز اور کہے ناقوس اذاں

تیرے جاہ شب و روز ترا جلوہ فروز
مہر تاباں کبھی ظاہر ہے کبھی ہے پنہاں

قطرہ افشاں ہو اگر تیرا سحاب ہمت
لیکے پنجہ میں گہر بحر سے نکلے مرجاں

اور گہر بھی ہو وہ خوش آب جنھیں دیکھکے دُور
طرفۃ العین میں ہو کاہ ربا کا یرقاں

نطق شیریں ترا وہ ہے کہ ثنا میں اُسکے
تر زباں موجۂ دریا ہو اگر ایک زباں

آب دریا میں ہو یہ جوشِ حلاوت پیدا
لب دریا بھی بہم ہو کے ہوں دو نوچپاں

اسقدر تابع فرماں ہے زمانہ تیرا
نہ ہو گلشن میں بھی روئیدہ گل نافرماں

ہو کے سرسبز بہاران کرم سے تیرے
شاخ پر گل چمن دہر میں ہو شاخ کماں

بلکہ حیرت کی نہیں جا کہ سرِ شاخ خدنگ
روش غنچہ گل ہووے شگفتہ پیکاں

وہ ترا زور حمایت ہے کہ جس کے باعث
ناتوانوں کو بھی ہو دہر میں یہ تاب و تواں

ہل سکیں پھر نہ جگہ سے کبھی گرباندھ رکھیں
ایک تا رنگہ مورے سو پیل دماں

دیگ مطبخ پہ ترے یہ فلک پر انجم
کیا عجب صورت سرپوش ہو گر قطرہ فشاں

پیل تیرا گلِ سوسن کا پڑا ہے انبار
گل مہتاب کے گلدستہ ہیں اُسکے دنداں

اسکی خرطوم کسی لبریلی وش کی
جعد مشکیں ہے کہ ہے کاکل عنبر افشاں

لکھوں شوخی جو ترے توسنِ چالاک کی میں
جنبشِ خامہ بھی ہو موج رم برق جہاں

وقت کاویکے دم سیر کرا کب اسکا
سرِ حاسد کو رکھے صورت گوئے چوگاں

دل میں ہیں جوش مضامیں تو نہایت لیکن
دل حوادث سے زمانہ کے ہے بیتاب و تواں

ذوق کرتا ہے ثنا ختم دعا پر تیری
کیا لکھے وہ تیرے اوصاف کہ قاصر ہے بیاں

عید اضحے تجھے ہر سال مبارک ہووے
تجھ پہ ہو سایہ حق اور ترے سایہ میں جہاں

قصیدہ نمبر (۱۰)

جب پہلے پہل ۱۲۴۵ھ ہجری میں سائیں ثناء علیشاہ وارد دہلی ہوئے۔ بیان کیا کہ اورنگ آباد

ہمارے وطن میں یہاں عاشق نہال چشتی ایک بزرگ ہیں اُنکے ہم دیکھنے والے ہیں استاد مرحوم کی خوش اعتقادی نے جبھی ایک قصیدہ لکھا تھا اور تعجب یہ کہ اُنکے پاس مسودہ بھی نہ رہا تھا۔ کوئی کوئی شعر سُنایا کرتے تھے۔ سائمین شاہ علی شاہ اندنوں ایک سید بزرگوار کے گھر میں اُترے تھے۔ خدا کی قدرت۔ ۲۶ برس کے بعد اُس گھر میں کوئی بھی نہ رہا۔ مگر ایک پاکیزہ نفس پاکدامن اہل اللہ۔ بی بی۔ میں کبھی کبھی اُن کی سلام کو جایا کرتا تھا۔ ایکدن اُنہوں نے مجھے ایک بستہ اجزا کا دیا۔ کہ ہمائیں چھوڑ گئے تھے۔ اُن میں دیکھوں تو قصیدہ مذکور ہے جو اُستاد مرحوم نے اورنگ آباد بھیجنے کو اپنے ہاتھ سے لکھا تھا۔ آج اُسکی تحریر کو پورے ساٹھ برس اور کئی مہینے ہوئے ہیچ تو گیا ہے۔ اللہ شہرتِ عام اور بقاے نام نصیب کرے اصل سے نقل ہوتی ہے +

پیشانی پر یہ عبارت لکھی تھی

قصیدہ در مدح زبدۃ العارفین قدوۃ السالکین حضرت سید عاشق نہال چشتی ادام اللہ برکاتہم

ہے ابر دُرفشاں وہ چمن میں کمال کے	عاشق نہال کیوں نہ ہوں عاشق نہال کے
ہیں دیدہ و ستارہ وں میں خورشید و ماہ اگر	روشن ہیں دونو سے اسکے جمال کے
اُسکی نگہ سے گر جگر سنگ پائے رنگ	بھر جائیں پل میں لعل سے دامن سوال کے
ہے بحر اُسکے سامنے کشتی بکف گدا	پھرتا صدف ہے کھولے ہوے لب سوال کے
ہیں اُسکے در کے خاکنشینوں کے دل غنی	خواہاں وہ ملک کے ہیں نہ جویاں ہیں مال کے
دنیا نے خاکساری اُسے دی ہے نذر میں	مٹی خمیر یہ ہے گھر میں کُلال کے
ہوا سکا حکم عام جو بر منع انقطاع	رہ جاے آبِ چوب پہ دنداں نکال کے
دل جس کا اسکے زور حمایت سے ہے قوی	وہ پیرِ زال۔ سمجھے ہیں رستم کے زال کے

ہیبت جو اُسکی وادیِ خس میں کرے ظہور
جا بیٹھے چھپ کے شیر بھی گھر میں غزال کے

اُسکی شمیم خلق معطر کرے جو گل
لے لیکے سونگھیں اہلِ چمن پھول ڈال کے

خوشبو سے اسکی فیض کے ہوتا ہے مشکبو
ہے وہ جو خون جام میں نافِ غزال کے

کیا تاب رات دن میں تغیر ہو بال بھر
وہ لائے گزرنا نہ میں دن اعتدال کے

ہو شکرِ ثنا سے اگر اس کی کامیاب
لب بند ہو ویں طوطیِ شیریں مقال کے

طائر بھی اُس کے ذکر سے ہیں سرخرو ہوئے
نکلے ہے پیر پیر صدا مُنہ سے لال کے

آب گہر میں ہوئے رواں کشتیِ گدا
دستِ کرم سے اُس شہ دریا نوال کے

جی چاہتا ہے ہو کے مخاطب بیاں کروں
اوصاف ایسے شاہ کرامت خصال کے

اے سیّد جلال کے خورشید پر جلال
قربان جائیے ترے جاہ و جلال کے

تو شمع بزم خاص کہ پیدا کیا تجھے
صانع نے اپنے نور کے سانچے میں ڈھال کے

گردوں بھی پست ہو کے ہوا خوب منفعل
رتبہ کو دیکھا جب ترے اوج کمال کے

انجم جنہیں ہیں کہتے منجّم جہاں کے
قطرے جبیں پہ ہیں عرق انفعال کے

اے شاطرِ زمانہ تصدق ہو پیل چرخ
شطرنج عشق میں ترے گھوڑے کی چال کے

دیکھا جو تیرے فیض کو جاری تو رہ گیا
دریا بھی منہ بھنور کے گریباں میں ڈال کے

جسدل پہ تو نگاہ کرے اُس کے سامنے
جامِ جہاں نما ہے برابر سفال کے

ہے گرچہ تو جنوب میں لیکن ترا جمال ق
روشن سوا کمال سے قطب شمال کے

سنتے ہیں جاں نثاروں سے جب ترا ذکر خیر
گویا اذاں کو سنتے ہیں منہ سے بلال کے

سرتا قدم ہیں شوق ترے طالبِ جمال
مشتاق روزہ دار کھڑے ہیں ہلال کے

ساعت بقدر روز ہے اور روز ہفتہ وار
ہر ہفتہ ماہ و ماہ برابر ہے سال کے

بیتاب اسطرح ہیں ترے اشتیاق مند
جیسے طیور تازہ گرفتار جال کے

مرغِ نظر کے ساتھ اُڑا چاہتا ہے دل
مژگاں سے دونو بازوں پہ پرنکال کے

جاتا ہے دوڑ دوڑ کے ہر دم تری طرف
دھوُدھو کے پاؤں لیجئے پیک خیال کے

شاہا یہ تیرا ذوق ہے اُسپ دا لطف
ہو سال پر نگاہ اس آشفتہ حال کے

تا جلد اس کا کوکب طالع پئے عروج
آجائے سمت اوج پہ گھر سے وبال کے

کردے بہار نام سے اپنے اسے نہال
جھوکوں میں آگیا ہے سموم ملال کے

دنیا میں زندگی کرے آرام سے بسر
ایمان اسکے ساتھ ہو وقت انتقال کے

نکلے بر صبح حشر تو رنگ اسکا جون شفق
ہو سرخ دوستی سے محمد کی آل کے

بقلم مصنف عقیدت کیش صداقت اندیش۔ سراپا شوق شیخ ابراہیم ذوق برائے تذر جناب فیضمآب۔ گلشنِ فضل و کمال۔ حضرت سیّد عاشق نہال چشتی بتاریخ چہاردہم جمادی اوّل روز پنجشنبہ سنہ ۱۲۴۵ ہجری قدسی مطابق ۲۴۔ اکبر شاہی بر قلعہ شاہجہان آباد ع گر قبول افتد زہے عزّ و شرف۔

قصیدہ نمبر (۱۱)

در مدح ابو ظفر بہادر شاہ مرحوم

استاد مرحوم جشن کی مبارکباد کے لئے کئی دن سے قصیدہ مرقوم الذیل لکھ رہے تھے بعد شام صاف کرنے بیٹھے کہ صبح دربار میں پڑھینگے چند شعر لکھے تھے۔ جو

مرزا علی عرض بیگی کا آدمی آیا اور کہا مرزا صاحب نے آداب عرض کیا ہے۔ (اور آہستہ سے کہا) اسی وقت بیگم[1] صاحب کا حکم پہنچا ہے۔ کہ کل اُستاد قصیدہ سُنائیں تو دربار میں کوئی ان کے شعروں پر تعریف نکرے۔ آپ کو خیال رہے۔ اُستاد نے کہا بہت خوب۔ میری طرف سے اُنہیں دعا کہنا۔

وہ شخص رخصت ہوا۔ آپ تھوڑی دیر خاموش سوچتے رہے۔ اور ایک دم گرم بھر کر کہا۔ اس بیگم کو کیا ہو گیا ہے؟ خدائی کے مُنہ بند کرتی ہے؟ مَیں جب قصیدہ پڑھونگا تو دیوان خاص کے در و دیوار سے واہ واہ والونگا۔ یہ کہا اور پھر لکھنے لگے۔ رات کے دو بجے تک قصیدہ صاف کر لیا۔

صبح کو دربار میں حاضر ہوئے۔ وقت معین پر ایسا ہوا۔ کہ استاد اپنا قصیدہ عرض کریں۔ اِنہوں نے پڑھنا شروع کیا۔ مگر دیکھتے ہیں کہ تمام دربار دم بخود۔ کئی شعر پڑھ گئے۔ سب صم و بکم۔ جب ایسا تو اس شعر پڑھا۔ تو بادشاہ نے اشارہ کیا آگے آؤ اور آگے آؤ۔ پاس پہنچے تو اشارہ کیا۔ کہ سر جھکاؤ۔ اور ہاتھ پھیلا کر گلے لگا لیا۔ پھر کہا ہوں؟ (یعنے پھر پڑھو) پھر جو پڑھنے لگے تو سب کے دہن بند کھل گئے تھے۔ خوب تعریفیں ہوئیں بیگم نے بھی سُنا۔ کلیجہ مسوس کر رہگئیں۔ ۱۸۴۹ء میں لکھا تھا۔

---

[1] بیگم سے مراد زینت محل بیگم تھیں کہ بادشاہ نے وزارت سلطنت اُن کے نام کر دی تھی۔ اور ان کی طرف سے محبوب خواجہ سرا کُل دربار اور کاروبار کا انتظام کرتا تھا خلیفہ اسمٰعیل کے پاس بعض خدمتیں تھیں۔ وہ بیگم نے لے لی تھیں۔ اس لئے اُسے ہمیشہ خطرہ تھا کہ شاید استاد بیٹے کی سفارش کریں یا میرے برخلاف کچھ کہیں۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ بادشاہ استاد کی بات کا بہت لحاظ کرتے تھے۔ مگر استاد نے نہ پہلے نہ بعد خلیفہ مرحوم کی سفارش میں کچھ نہیں کہا۔ نہ بیگم کی شکایت کی۔ بلکہ حق یہ ہے کہ کسی کی شکایت سے بھی زبان آلودہ نہیں کی۔ اُن کا قول تھا کہ زبان جوہر لطیف ہے اسے پست آلودہ کرنا اچھی بات نہیں ۱۲

پیری میں پر ضرور ہے جام شراب ناب
پائے فروغ صبح نہ بے نور آفتاب

تائب ہو تو اس سے کہ داڑھی ہوئی سفید
کر خوب میکشی کہ یہ ہے سیر یا ہتاب

ہے پر دل خنک کی ہوا پر بقائے عمر
یہ برف وہ نہیں جسے رکھیں نمید سے داب

ہستی کا اپنے کر نہ بھروسا حباب وار
تعمیر بے بنا ہے یہ اور خیمہ بے طناب

آئی ہے جب سے قالب خاکی میں تیری جاں
غافل پئے سفر ہے اسی دن سے پا نزاب

جو دم مزے سے گذرے غنیمت سمجھ کہ روز
گردش ہے آسماں کو زمانہ کو انقلاب

ہر بازی فلک پہ تو نوروز روز کر ۔
رکھ آفتاب گنجفہ پر سال کا حساب

حاصل ہے کیا ہنر سے دلا آئینہ کو دیکھ
جوہر سے دل میں رکھتا ہے کس درجہ پیچ و تاب

گر ہو سکے تو خاک در میکدہ ہو تو
اس خاکداں میں تا نہ ہو مٹی تری خراب

آسودگانِ کنجِ خرابات کے لئے
جانا بہشت تک بھی ہے دوزخ کا اک عذاب

یہانتک ہیں بیدماغ نہ بولینگے منہ سے وہ
دیگا جواب نامہ نکیرین کو جواب

رکھتا ہے چرخ اہل سعادت کو بدمذاق
گذران ہے ہما کی سر روزی کلاب

دیکھے جہان کو دیدۂ عبرت سے تو اگر
جام جہاں نما ہے ہر ایک کاسۂ حباب

ساقی جو تجھکو عین عنایت سے جام دے
لے اور لگا کے آنکھوں سے پی جا اسے شتاب

گر بے حساب جام پہ جام آئیں تیرے ہاتھ
روز حساب تک تو پئے جا علی الحساب

مستی میں ایسا مطلع تازہ کوئی سنا
جامی بھی لکھ دل پہ جسے کر کے انتخاب

گلشن کو دے جو گریۂ مستانہ میرا آب
بیضوں سے بلبلوں کے ہو پیدا طرب شراب

گلگونِ نشۂ مے گلگوں پہ ہو مرا
پابوس آسماں روش حلقۂ رکاب

مستی مری سکھائے اگر جھومنے کی طرز — ٹپکے ہمیشہ ابر سے مستی بجائے آب

بیہوشیوں میں ہیں مری وہ گرم جوشیاں — ہوتے ہیں جس سے طائر ہوش و خرد کباب

جاگ اُٹھیں وہ جو خواب عدم میں ہیں ہوشمند — غفلت میں گر بلند ہو میری صفیر خواب

نہ پردۂ فلک کو اٹھا دوں ایک آن میں — ہو جاؤں میں جو عالم مستی میں بے حجاب

ہو وہ صوابدید فلاطونِ جم نشیں — کہ بیٹھوں گر نشہ میں کوئی حرف ناصواب

یہ ذہن کو ہے عالم مستی میں روشنی — ہر خشت خم ہے مکتبِ اشراق کی کتاب

ہر روز جام بادۂ روشن کا مجھ کو شغل — ہے مثل شغل آئینہ و شغل آفتاب

پرہیز میرا یہ ہے کہ تقوے سے ہے گریز — تقوے ہے میرا یہ کہ ہے توبہ سے اجتناب

لیکن ہے ابرِ رحمت باری سے درفشاں — دامان تر مرا روش دامن سحاب

مداح ہوں میں اُسکا کہ ہے جسکے دور میں — شیب زمانہ کے لئے کیفیت شباب

پیر فلک بنے ہے جوان سیاہ مست — ریش شعاع مہر پہ ہے ابر سے خضاب

مانند ناف آہو اگر جام میں ہو خوں — اُسکی شمیم فیض سے ہو جائے مشکناب

اُس شاہ کے نم کرم و بوے خلق سے — ہر خار بن ہو ہمسر فوارۂ گلاب

وہ بادشاہ جس کا بہا در شہ اسم پاک — ہے درجک زمانہ کا یکتا دُرِ خوش آب

ظل الٰہ خسرو دیندار۔ دیں پناہ — شاہ بلند جاہ۔ و خدیو فلک جناب

تیغ اُسکی وہ طفر رقم و نصرت اثر کہ ہے — گنج نہاں فتح کے مفتاح فتح یاب

روشن دلی سے اسکی عدو تیرہ بخت ہے — دزد سیاہ کار کو آفت ہے ماہتاب

ہو منعِ جانِ کافر نعمت کے واسطے — مطبخ میں اُس کے پشۂ نمرود و خر ذباب

ہے ابر میں بھی برق کا شعلہ مگر نہیں — اُس میں دمِ وغا گرمی عتاب

کج خلقی اسکی طبع رواں میں نہیں ذرا
دریائے موج زن کو نہاروں میں پیچ و تاب

پڑھتا ہوں میں وہ مطلع روشن حضور میں
جسکا نہو وہ مطلع خورشید بھی جواب

شاہا تو وہ ہے نور مجسم کہ آفتاب
کرتا ہے نور کو تیرے سایہ سے اکتساب

تلوار تیری ہے وہ غضب برق کفسوز
ہے جسکی آنچ آتش دوزخ کا التہاب

جو ہے تیری تیغ کے دکھلائے ہے قضا
سرکش کو لکھے حرف بحرف آیت عذاب

اللہ رے پاسداری اسلام و پاس شرع
اللہ رے تری مصلحت اللہ رے احتساب

انگور زخم دل پہ نہ بدخواہ کے بندھے
اس خوف سے کہ ہوتی ہے انگور کی شراب

کیسا ہی مے پرست ہو مانند چشم یار
مقدور کیا کرے قدح مے کا ارتکاب

بلکہ ترے دعا قدح کا بھی سنے نام
بالفرض گر وہی ہو دعاؤں میں مستجاب

شاہا تری حمایت و دولت کے سایہ میں
کنجشک شک باز ہے رشک ہما غراب

کرتا ہے روز شب کو برابر شہنشہا
تعمیل عدل سے تری میزاں میں آفتاب

خورشید شیر چرخ پہ جو کھینچتا ہے تیغ
چاہے ہے شیر جنگ یہ تجھ سے مگر خطاب

کہنے تو تیرے تکلم شیریں کو شہد کیا
یہ شربت خضر ہے شہا وہ قند ذباب

چالاکی ہے وہ توسن چالاک میں ترے
شوخی ہے چشم یار میں عاشق میں اضطراب

کاوے میں یوں وہ جیسے کہ طاؤس وقت رقص
اڑنے میں یوں وہ جیسے کہ پرواز میں عقاب

چمکائے ایک فرا سر میداں جو تو اسے
بے پر ہوا پہ جائے وہ جون ناوک شہاب

کرتا ہے یوں ثنا کو دعا پر تو اختصار
یارب دعا ذوق ہو مقبول و مستجاب

تا عید و عیدگاہ ہو اور خطبہ و نماز
تا خطبہ و نماز سے منظور ہو ثواب

ہر سال تجھکو عید ہو فرخ بعز و جاہ
ناکام ہوں عدو تیرے اور دوست کامیاب

قصیدہ نمبر (۱۲)

در مدح ابو ظفر بہادر شاہ جم جاہ

ساون میں دیا پھر مہ شوال دکھائی
برسات میں عیدائی فرخ کش کی بن آئی

کرتا ہے ہلال ابروے پر خم سے اشارہ
ساقی کو کہ بھر بادہ سے کشتی طلائی

ہے عکس فگن جام بلوریں سے مئے سرخ
کس رنگ سے ہوں ہاتھ نہ میکش کے حنائی

کوندے ہے جو بجلی تو یہ سوجھے ہے نشہ میں
ساقی نے ہے آتش سے مئے تیز اڑائی

یہ جوش ہے باراں کا کہ افلاک کے نیچے
ہووے نہ نمیز کرہ ناری و مائی

پہنچا کمک لشکر باراں سے ہے یہ زور
ہر نالہ کی ہے دشت میں دریا پہ چڑھائی

ہو قلزم عماں پہ لب جو تبسم
تالاب سمندر کو کرے چشم نمائی

ہے کثرت باراں سے ہوئی عام یہ سردی
کافور کی تاثیر گئی جو زمین پائی

سرخی حنا پہنچے ہے عاشق کے جگر تک
معشوق کا گر ہاتھ میں ہے دست حنائی

عالم یہ ہوا کا ہے کہ تاثیر ہوا سے
گردوں پہ ہے خورشید کا بھی دیدہ ہوائی

کیا صرف ہوا ہے طرب و عیش سے عالم
ہے مدرسہ میں مے سبق صرف ہوائی

خالی نہیں مئے سے رو شش دانۂ انگور
زاہد کا بھی ہر دانۂ تسبیح ربائی

جو آئینۂ دل ہے وہ عاشق کی بغل میں
گویا کہ ہے مینائے مئے کاہ ربائی

کرتی ہے صبا آکے کبھی مشک فشانی
کرتی ہے نسیم آکے کبھی نکہت سائی

تھا سوزنِ خار کا صحرا میں جہاں فرش
سبزہ نے وہاں مخمل خوشرنگ بچھائی

آرائشِ گلشن کیلئے جامۂ رنگیں
زیبائشِ غنچہ کیلئے تنگ قبائی

ہے نرگسِ شہلا نے دیا آنکھ میں کاجل
برگِ گلِ سوسن نے دھری لب پہ جمائی

ابرو پہ کرے قوسِ قزح سایہ تو خورشید
رخسارۂ گلچیں کا ہے سرخی سے عیاں

جوں وقتِ غضب چہرۂ ترکانِ ختائی
کیا ساغرِ رنگیں کو کیا جلد مہیا

نرگس نے تو سرسوں ہی ہتھیلی پہ جمائی
ہوتی متحمل نہیں ایک ساغرِ گل کی

شاخِ گلِ احمر کی نزاکت سے کلائی
اعجاز نوا سنجیِ مطرب ہے چمن میں +

ہر خار کی ہے نوک نے بانسری نوائی
حیرت کی نہیں جاے کہ دیوارِ چمن پر

ھر طائرِ تصویر کرے نغمہ سرائی
شاہا تیرے جلوہ سے ہے یہ عید کو رونق

عالم نے تجھے دیکھکے ہے عید منائی
کہتے ہیں مہ نو جسے ابرو نے وہ تیری

کی آئینۂ چرخ میں ہے عکس نمائی
پرتو سے ترے جامِ مۓ عیش سرِ بزم

لے ساغرِ جمشید کرے کاسہ روائی
ٹپکے لبِ ساغر سے وہ قطرہ کہ دی شکل

ہو مثلِ فلک جس میں تماشائی خدائی
کیا علم سمائے ترا سینہ میں فلک کے

دریا کی کہاں ہو سکے کاسہ میں سمائی
پڑھتا ہوں ترے سامنے وہ مطلعِ منزوں

آسنت کہیں سُنکے بھائی وسنائی

یوں کرسی زر پر ہے تری جلوہ نمائی
جس طرح کہ مصحف ہو سرِ رحل طلائی

رکھتا ہے تو وہ دستِ سخا۔ سامنے جسکے
ہے بحر بھی کشتی بکف از بہر گدائی

گمرہ کو ہدایت جو ترے راہ پہ لاوے
رہزن بھی اگر ہو تو کرے راہنمائی

ناخنِ شمشیر نہ ہو ناخنِ تدبیر +
دشمن کی تری ہو نہ کبھی عقدہ کشائی

خورشید سے افزوں ہو نشاں سجدہ کا روشن
گر چرخ کرے رکِ تری ناصیہ سائی

عکسِ رخِ روشن سے ترے جوں یدِ بیضا
کرتا ہے کفِ آئینہ اعجاز نمائی

کرتا ہے تیری نذر سدا نعتِ سعادت
ہے مشتری چرخ کی کیا نیک کمائی

ایک مرغ ہوا کیا ہے کہ سیمرغ نچھوڑے
گر سر بہوا ہووے ترا تیر ہوائی

ہر کوہ اگر کوہ صفا ہو تو عجب کیا
ہو فیض رساں جب ترے باطن کی صفائی

ہو بلکہ صفا ایسی دلِ سنگِ صنم میں
ہر بت میں کرے صورتِ حق جلوہ نمائی

ہر شعرِ غزل میں ترے معنی شفا ہیں
قربان غزل کی ترے دیوان شفائی

مانع جو ہوا دست درازی کو ترا عدل
پروانہ کو بھی شمع نے اُنگلی نہ لگائی +

زنجیر میں جوہر کے رہی تیغ ہمیشہ
خونریز کو ہو عہد میں تیرے نہ رہائی

دیتا ہے عاذوق کہ مضمون ثنا میں
ہے ذہنِ رسا کو یہ کہاں اس کی رسائی

ہر سال شہا ہووے مبارک یہ تجھے عید
تو مسندِ شاہی پہ کرے جلوہ نمائی

قصیدہ نمبر (۱۳) اکبر شاہ ثانی کی مدح میں ہے مگر نظر ثانی نہیں پائی

شاہا جمال و حسن کا تیرے لکھوں میں وصف کیا
ظاہر میں تو ظلِ خدا باطن میں تو نورِ خدا

جلوہ ترے دیدار کا ہے اسقدر بہجت فزا
روئے مقدس کو ترے جسنے کہ دیکھا یہ کہا

صلِّ علےٰ صلِّ علےٰ صلِّ علےٰ صلِّ علےٰ

اذوارِ عرفاں سے ترا سینہ ہوا ایسا صفا
جسکی پہنچتی روشنی ہے قاف سے تا قاف

خورشید مہ کو روبرو تیرے کہاں مقدور ہے
کرتے ہیں دو نو روز و شب آکر ترے گرد طواف

اے قبلۂ روشن دلاں اے کعبۂ اہل صفا

ہے تیری فرّو فرّ ہی فرّ فریدوں کا نشاں
نصفت کو تیری دیکھکر کسرے کی بھی ہو کشاں

تو وہ بکند رقد رہے اے فخر شاہانِ جہاں
تیرے حضیر پاک کو پہنچے ہے جام جم کہاں

وہ جام ہے گیتی نما یہ آئینہ ہے حق نما

تیری بہار لطف سے ہر شاخ ہے رشک چمن
پیدا ہوں خار خشک میں گلہائے نسرین و سمن

تیرے سحاب فیض سے اے ظلّ ربّ ذوالمنن
جسجا کہ موج ریگ ہو بحر رواں ہو موج زن

اور ان ہر موج میں لاکھوں ہوں دُرِّ بے بہا

اللہ رے دریا دلی تیری دم جود و کرم
ہے دل ہی دل شاہنشہا تو سے لیکر تا قدم

آگے تیری بخشش کے ہے دریا کہیں تہ میں کم
تو بخشدے ایک آن میں سو گنج دینار و درم

پیسہ بھی دیسکتا نہیں وہ فلس ماہی کے سوا

جسپر عنایت ہو تری اُسکو نہیں پروائے زر
جسکا کہ حامی تو ہو کیوں اُسکی خستہ ہو کمر

اللہ نے تجھکو کیا بیچارگاں کا چارہ گر
اے خسرو والا گہر تیرے تلطف کی نظر

ہے مفلسوں کو کیمیا۔ ٹوٹے دلوں کو موميا

تیری ثنا کب ہو سکے اے خسرو والا گہا
ہے جانتا ہے ذوق کی حق میں تیرے شام و پگاہ

جبتک زمیں پر ہے فلک اور ہیں فلک پر مہر و ماہ
فرخ ہمیشہ عید ہو تجھکو شہا با عز و جاہ

بدخواہ تیرا ہو سدا رنج و الم میں مبتلا

تمت بالخیر

قصیدہ نمبر (۱۴۷)

مرزا ابوظفر بہادر شاہ نے عالم ولیعہدی میں بیماری کے بعد غسل صحت کیا تھا۔ اسکی مبارکباد میں اُستاد مرحوم نے یہ قصیدہ لکھا تھا۔ عالم شباب کا کلام ہے ؎

واہ واہ کیا معتدل ہے باغ عالم میں ہوا — مثل نبضِ صاحب صحت ہے موجِ صبا
بھرتی ہے کیا کیا مسیحائی کا دم بادِ بہار — جگمگا گلزار عالم رشکِ صد دار الشفاء
ہے گلو کے حقمیں شبنم مرہم زخم جگر — شاخ شکستہ کو ہے باراں کا قطرہ موم سا
ہوگیا موقوف یہ سودا کا بالکل احتراق — لالہ بے داغ سیہ پانے لگا نشو و نما
ہوگیا زائل مزاج دہر سے یہانتک جنوں — بید مجنوں کا بھی صحرا میں نہیں باقی پتا
ہوتا ہے لطف ہوا سے اسقدر پیدا لہو — برگ میں ہر نخل کی سُرخی ہے جوں برگ حنا
پائی یہ اصلاح صفرا نے کہ دنیا میں کہیں — زرد چشم اب دیکھنے کو بھی نہیں ہے کہربا
ہر مزاجِ بلغمی میں ہوتی ہے تولید خوں — چاندنی کا پھول ہو گر ارغوانی ہے بجا
نام کو اشیا میں نہ تلخی رہی دسمیت — بنگنی تریاک افیوں زہر میٹھا ہوگیا
کیا عجب جدوار کی تاثیر گر رکھے نہ قوم — کیا عجب گر آب حنظل دیوے شربت کا مزا
نیش کیجا نوش ہو دنبالہ زنبور میں — کام میں افعی کے ہو مہرہ بجائے آبلا ؎
راحت و آرام کا اس دور میں ہے دور دور — چاہئے واقف نہ ہو دوراں سر آسیا
موتیا بند آنکھ میں اپنی جو رکھتی ہے صدف — اب کھے ہے روشنی مثل دل اہل صفا ؎
آگیا اصلاح پر ایسا زمانے کا مزاج — تا زبان خامہ بھی آتا نہیں حرفِ دوا
نسخہ پر لکھنے نہیں پاتا ہوا شافی طبیب — کہتا ہے بیمار بس کر مجھ کو بالکل ہے شفا

فرق چاہا یہانتک اعضائے بدن سے درد نے
درد کے جو حرف ہیں وہ آپ ہی ہیں سب جدا

لاغروں کو ہو کہاں تاب و طاقت یہ شتاب
کیجئے ہفتہ ہلال اک شب میں ہو بدر الدجا

صبح صادق کے ہے گو سر میں سفیدی آگئی
لیکن اس پیری میں بھی صادق ہے ایسی اشتہا

بھوک کی شدت سے اسکو یکنفس فرصت نہو
قرص خورشید کی جب تک نکرلے ناشتا

رات بھر ٹھونگا کیا انجم کے دانہ چرخ پیر
پھر جو دیکھا صبح کو اصلا شکم میں کچھ نہ تھا

پہنچی ہے تفتیش کی نوبت کہ نوبت خانہ میں
لیتی ہے جی کھولکر کیا کیا ڈکاریں کرنا

کوس پھولا ہے خوشی سے نفخ کا کیا دخل ہے
جوں حباب اسکی نہیں مطلق شکم میں استلا

ہضم کامل اسقدر معدہ نے پہنچایا بہم
جیدالکیموس ہے جو حلق سے اتری غذا

ہے مزاج اہل عالم یہ قریب اعتدال
ساتوں قلیمیں ہیں گویا اب بخط استوا

رکھیگا تعویذ اور گنڈا کوئی کیوں اپنے پاس
بلغ عالم میں یہی عالم جو صحت کا رہا

دیگا طاؤس اپنے بال و پر سے سارے نقش دھو
پھینکدیگی توڑکر گنڈا گلے سے فاختا

اسقدر رجاتی رہی عالم سے بیماری کہ آج
نام گلشن میں نہیں ہے نرگس بیمار کا

واقعی کس طرح سے صحت نہ ایک عالم کو ہو
جبکہ ہو اسکی نوید غسل صحت جاں فزا

وہ ولیعہد زماں مرزا محمد بوظفر
اسکی قوت گر ضعیفوں کو بنا دے اقویا

تقویت کا یا اثر ہو عام جو ہیں برگ زرد
ہوں مقوی دل و جاں مثل اوراق طلا

شادی صحت سے اسکے آج ہو کر شاد شاد
تہنیت خوانی میں ہیں سرگرم سب مدحت سرا

میں بھی اس رشک چمن محفل میں دو مطلع پڑھوں
ببل تصویر سنکر بول اٹھے مرحبا

مطلع

آج ہے عالم میں وہ روز سعادت ابتناء
فے اگر زاغ و زغن بیضہ تو پیدا ہو ہما

مژدۂ جان بخش صحت ہے تیرا مارا الحیات
جس سے جوں سیماب کشتہ مردۂ دل زندہ ہوا

ہے بقائے عمر سے تیری بقائے عمر خلق
ذات ہے تیری جہاں میں چشمۂ آب بقاء

قطرہ افشانی سے آب غسل صحت کے تیرے
ہوں دُر خوش آب پیدا استعد رقوۃ تغزا

ہوویں استعمال یاقوتی میں وہ موتی اگر +
بخشے پیران کہن کو نوجوانوں کے قوا

جسم کو مل مل کے دھویا تو نے جسد م قوت غسل
گرد کلفت کو دل عالم سے گویا دھو یا د

دل عدو کے سنگدل کا تھا شقاوت سے جو سخت
زیر پا پامال ہوتا تھا بزنگ سنگ پا +

خوردۂ گل کو صبا لائی تصدق کیلئے
دے گیا ابر بہاری نذر دُر بے بہا

شادی صحت کا تیری کیا کہوں عالم کہ آج
جوش عشرت سے یہ عالم بن گیا عشرت سرا

چھیڑے تا شمع کو گر ناخن موج نسیم +
بزم میں پیدا ہوتا رساز مطرب کی صدا

لب پہ ساغر کے ہے جوں موج تبسم موج مے
شور قلقل لب پہ ہے مینائے مے کے تھا تھا

بزم تصویرات فانوس خیالی کی طرح
حلقۂ رقاصگاں ہے زیر گردوں جا بجا

کر رہا صحن چمن ہی میں ہے کیا طاؤس رقص
آشیانہ میں ہے قصاں طائر قبلہ نما

خانہائے چشم میں بھی پتلیوں کا رقص ہے
ہے جو منظور نظر سب کو تماشا رقص کا

چھوٹی آتشبازی ایسی جسکی گلکاری کو دیکھ
رات کو کہتے تھے اُس میں ثریا و سہا

صنع آتشباز چرخ تیز زدہ ہوتی ہے عقل
سنگ پارس سے کہیں بارود کو پیسا تھا کیا

ہوگئی تاثیر جس کی یہ کہ ہر گلریز سے
ریزۂ فولاد نکلے بنکلے گلہائے طلا +

گنج چھٹتے تھے ستاروں کے عجب انداز سے
ماہ پاروں کا تھا گویا خندہ دندان نما

منہ ہے کیا جو رنگ سے مہتاب کے ہمتا ہو
غازہ ہے چہرہ چمکے رنگ روئے مہ لقا

برج جو اُڑ کر ہوئے قندیل شب ہیر فلک
برج تھے جتنے فلک پر سب کو روشن کر دیا

فی الحقیقت یہ وہ شادی ہے کہ اسکے روبرو
جشن جمشیدی کا کچھ مطلق نہیں رتبہ رہا

ہے زبانِ ماہ عاجز آگے بس تعریف میں
ذوق کہتا ہے اٹھا کر ذوق میں دست دعا

رکھے صحت سے ہمیشہ شانی مطلق تجھے
جو ترے بدخواہ ہوں وہ رنج میں ہوں مبتلا

قصیدہ نمبر (۱۵)

اس قصیدہ پر علاوہ خلعت معمولی کے ایک گانو جاگیر میں عطا ہوا تھا۔

شب کو میں اپنے سر بستر خواب راحت
نشۂ علم میں سرمست غرور و نخوت

مرے لیتا تھا پڑا علم و عمل کے اپنے
تھا تصور میرا ہر امر میں تصدیق صفت

ہو گیا علم حصولی تھا حضوری مجھ کو
تھا میرا ذہن نہ محتاج حصول صورت

جو مسائل نظری تھے وہ بدیہی تھے تمام
عقل کو تجربہ کی اتنی ہوئی تھی کثرت

نہ غرض مجھ کو نتیجے سے نہ تھا شکل سے کام
تھی میری فکر کو ہر شکل خطا سے عصمت

ذہن میں سب میرے حاضر صور علمیہ
پر جتانی نہ تھی منظور مجھے علمیت

چار و نا چار جو ترغیب سے یاروں کی کبھی
درس تع ریس پہ آجاتی تھی مجھ کو رغبت

کبھی ہمت تھی میری قاعدہ صرف میں صرف
کبھی تھی محو میں ہر نحو مجھے محویت

کبھی منطق کو تفوق یہ میرے ناطقہ سے
تحت حکمت ہو یہ فن گرچہ ہے تحت حکمت

کبھی میں کرتا تھا تصریح معانی و بیاں
کبھی میں کرتا تھا توضیح نجوم و ہیئت

کبھی تقسیم فرائض کبھی تفہیم اصول
کبھی تعلیم عقائد بکتاب و سنت

کبھی تھا علم الٰہی کی طرف ذہن رسا
کبھی کرتی تھی طبیعی میں طبیعت جولاں

کبھی تھا عقل پہ مذہب میرا مانند حکیم
کبھی مثل متکلم مجھے پاس ملت

دیا اللہ نے وہ قلب مصفا تجھ کو
اے شہنشاہ صفا ذہن و سراپا صفوت

فرد تفصیل حوائج ہے رخ حاجتمند
عرض حاجت کی نہیں سامنے تیرے حاجت

عید کو دیکھ ترے ساتھ خلایق کا ہجوم
کہے عارف کہ یہ کثرت میں ہے ظاہر وحدت

لکھے گر خامہ ترا وصف شمیم اخلاق
تو ہر ایک نقطہ ہو ایک نافہ مشک تبت

منتہی ہوں نہ کبھو تیرے صفات نیکو
گر بیاں کیجئے تا حشر صفت بعد صفت

ذوق کرتا ہے دعائیہ پر اب ختم سخن
کہ زباں کو ہے نہ یارا نہ قلم کو طاقت

عید ہر سال مبارک ہو تجھے عالم میں
با شکوہ و حشم و جاہ بعمر و صحت

خیر خواہوں کے ترے چہرہ پہ ہو رنگ نشاط
اور بد خواہوں کے رخسار پہ اشک حسرت

قطعہ در تہنیت جشن نوروز

خسرو اس کے ترا فرودہ جشن نوروز
آج ہے بلبل تصویر تلک زمزمہ سنج

خوب عیش تری وی ہے چمن کو جا کر
زر گل پیک صبا پائے نہ کیونکر پا رنج

بادہ جوش جوانی کی ہے گویا ایک موج
تن پیران کہن سال پہ ہر چین شکنج

چند قطرے سے ہیں شبنم کے وہ بلکہ کہ تر
آگے ہمت کے ترے گوہر شہوار کے گنج

حسن نیت سے ہے تو یوسف مصر بخشش
دست حاتم میں بجا ہے کہ جو دیں تیغ و ترنج

شش جہت پر جو ہے غالب ترا سر پنجہ امن
فتنہ کو اٹھنے میں جوں نرد ہے کیا کیا شش و پنج

نہ بجھے آب سے آتش نہ خس آتش سے جلے
ایک سے ایک موافق کہ مرنجان و مرنج

تیرے منصوبہ کے تابع ہیں سب احکام نجوم
صفحہ تقویم کا گویا ہے بساط شطرنج

لایا ہے مدعی سے یہ لعل خوشرنگ
ذوق جو مدح و ثنا میں ہے ترے گوہر سنج

خسرا ہوتا ہے اس رنگ سے معلوم یہ رنگ	رنگ نو روز جو ہے اب کے برنگ نارنج
بزم رنگیں میں تری رنگ طرب ہو ہر روز	اور تری خاطر اقدس پہ کبھی آئے نہ رنج

قصیدہ نمبر (۱۶)

۱۸۵۱ء میں بادشاہ بیمار ہو کر اچھے ہوئے۔ بڑی خوشی ہوئی۔ کہ اُس بڑھاپے میں خدا نے دوبارہ زندگی دی۔ غسل صحت کا جشن قریب تھا۔ اُستاد نے مبارکباد کا قصیدہ شروع کیا تھا۔ تمہید کی تحریر میں کہا تھا کہ خواجہ حافظ کا شعر بھی اس میں تضمین کر دینگے۔ ؎

مئے دوسالہ و محبوب چاردہ سالہ	ہمیں بس است مرا صحبت صغیر و کبیر

اسی عرصہ میں ایک دن میں گیا تو جو شعر پرچوں پر تھے اُنہیں ترتیب دیا تھا۔ سُنائے۔ انہیں میں قطعہ پڑھا

ہوا ہے مدرسہ بھی درس گاہ عیش و نشاط	کہ شمس بازغہ کی جا پڑھے ہیں ہر سہ میر
اگر پیالہ ہے صغرا تو ہے سبو کبرا	نتیجہ یہ ہے کہ مست ہیں صغیر و کبیر

میری طرف دیکھکر فرمایا۔ اب بھی وہ شعر؟ میں نے کہا۔ اب کیا ضرورت رہی آنکھیں بند کر کے فرمایا۔ یاد ہی کافی نسیان ہے!

اس قصیدہ پر خلعت کے علاوہ خطاب خان بہادر اور ایک ہاتھی سے حوضہ نقرئی عنایت فرمایا۔

زہے نشاط اگر کیجئے اسے تحریر	عیاں ہو خامہ سے تحریر نغمہ جائے صریر
زباں سے ذکر اگر چھیڑیئے تو پیدا ہو	نفس کے تار سے آواز خوشتر از بم و زیر

ہوا یہ باغ جہاں میں شگفتگی کا جوش
کلید قفل دل تنگ و خاطر دلگیر

کرے ہے وا لب غنچہ در ہزار سخن
چمن میں موج تبسم کے کھول کر زنجیر

کچھ انبساط ہوائی چمن سے دو نہیں
جو وا ہو غنچہ منقار بلبل تصویر

قفس میں ہیضہ کے بھی شوق نغمہ سنجی سے
عجب نہیں کہ ہو مرغ چمن بنالہ صفیر

اثر سے باد بہاری کے لہلہاتے ہیں
زمیں پہ ہمسر سنبل ہے موج نقش حصیر

نکلکے سنگ سے گر ہو شمارہ تخم فشاں
تو سبز فیض ہوا سے ہو وہ برنگ شعیر

زمیں پہ گرتے ہی لے آئے دانہ برگ و ثمر
جو ٹوٹے ہاتھ سے زاہد کے سبحۂ تزویر

ہوا پہ دوڑتا ہے اس طرح سے ابر سیاہ
کہ جیسے جائے کوئی پیل مست بے زنجیر

نہ خار دشت ہے نرمی میں خواب مخمل ہے
ہر ایک تار رگ سنگ بھی ہے تار حریر

ہوا میں ہے یہ طراوت کہ دود گلخن بھی
برستا اٹھتا ہے آتش سے مثل ابر مطیر

یہ آیا جوش میں باران رحمت باری -
کہ سنگ سنگ میں سنگ یدہ کی ہے تاثیر

ہر ایک خار ہے گل ہر گل ایک ساغر عیش
ہر ایک دشت چمن ہر چمن بہشت نظیر

ہر ایک قطرۂ شبنم گہر کی طرح خوشاب
ہر ایک گہر شبچراغ پرتنویر

کرے ہے صبح شکر خندہ اس مزے کے ساتھ
کہ جسطرح ہم آمیختہ ہوں شکر و شیر

سنوارتی ہے جو شام اپنی زلف مشکیں کو
سواد مشک ختن پر ہے لاکھ آہو گیر

نہال شمع سے ہر شب چنے گل شبو
بہار عیش میں گلچین کی طرح سے گلگیر

ہنسے چراغ تو ایسی ہنسی میں پھول جھڑیں
حیا سے رنگ گل آفتاب ہو تغییر

ہے ہے چرخ پہ ہر صبح جو صبوحی کش
باین دراز ریش آفتاب ساغر گیر

عجب نہیں ہے کہ آرایش زمانہ سے
حنائی پنجہ ہوں تاک و چنار و بید انجیر

چمن میں ہے یہ درختان سبز پر جوبن
کہ زہر کھاتے ہیں سبزان خطۂ کشمیر

نہ کیونکہ دیکھے گلشن کو بہ پڑھوں مطلع
کہ آئی ہے نظر ایک قطعۂ رشک خدائے قدیر

ظہورِ نرگس و گل جلوۂ سمیع و بصیر
نسیمِ نکہتِ گل اطہر و لطیف و خبیر

شمیمِ عیش سے ہے یہ زمانہ عطر آگیں +
کہ قرصِ نسترن گر ہے زمیں تو گردِ عبیر

حمل سے حوت تلک جا بجا ہیں تصویریں
بنا ہے عالمِ بالا بھی عالمِ تصویر

جہاتِ ستہ سے بزمِ جہاں ہے وسعت خواہ
کہ ہے ہجومِ نشاط و سرور جم غفیر

زمانہ دشمنِ عشرت کا اس قدر قاتل
مہ صیام کو دیکھے نہ کوئی بے شمشیر

ہوا ہے مدرسہ یہ بزمگاہِ عیش و نشاط
کہ شمسِ بازغہ کی جا پڑھیں ہیں بدر منیر

اگر پیالہ ہے مفتاحِ قفلِ توبہ سبو کبرائے
نتیجہ یہ ہے کہ سرمست ہیں صغیر و کبیر

زمینِ میکدہ یہ خندۂ نشاط انگیز
کرا لے مے سے ہو یوار قہقہا تعمیر

دیا ہے رنج کو دھو تیرے غسلِ صحت نے
ضمیرِ خلق سے اے بادشاہ پاک ضمیر

عجب نہیں یہ ہوا سے کہ مثلِ نبضِ صحیح
کرے اگر حرکت موجِ چشمۂ تصویر

شہنشہا ترے یمنِ شفائے کامل سے
جو لا علاج مرض تھے یہ ہیں علاج پذیر

کہ چوبِ گل کو اگر ہا ریں بیدِ مجنوں پر
تو صورتِ بشرِ ہوشمند خوش تقریر

اشارہ فہم ہوا ایسا کہ وہ بیان کرے
زبانِ برگ سے گونگے کے خواب کی تعبیر

جو میلِ کحل بصارت ہو کلکِ خط غبار
تو چشمِ دائرہ عین بھی ہو چشمِ بصیر

نہ موجِ مے کو ہو پیچشِ شیشہ لے ہچکی
گئی جہاں سے یہ بیماری خواق و زحیر

نہ برق کو تپِ لرزہ نہ ابر کو ہو زکام
نہ آب میں ہو طوبت نہ خاک میں تخمیر +

بدل گئی ہے حلاوت سے تلخی دارو — شراب تلخ بھی ہو میکشوں کو شکر شیر
قوی ہے قوت تاثیر سے دوائے طبیب — غنی قبول کی دولت سے ہے دعائے فقیر
شکستِ دل کو ترے یمن تندرستی سے — ق — کرے درست اگر مومیائی تدبیر
تو موئے کاسۂ چینی کو چارہ ساز قضا — نکالے کاسۂ چینی سے مثل موئے خمیر
کھجائے سر جو کبھی مفسدان سرکش کا — علاج خارش سر ہو بناخنِ شمشیر
بنا ہے نقش شفاخانہ ہر ہزار شفا — ہر ایک خانہ تعویز صاحب تکسیر
ہر ایک اسم عزیمت میں اسم اعظم ہے — ہر ایک نسخہ شفا میں ہے نسخۂ اکسیر
رہا نہ کوئی گرفتار رنج عالم میں — چھٹے جو تیرے تصدق میں مجرمانِ اسیر
شہا ہے دم سے تیرے زندگانیٔ عالم — یہ تیرا دم ہے وہ اعجاز عیسوی تاثیر
مثال خضر تو اے رہنمائے ملت و دیں — جہاں میں پیر ہو پر ہو گرامتوں سے پیر
تو وہ ہے حامیٔ دنیا و دیں زمانہ میں — کہ تجھ سے زیب ہے دنیا کو دین کو توقیر
کیا شہان سلف نے سخر ایک جہاں — کئے ہیں تو نے شہنشاہ دو جہاں تسخیر
سحر سے شام تلک زر فشاں ہے پنجۂ مہر — نثار کرتا ہے ہر روز ایک گنج خطیر
فلک پہ کرتا ہے ہر شب ادا جو سجدۂ شکر — نشان سجدہ ہے زیب جبین ماہ منیر
یہ روز بہ سے ترے ہے جواں جہان کہن — کہے نہ کوئی دوشینہ کو بھی جہاں میں پیر
حیات بخش جہاں تیرا مژدۂ صحت — جو بخشے خلق کو عمر طویل و عیش کثیر
ہزار دوں سال سر حد ی نکال کے دانت — ہنسیں اجل پہ جوانوں کی طرح مرد م پیر
جہاں کو یوں تری صحت کے ساتھ ہے صحت — صحیح جیسے کہ قرآن ہو مع تفسیر
یہ وہ خوشی ہے کہ فربہ ہوں جس سے روز بروز — ہلال بست و نہم کی طرح بدن کے حقیر

پڑھوں ثنا میں تری اب وہ مطلع روشن | کہ جس کا مطلع خورشید بھی نہ ہووے نظیر

شہنشہا وہ تری روشنی رائے منیر | عقول عشرہ کے انوار جس کے عشر عشیر +
جو ہو نہ تابع امر تشاوروا فی الامر | تو عقل کل کو کرے تو نہ ہرگز اپنا مشیر +
جو ہیں نکات و معانی بشکے فہم سے دور | وہ تیرے ذہن میں موجود سب قلیل و کثیر +
اگر ہے سہو کو کچھ دخل حافظہ میں تو یہ | نہ اپنا یاد ہے احساں نہ اوروں کی تقصیر
حیا ہے گر متعلق تری نگاہ کے ساتھ | تو ہے ضمیر کی جانب تیری صفا کی ضمیر +
تیرا تو سیئہ بھی یوں ہی داخل حسنات | کہ جیسے صحبت اصحاب کہف میں قطمیر +
کرے ہے سلب تغیر کو ذات حادث سے | زمانہ عدل سے تیری یہ اعتدال پذیر
مجال کیا کہ تیرے عہد میں شر کی طرح | اٹھائیں سر کو شرارت سے سرکشان شریر
ہوا میں آکے جو کرتا ہے سرکشی شعلہ | تو چٹکیاں دل آتش میں لے ہے آتشگیر
تیرے نسق سے جو بالکل رہی خونریزی | لڑائیوں میں کہیں چھوٹتی نہیں نکسیر +
جو پہنچے بتکدہ میں تیرا شور دینداری | بلند نالہ ناقوس سے بھی ہو تکبیر
کیا یہ کفر کو اسلام نے ترے معدوم | کہ کوئی زلف بتاں پر نکر سکے تکفیر +
جہاں میں چشم سیہ مست یار کا ہو یہ رنگ | جو میکشوں کو تیرا احتساب دے تعذیر
پڑی گلے میں سن خط سرمہ سے اسکی | ہے مدام گردش میں از پئے تشہیر
وہ برق قہر خدا تیری تیغ آتشدم | کہ جسکی آنچ ترے دشمنوں کو نار سعیر
جو ہے خدنگ کا تیرے نشانہ چشم حسود | تو ہے تفنگ کا تیرے ل عدو نخچیر
ترے نہیب سے ہوں شکل فلس ماہی خاک | کریں نہ حلقہ جوہر خاقت شمشیر +

جو تیر نکلے کماں سے تری وہ ہو جاوے
طلب میں جان عدو کی رواں قضا کا سفیر

ترے ہے خامۂ طغرا نگار میں یہ زور
ق
جو کھینچے ایک رقم خط منحنی وہ لکیر

تو اُس سے ایسی ہوں اشکال ہندسی پیدا
مٹا دے دیکھ کے اقلیدس اپنی سب تحریر

وہ روشنی تیرے خط میں کہ ابن مقلہ اگر +
ق
لگائے آنکھوں سے سرمہ کی جا تری تحریر

تو ہو یہ نور بصارت کہ پڑھ لے حرف بحرف
جو ہووے لوح جبیں پر نوشتۂ تقدیر

رقم میں گر ترے اوصاف کے قصور کرے
زبان خامہ عطارد کی ناک میں دے تیر +

تیرا سمند ہے وہ تیز رو کہ وقت خرام
ق
نظر ہو دیدۂ زرقا کی بھی نہ اُس کا نظیر +

کہ سیر گاہ ہے اُسکی تو راہ یک روزہ
اور اسکا شرق سے تا غرب عرصہ گاہ مسیر

تیرے جو فیل کی تعریف خسرو الکھوں
کروں حکایت شیریں کو ہکن تحریر

کہ فیل کوہ کہ تیشہ فلیلبان فرہاد
وہ دو نو دانت صفا ایک ایک جوئے شیر

چلے نہ اشرفی آفتاب عالم میں +
خط شعاع سے اُسپر جو یہ نہو تحریر

ابو ظفر شہ والا گہر بھادر شاہ
سراج دین نبی سایۂ خدائے قدیر

شہ بلند نگہ شہریار والا جاہ +
خدیو بھر کلہ خسرو سپہر سریر +

جہاں مسخر و عالم مطیع و خلق مطاع
فلک مؤید و اختر معین و بخت بصیر

زمیں ہو سبز جو تیرے سحاب بخشش سے
تو بوند بوند سے ہر خاک کے بنے اکسیر

بچشم مہر اگر تیرا تیر اقبال +
ق
کرے نگاہ سراب جو آب عندیر

تو فلس فلس سے ہو ماہیوں کی وقت شکار
نگین دست سلیماں بدست ماہی گیر

نہ ہے ثنا کیلئے تیرے اختتام تمام
نہ ہے دعا کے لئے تیری انتہا و اخیر

مگر یہ ذوق ثنا سنج و مدح خواں تیرا
غلام پیر کہن سال ایک فقیر حقیر +

کرے ہے دل سے دعا یہ سدا فقیرانہ
سنا ہے جب سے کہ رحم خدا دعائے فقیر

اٹھی آب پہ تا ہو زمیں زمیں کو ثبات
زمیں پہ تا ہو فلک اور فلک کو ہو تدبیر

فلک پہ چھوڑی نہ تا دامن مسیح حیات
زمیں پہ خضر کی تا ہو فنا نہ دامنگیر

عطا کرے تجھے عالم میں تا در قیوم
بجاہ و دولت و اقبال و عزت و توقیر

تن قوی و مزاج صحیح عمر طویل
سپاہ وافر و ملک وسیع و گنج خطیر

قصیدہ نمبر (۱۷)

ہیں میری آنکھ میں اشکوں کے تماشا گوہر
ایک گھر دیکھو تو ہوں کتنے ہی پیدا گوہر

نظر خلق سے چھپ سکتے نہیں اہل صفا
تہ دریا سے چمک کر نکل آیا گوہر

رزق تو در خور خواہش ہے پہنچتا سبکو
مرغ کو دانہ ملا ہنس نے پایا گوہر

پاک دنیا سے ہیں دنیا میں ہیں گو پاک سرشت
غرق ہے آب میں پر تر نہیں اصلا گوہر

ہے دل صاف کو عزلت میں بھی گرد و نسبے غبار
گرد آلود یتیمی ہوا تنہا گوہر

کور باطن کو ہو کیا جوہر انش کی شناخت
کہ پرکھتا نہیں جز دیدۂ بینا گوہر

غیر پر مایہ نہ کم مایہ سے ہو ضبط ہوس
بھگیا ژالہ ہوا لگ کے نہ پگلا گوہر

جوہر خوب کو درکار ہے آرائش خوب
خوبی آب کی خوبی سے ہے تصویر گوہر

سرکشی کرتے ہیں بے مغز نہ پر مغز وقار
جز حباب آب سے سر کھینچے نہ بالا گوہر

ربط ناچیز سے کرتے ہیں کوئی پاک نہاد
ہو نہ ہم صحبت تا رگ خارا گوہر

دلخراش اور ہے طاقت دہ دل ہے کچھ اور
کہ نہ گوہر کبھی ہیرا ہو نہ ہیرا گوہر

فیض کو عالم بالا کی ہے شرط استعداد
قطرہ یکجا ہے طباشیر ہے یکجا گوہر

صدق اور کذب پہ ہر نکتہ کی ہے شرط نظر
کور کیا جانے یہ سچا ہے کہ جھوٹا گوہر

صاف باطن کی ہو جب تک نہ ظاہر ہو درست
سول بھی ٹوٹ گیا صاف جو ٹوٹا گوہر

ہوتی غربت میں اگر قدر نہ خوش جوہر کی
تو کبھی کان سے باہر نہ نکلتا گوہر

خلش خار جنوں سے ہے پڑا کیا کیا
ہر قدم پر قدم آبلہ فرسا گوہر

دل عاشق میں کرے کیونکہ نہ آنسو پیدا
اسی الماس سے جاتا ہے یہ بیندھا گوہر

ذوق موقوف کرانداز غزلخوانی کو
ڈھونڈ اس بحر میں اب کوئی اچھا گوہر

عوطہ زن بہر سخن میں ہے لگانا بہتر
آگے تقدیر نے خود مہرہ ملے یا گوہر

اثر مدح سے اس خسرو دریا دل کے
کر سخن قابل گوش دل دانا گوہر

وہ بہادر شہ غازی کہ برنگ نیساں
روز برسائے ہے ابر کرم اسکا گوہر

جشن سے اسکے ہے ایک فیض کا دریا جاری
بہتے پھرتے ہیں برنگ کف دریا گوہر

زیور آرا ہوں اگر آج چمن میں گل و سرو
بیضۂ قمری و بلبل ہوں عجب کیا گوہر

پہنچے گر گوش صدف تک یہ نوید عشرت
اتنا بالیدہ بخود ہو کہ ہو مینا گوہر

کہتا ہے قطرۂ نیساں بھی اس در میں کاش
ہوتا میں دانۂ انگور نہ ہوتا گوہر

جدول آب میں کثرت سے حبابوں کے بھرے
مانگ میں مثل بت خوشتن آرا گوہر

ٹوٹا ہے کشمکش عیش سے جو صبح کا ہار
بھرے شبنم سے ہیں گلزار میں کیا کیا گوہر

گل شگفتہ میں یہ قطرۂ باراں سے بہار
بھرے در رجک یاقوت میں گویا گوہر

موج گوہر میں بھی ہے طرز تبسم پیدا
کوئی دم میں وش غنچہ ہنسے گا گوہر

رخ گلرنگ پہ ساقی کے عرق کا قطرہ
کیا تماشا ہے کہ بنجائے ہے نگا گوہر

قطرۂ آب لطافت سا ہے ٹپکا پڑتا ؛
گوش خوبان سمن بر میں مصفا گوہر

مدح حاضر میں کروں میں کوئی مطلع تحریر — آج ہے خامہ میرا منہ سے اُگلتا گوہر

آج وہ دن ہے کہ اے خسرو والا گوہر — کوہ دے نذر تجھے لعل تو دریا گوہر
بحر و بر میں ہے شہا تیری مہیا نے نثار — سیم و زر تلک اور لعل سے لے تا گوہر
ہو تیرے فیض قدم سے جو زمیں گوہر خیز — ہو نصیب صدف نقش کف پا کو ہر
مشتری کہتے ہیں جسکو وہ اُٹھا لایا چرخ — ٹوٹ کر جو تیرے سمن سے گرا تھا گوہر
صبح اقبال و سعادت کا ستارا چمکا — جو ترا طرۂ دستار کا چمکا گوہر
ترا آویزۂ سر پیچ کلاہ قبلۂ خلق — صاف قندیل در مسجد اقصا گوہر
حلب خلق میں ہے سینہ ترا آئینہ — عدن علم میں ہے قلب مصفا گوہر
پرورش دیوے چمن کو جو ترا ابر کرم — موتیا میں عوض غنچہ ہو پیدا گوہر
ماہ گنے کے لئے ہے نہ کہ گنے کے لئے — تیرے کینٹھے کا کہوں کیا اُسے زیبا گوہر
درفشانی سے تری اتنے گہر ہیں ارزاں — لکھتے ہیں نسخۂ مفلس میں اطبا گوہر
عکس سے تیرا اقبال کے دریا میں ترے — ق — اے محیط کرم وجود کے یکتا گوہر
آب گوہر ہو تو آب یہ اعجاز نما — کف دریا کو بنا دے یدِ بیضا گوہر
کوہ کا زہرہ کرے آب تری ہیبت سے آل — گر یہ سُن پائے کہیں سنگ نے توڑا گوہر
طبع نازک پہ تری بار گہر ہو جو گراں — پوست بیضۂ ماہی سے ہو ہلکا گوہر
آب دریائے کرم سے جو ہو تیرے سیراب — ابر مردہ سے برسنے لگیں کیا کیا گوہر
آج محفل میں تری وہ گہر افشانی ہے — لگن شمع میں ہیں آنسوؤں کی جا گوہر
دست فراش میں جاروب ہے ریش فرعون — فرش پر تیلیوں میں اُلجھے جو صدہا گوہر

تیرے دوران حفاظت میں کہاں رنج و گزند
حق میں بیمار کے تبخالہ ہے لب کا گوہر

افعی زلف کے کاٹے کو ہے جوں مُہرۂ مار
گوش خوباں میں تہ زلف سمن سا گوہر

سینہ صافی کا تری ایک ہے نقشہ دریا
دل روشن کا ترے ایک نمونہ گوہر

نقرۂ خنگ ترا ایسا برنگ شفاف
رو بر و جسکی صفائی کے ہو میلا گوہر

غرق دریائے جواہر میں ہے وہ کوہ گراں
گل ہیں مہندی کے جھڑاں لعل پسینا گوہر

پیل تیرا ہے بلندی میں فلک سے افزوں
جھول میں جسکے ہیں انجم سے زیادا گوہر

لیکے خرطوم میں جو آب ہو وہ قطرہ فشاں
دیوے جوں برہاراں ابھی برسا گوہر

ہے ترے قطرۂ پیکاں سے مبارش تیر
جگر چاک عدو میں صدف آسا گوہر

تیرا نیزہ ہے وہ طائر کہ عوض دانہ کے
مہرۂ پشت سے دشمن کے ہے چنتا گوہر

شعلۂ برق غضب سے ترے شاہا تہ آب
مثل مریخ ہر ایک سرخ ستارا گوہر

مُہرداروں میں ہے دربار کے گر نام عقیق
آبداروں میں ہے سرکار کے اونا گوہر

گرجے گردوں کی طرح سے وہ بآواز مہیب
جوہری جسکو کہ بتلائے ہے گرجا گوہر

ہو تیری کلک کرم جبکہ شہا گوہر بار
جیم محتاج کے دامن میں ہو نقطا گوہر

نقطۂ قاف قلم سے جو ہو ترے ہمسر
قاف تک قاف سے ہو بیضۂ عنقا گوہر

سینہ صافی سے تری ہووے صفا ایسی عام
دل کافر میں بھی ہو خال سویدا گوہر

ہو جو روشنگر عالم ترا نور دانش
موے چینی میں پرویا کرے اعلےٰ گوہر

خسروا میں جو کہوں سب ترے وصاف نکو
تو سدا منہ سے میرے پھول جھڑیں یا گوہر

ذوق کرتا ہے دعائیہ پر اب ختم سخن
تا کہ ہو سنگ سے لعل آب سے پیدا گوہر

تا رہے پنجۂ خورشید پہ ہر روز طلا
تا گرہ میں رکھے شب عقد ثریا گوہر

دانہ انجم گردوں سے پرے وجتک
رشتہ کاہکشاں میں شب بلدا گوھر

جب تلک جوش بہاراں سے ہوا دم صبح
تانکے شبنم سے سر دامن صحرا گوھر

ہر برس جشن تیرا تجھکو مبارک ہووے
برسیں ایسان کرم سے تیرے شاہا گوھر

دوستونکو ہو ترے گنج گہر روز نصیب
ہو نہ جز اشک سر دامن اعدا گوھر

قصیدہ نمبر (۱۸)

ہے وہ جاندار دے نافع اعضا و حواس
کہ دل مردہ ہو زندہ تن بیحس حساس

قطرۂ مے سے ترقی حواس خمسہ
یوں ہو جسطرح کہ ایک نقطے سے ہوں پانچ پچاس

ہووے اس روغن کمبریت سے مثل زرشخ
رنگ خسار جو کلفت سے ہو ہمرنگ نحاس

خشک مغزونکو جو ہو بوے گلاب اسکی بو
تر دماغ اتنا ہو دم لینے نہ فرط عطاس

قلب ماہیت اگر اس سے نہ بالکل ہو تو کیوں
قلب انساں میں تنور سے مبدل ہو ہرس

اُسکی دولت سے عجب کیا دل مفلس ہو غنی
کہ یہ ہے شربت دینار علاج افلاس

دیوے ساقی جسے ایجام دعوے سے کیے
آج جو پاس ہے میرے نہیں جمشید کے پاس

اللہ اللہ رے تری مستی و بالا دستی
شب کہے مست کہ کر لو لی گردوں سے مساس

سا سبیل آ کے اگر خلد سے ہو آب سبیل
کہے مینوش کہ بجھتی ہے کوئی اُس سے پیاس

زندگانی سے ہے مقصود شراب و ساقی
اور باقی تو ہے سب وہم و خیال و وسواس

زندگی چند نفس ہے کہو زاہد سے کہ تو
پاس کر عیش کا کیا کرتا ہے پاس انفاس

بیٹھ گوشہ میں نہ تو چھوڑ کے اس جلسہ کو
دیکھ رندان خرابات نشیں کا اجلاس

مے نہیں بر قع مینا میں مگر جلوہ فروز
کوئی خورشید لقا ہے شفقی رنگ لباس

اے خنکدل کبھی تو اس سے ہو سرگرم نشاط
غم کو جا دل میں نہ دے جیکو نہ رکھے اپنے اداس

دل جو گھر غم کا ہو کیا اُسمیں ہو سرمایۂ عیش
وہ مثل ہے کہ کہاں گھونسلہ میں چیل کے ماس

دل پر وسوسہ کی ہوتی ہے مے سے واشد
کھلتا ہے ہاتھ سے ساقی کے قفیل وسواس

میں یہ کہتا ہی تھا جو دل نے میرے مجھسے کہا
توبہ کر توبہ نہ کر اتنی زیادہ بکواس

ایسے مردار بد افعال کا تو نام نہ لے
حامی شرع ہے وہ بادشہ پاکانفاس

شاہ دیندار رہا دربشہ غازی جس نے
خانۂ توبہ و تقوے کو کیا محکم اساس

دور میں اُسکے ہو گر مرتکب مے کوئی +
کرے ہر قطرہ کلیجے میں خراش الماس

مے اگر آب بقا بھی ہو تو ہو وہ زہراب
جسکے پینے سے ہو جینے ہی سے بیخوار کو یاس

وصوے اس عہد میں گر زخم کو مے سے جراح
تو رہے حشر تلک سوزش و درد و آماس

کہتے اس آب شرا انگیز کو ہیں آج بشر
کہ یہ روغن ہے سر آتش شر غناس

تا نہ باقی رہے مے اور نہ مے میں مستی
توڑتا سنگ نمک سے ہے شیشہ کا گلاس

احتساب اسکا جو دے سنگ پہ شیشہ کو نپک
تو صدا ہو بن اُس سے بجز حمد و سپاس

مدح حاضر میں پڑھوں اُسکے کوئی مطلع میں
کہ سخن فہم و سخنور کہا ہے وہ قدرشناس

نطق شیریں مہ تیرا شہد کہ ہر درد کو راس
شان میں جسکے شہا فیہ شفاء النّاس

ہندوی زلف کہے ہے پاس سدا مصحف رخ
عہد میں ترے ہے کافر کو بھی اسلام کا پاس

سومیائی ہو حمایت ترے حق میں اُسکے
سخت گیری سے فلک توڑے سیکی گر آس

بوٹی اکسیر کی اور پارس اگر ہاتھ آئے
بل بے ہمت ترے نزدیک ہے پتھر ہے گھاس

چمن و ہر میں نرگس بھی تیری بخشش سے
رکھتی ایک کاسۂ زریں ہے اور ایک سیمیں طاس

کیا عجب فیض سے گر ابر کرم کے تیرے
بید مجنوں میں ہو پیدا ثمر سیب و گلاس

تیری شمشیر کے آگے نہیں رکھتی ہرگز
مغفری تیغ مہ نو کی شہا تربد واس

فیض تعلیم سے تیرے ہو جو منکر انساں
احمق الناس اُسے جانئے بلکہ نسناس

لوح تقدیر کے لکھے کو پڑھے حرف بحرف
تربیت سے تیرے اُمّی بھی ہو یہ حرف شناس

یوں تیرا حاسد پرعیب ہے عالم میں حقیر +
اسپ بدفال کوئی جیسے میان نخاس

دیکھے آہو کو جو ضیغم تو دہی عدل ترا
ڈھا نک دے آنکھ نجو اُسکی روش گاؤ خراس

زہے خورشید کے طالع کہ شعاع خورشید
دم تزئیں تیرے گھوڑے پہ لگے جائے قطاس

ایسا چالاک کہ اس طرح سے اُڑ جاتا ہے
جسطرح عاشق دل باختہ کے ہوش و ہواس

پہنچے اُس رخش فلک سیر زمیں پیما کو
نہ منجم کا خیال اور نہ مہندس کا قیاس

تیرا ہاتھی ہے فلک کاہکشاں ہے خرطوم
کان دُنومہ و خورد م ہے دُنب سرہے اُس

ذنب راس وہ جنسے ہوں سیہ بخت عدو
ماہ و خورد کہ ہوا خواہ ہوں روشن انفاس

رنگ تا تھی کا سیہ اور وہ دانت اُسکے سفید
کہتا ہے دیکھکے یہ ظلمت و نور اپنا قیاس

طرز صنعت سے لپٹا ہے شب یلدا نے
صفحہ صبح منور کو مثال قرطاس

ختم کرتا ہے سخن ذوق دعا پر اس طرح ق
تا ہوں دریا میں گہر کان میں پیدا الماس

تو شہ بحر و برائے شہ اسکندر فر ہو
دے خدا عمر خضر تجھکو حیات الیاس

عید ہر سال ہو فرخ تجھے با عیش و نشاط
تو ہمیشہ رہے خوش اور ترا بدخواہ اوداس

قصیدہ نمبر (۱۹)

ایک خورشید لقا طرفہ جوان رشق
تا بہ خسار فلق سرخی رخسار شفق +

وہ جبیں ماہ جبیں اُسپہ خطِ چین جبیں — تھی وہ انگشت نبی جس نے کیا ماہ کو شق
کرے دو ٹکڑے جگر کھینچکے ابرو تلوار — باندھ کر کھینچ لے دل زلف مسلسل کی طرح
تیر انداز جو مژگاں تو ادا شہ گذار — چشم ابلق تو نگہ ترک سوار ابلق
غمزہ و ناز کرشمہ وہ بلا غارت گر — کہ نہ چھوڑیں تنِ عشاق میں جاں ایک رمق
سرو قامت سمن اندام گلستاں رخسار — ہونٹ گلبرگ دہن غنچہ و بینی زنبق
سرو قامت سے اگر اُسکے ہو طوبےٰ سرکش — راست ہاں راست ہے یہ گل کھوئیاں اُخمق
شکر آمیختہ بادام مقشر دنداں — سیب فردوس نخداں لب خنداں فستق
کھلنا اُسکے دہن تنگ کا ایسا مشکل — جیسے دشوار ہو مفہوم کلام معلق
مصحف رو کے کتابی کو جو دیکھو اُسکے — تو کہیں صورت اخلاص نہ پاؤ مطلق
لوح رنگیں سے نہ زیبا ہو بیاض گردن — تاکہ ہو سرخی شنجرف نہ خون ناحق
دست و بازو و بر و دوش عجب صبح بہار — پنجہ وہ پنجۂ خورشید و حنا رنگ شفق
سینہ تا ناف صفا آب گہر کا دریا — ناف ایک عکس ذقن اُسمیں بجائے دُرِ دق
نازک ایسی کمر اس کی کہ سمجھنا مشکل — جسطرح شعر خیالی میں ہوں معنیٔ ادق
ہے گراں اُسپہ نزاکت سے نہ باندھے ہرگز — گر ہو تا رنظر دیدۂ عنقا منطق
اُسکا زانو وہ صفا کہ اگر دیکھے اُسے — آئینہ آب خجالت میں ہے مستغرق
کیا کہوں ساق بلوریں کی صفائی اُسکی — شمع گر دیکھے اُسے شرم سے آجائے عرق
قد جو گلبن تو وہ پاؤں کے حنائی ناخن — نیچے گلبن کے پڑے بکھرے ہوئے گل کے ورق
آکے بالیں پہ وہ طناز سراپا انداز — مجھ سے یہ کہنے لگا کیوں ہے تو غمگین ناحق
مژدۂ عیش سے ہے گلشن عالم میں بہار — نغمۂ عیش سے ہے بزم جہاں میں رونق

دوش پر سرخ لب جو کی ہے ایک سبز قبا
برمیں لالہ کے بھی گلشن میں ہے گلگوں یلمق

جوش سبزہ سے ہے وہ فرش سر صحن چمن
کوئی مخمل اُسے کہتا ہے کوئی استبرق

باغ عالم میں ہے یہ جوش بہار عشرت
ٹپکے ہے نخل سے مستی میں ہمیشہ راوق

تو بھی کر تہنیت عید کا اُس کے ساماں
کہ وہ ہے خسرو دیں حامی دین برحق

وہ بہادر شہ غازی کہ دم سرکہوں
اُسکے تیر و نکی خدا اُسکے حسود و نکی حدق

مدح اسکی ہے مناسب مجھے بلکہ انسب
یعنی توصیف کے لائق ہے وہ بلکہ الیق

سنکے یہ میں نے کہا مدح میں اُسکے مطلع
جسپہ احسنت کہیں مجھ کو لبید و عمعق

تو ہے وہ نائب ختم رسل اے سایۂ حق
کہ ترے سایہ میں ہے گلشن دیں کو رونق

ابر رحمت کا ہے سایہ ترا اے سایۂ حق
کیونکہ سایہ میں ترے ہو جہاں کو رونق

کسکا مقدور کہ سرتاب ترے حکم سے ہو
جو تیرا امر ہے الحق جو کہے تو صدق

ذکر حق سے کوئی خالی نہیں تیرا ہے وہ دور
کرتا میخانہ میں ہے شیشۂ مے بھی حق حق

گر کرے نشو و نما نامیۂ فیض ترا
گل جو ہو شمع سے پیدا تو کلاب و زنبق

حرف ہیبت کا تری کوئی زباں پر آیا
ہو گئی وقت کتابت جو زباں خامہ کی شق

نطق شیریں سے ترے ہووے حلاوت گر عام
کام میں خلق کے بورا ہو بجائے بورق

ناتوانوں کو جو دے زور حمایت تیری
مارے لات اُڑکے سر پیل دماں بچۂ بق

کہتے ہیں برق جہاں جسکو وہ ہے ایک ادنا
توپخانہ میں ترے توپ پہ زرین بیرق

کوہ تہی جسپہ کرے کاہکشاں کی بھی کمند
وہ تیری ہمت عالی کا ہے عالی جوسق

قطرہ افشاں ہو اگر تیرا سحاب ہمت
بوند اکسیر کی پیدا ہو بجائے سرمق

کرتا ادنے کو جو اعلے نہ تیرا منصوبہ
پاتا شطرنج میں فرزیں کا نہ تبہ پیدق

کرتا ایک جست میں ہے ماہی گردوں کو شکار
طائر تیر ہوائی ترا مثل لعلق

اے شہ داد گر انصاف پرست
اللہ اللہ رے عدالت کا تری نظم و نسق

اتنا عالم میں خدا رحم سے ہے خونخواروں کو
خون فاسد کو بھی ہرگز نہ کرے نوش علق

پر تو افگن ہوا گر روشنی طبع تری
ابرق آئینہ ہو اور سنگ سیہ ہو برق

مشتری بھی ترے شطرنج کا ایک مہرہ ہے
آفتاب ایک ترے گنجفہ کا گرہے ورق

ابر ہے گرچہ مثال نمد نمدیدہ
گر تری برق غضب جھاڑ دے اس پر حقیق

توشنا ہے بھی جل اٹھے زیادہ وہ شتاب
آگ لگجانے میں دیر اسکے نہ ہو ہے مطلق

تیرے توسن میں وہ جلدی کہ اگر چھیڑ دے تو
یوں وہ اڑ جاے کہ جیسے سر آتش زیبق

شمس کو پہنچے تری رے سے یوں شرق میں نور
تو ہو مغرب میں گرے پر تو نور مطلق

جسطرح روشنی قلب سے اہل اشراق
عرصہ دور سے شاگرد کو دیتے ہیں سبق

ذوق کرتا ہے تمنا ختم عا پر اس طرح
آکہ ہوں ارض و سما دونو طبق زیر طبق

ہو دے ہر سال مبارک تجھے عید رمضاں
اور دشمن کو رہے تیرے سدا رنج و قلق

قصیدہ نمبر (۲۰)

ایک دن فرمایا کہ یہ ہمارے بادشاہ کے پہلے سال جلوس کا قصیدہ ہے۔ شاہ نصیر مرحوم بھی دکن سے آئے ہوئے تھے دل نے کہا کہ قصیدہ لکھئے۔ اور ایسا لکھئے کہ استاد بھی کہیں کہ ہاں شاگرد نے کچھ لکھا۔ یہ طرح خدا نے دی اور خود سرانجام کیا۔ اللہ اللہ

ان دونوں کا جوش طبع بھی یاد رہے گا۔ عجب عالم تھا ✤

ہے آج جو یوں خوشنما نور سحر رنگ شفق
پرتو ہے کس خورشید کا نور سحر رنگ شفق

یہ جوش نسرین و سمن یہ لالہ و گل کا چمن ✤
گلشن میں گویا چھا گیا نور سحر رنگ شفق

ہر سرو قد غنچہ دہن ہر سمن شان چمن
ہر سبز گلگوں قبا نور سحر رنگ شفق

افشاں جبیں پر سر مہتاب انجم جلوہ گر
اور گورے ہاتھوں میں حنا نور سحر رنگ شفق

لب پر تبسم ہے کہ ہے جوش بہار و موج گل
دندان پا نخوردہ ہیں یا نور سحر رنگ شفق

ہر مجمع پیر و جواں ایک طرفہ مشرق ہے کہ واں
روشندل و رنگیں ادا نور سحر رنگ شفق

جام بلوریں میں ہے یوں عکس شراب لالہ گوں
ہو جیسے کیفیت فزا نور سحر رنگ شفق

حسن گل مہتاب نے جوش گل سیراب نے
کیا باغ میں چمکا دیا نور سحر رنگ شفق

دیکھے چمن میں برگ گل آلودہ شبنم جو کل
خجلت سے پانی ہو گیا نور سحر رنگ شفق

ہے شوق کو بالیدگی ہے ربط کو چسپیدگی
کس رنگ ہوں الگ جدا نور سحر رنگ شفق

ساقی مے عشرت سے بھر ساغر کہ ہے اس رنگ پر
آب ہوا جائے فضا نور سحر رنگ شفق

جشن بہادر شاہ ہے روز علو جاہ ہے
ہے اس لیے بہجت فزا نور سحر رنگ شفق

وہ سرو روشن گہر کہ جس کو جھل ہوں یکھکر
ماہ ثریا و سہا نور سحر رنگ شفق

ایک صفا و مطلع مہر لکھ دل و دیدہ شناسے گرد و دل
ہوں دیکھکر غرق حیا نور سحر رنگ شفق

روکش ہو تیرے رخ سے کیا نور سحر رنگ شفق
ذرہ ہے تیرے فیض کا نور سحر رنگ شفق

اے آفتاب عزوشاں تری جبیں سے ہے عیاں
نور یقیں رنگ حیا نور سحر رنگ شفق

روشن بیانی سے تری رنگیں کلامی سے تری
شرمندہ ہوتا ہے سدا نور سحر رنگ شفق

وہ سیمگوں ایواں ترا وہ سائباں رنگیں کھنچا
لیں وام اب جس سے صفا نور سحر رنگ شفق

فانوس شیشہ بعلگوں روشن تیری محفل میں ہیں
گویا کہ شیشہ میں بھرا نور سحر رنگ شفق

انصاف نے تیرے شہا سیماب آتش کو کیا
یوں جمع جیسا کیجیا نور سحر رنگ شفق

تیری امان و حفظ سے ہو جائے حق میں شمع کے
نار خلیل آب بقا نور سحر رنگ شفق

خورشید تجھسے فیض کو پہنچے تو مشرق میں ہو
جز در و لعل بے بہا نور سحر رنگ شفق

جسپر تو ہووے غضب ہو اسکے حق میں کیا عجب
سیل فنا برق بلا نور سحر رنگ شفق

شمشیر کی تیری چمک خون عدو سے یکبیک
دکھلائے ہے روز دغا نور سحر رنگ شفق

پیکان تیرا ماسگوں منہ مرچ سوفاروں کے یوں
گویا لگا کر پر اوڑا نور سحر رنگ شفق

جلوہ ہے تیری مہر کا شعلہ ہے تیرے قہر کا
ہے جسکو عالم جانتا نور سحر رنگ شفق

اسپ خجستہ ترا وہ نقرہ خنگ بادپا
غیرت سے جسکے اڑ گیا نور سحر رنگ شفق

اب ذوق کی ہے یہ دعا جبتک رہے شاہنشہا
خورشید و مہ ارض و سما نور سحر رنگ شفق

جبتک لباس دہر کو صابون اور شنجرف ہو
زینت دہ صبح و مسا نور سحر رنگ شفق

ہر جشن فرخ ہو تجھے اس طرح آب و تاب سے
ہووے تہ محتاج ضیا نور سحر رنگ شفق

شاہا زمانہ میں ہو تو با آبرو اور سرخرو
ہو جلوہ گر مشرق سے تا نور سحر رنگ شفق

دشمن کا تیرے منہ ہو فق اور خون بھی اسکے ہو شق
دیکھے نہ وہ اس کے سوا نور سحر رنگ شفق

قصیدہ (۳۱) بسبب

طرب افزا ہے وہ نوروز کا نارنجی رنگ
دیکھکر بھاگے جسے رنج ہزاروں فرسنگ

بل بے بالیدگی عیش کہ بر برگ گل پر
قطرہ شبنم کا ہے مینائے شراب گلرنگ

واہ کیا گلشن آفاق میں ہے جوش بہار
چہچہے کرنے لگی بلبل تصویر فرنگ

کلک نقاشی قدرت سے گلستاں میں ہے آج
تختۂ لالہ و گل صفحۂ نقش ارژنگ

خسروا تو نے کیا آج وہ جشن نوروز
دیکھکر جسکے تجمل کو ہو جمشید بھی دنگ

ہے ترے بزم طرب میں پئے رسم نوروز
صورت بیضۂ رنگین فلک مینا رنگ

مشک افشاں ہو جہاں میں جو تری نکہت خلق
ناف آہو نے ختن سے نہ ہو کم داغ پلنگ

بلکہ ہو جوش بہاران کرم سے تیرے
کیا عجب شاخ میں آہو کے گل نگار رنگ

تیرے انصاف سے ہے بزم جہاں میں شاہا
شمع گلگیر سے اور شمع سے محفوظ پتنگ

ہو اگر شعلہ فشاں تیری ذرا آتش قہر
تو سمندر ہے پانی میں بجائے خرچنگ

زیر ران تیری ہے وہ توسن چالاک کہ تو
ق چھیڑے ایک ذرا اسکو جو وقت صف جنگ

یوں کرے جست کہ جیسے سر میدان نبرد
مُنہ سے اُڑجائے حریفونکے ترے خوف سے رنگ

رکھتی سرعت سے تپ لرزہ ہیبت سے ترے
نبض محموم کی مانند جبل میں ہر گ سنگ

مرغ دل کو ترے دشمن کے قفس ہے سینہ
اور جگر چوب قفس کے ہے تیرا تیر خدنگ

ہووے حاسد کو نہ آزار حسد سے صحت
تاکہ وارو نہ پیالے میں بھرے تیری تفنگ

مفسد حاسد و غماز عدوے سرکش
زیر شمشیر غضب تیرے ہوں چاروں چو رنگ

آنہیں سکتے بیاں میں ترے اوصاف تمام
ہوتا ہے قافیہ سنجوں کا یہاں قافیہ تنگ

کرتا اس رنگ سے ہے ختم سخن دیکے دعا
ق ذوق جو ہے ترا مداح محب دیرنگ

گلشن دہر میں ہر سال مبارک تجھکو
جشن نوروز بہر رنگ بتاج و اورنگ

اور ترے حاسد بدبیں کو دکھائیں لاکھوں
خسروا روز نئے رنگ فلک کے نیرنگ

قصیدہ نمبر (۲۲)

حبذا ساقی فرخ رخ و خورشید جمال
مرحبا مطرب خوش روت فن زہرہ خصال

بارک اللہ کہ درافشاں ہے تو لطف بہار
خیمہ گرم کہ خراماں ہے تو اے باد شمال

للہ الحمد لبالب ہے مئے عیش سے جام
شکر للہ ز رگل سے ہے چمن مالا مال

جوش روئیدگی سبزہ سے ہو جائیگا سبز
گل زمیں چمن حسن میں تا دانۂ خال

اللہ اللہ رے سرسبزی گلزار جہاں
کیا عجب ہو روش خضر اگر رنگ پامال

شرر تیشہ فرہاد سے پیدا ہوئے گل
بل بے جوش گل خود رو سر امان خیال

جوش نظارہ ہے واں کثرت تاراج کہ یاں
سر مجنوں کے تھے آلودہ جہاں گرد سے بال

کیا عجب رحمت باری سے کہ وقت باراں
ابر مژہ سے بھی ہو قطرہ فشاں آب زلال

معجز باد سے مانند عصائے موسے
شجر خشک بھی ہو جائے تر و تازہ نہال

ذوق مستی سے ہلے طاؤس چمن میں رقاص
شوق آہنگ سے ہے سرو پہ قمری غوال

شور بلبل بھی یہ کہتا ہے نمک آج کہ گل
بنگیا کثرت شبنم سے نمکداں کی مثال

دیتی ہے طاقت پرواز یہ کیفیت مے
اس ہوا میں ہے بط مے کہ اڑوں بے پر و بال

ہے یہ دور کہ ہر صوفی صافی مشرب
رقص ستاں میں ہے جد کناں شامل حال

بیدموں کو ہو جو نے چارہ گر عیسے دم
شمع مردہ کی رگ تار سے کھولیں قیفال

پتلیاں ناچتی ہیں چشم کے گھر میں ہے ساز
جنبش دست مژہ دے ہے اس انداز سے تال

ہوں قلم ہاتھ اگر کوئی لکھے خط غبار
صفحۂ دہر پہ کیا دخل جو ہو گرد ملال

روز جشن آج ہما سکا کہ جسکی ہے خلق
نائب ختم رسل ظل خدائے متعال

وہ بہادر شہ غازی کہ اگر تیغ اسکی
اپنی کھلائے چمک چرخ پہ کٹ جائے ہلال

وہ نکو خوے نکو روے و خجستہ منظر
وہ بلند اختر فرخ روش و فرخ فال

وہ مسیحا دم و یوسف رخ داؤد الحاں
وہ سلیماں وش و موسیٰ کف و صالح اعمال

چمن خلق و نسیم کرم و ابر سخا
چشمۂ فضل و ہنر کان عطا بحر نوال

آسماں جاہ و عطارد قلم و مہر علم
مشتری دانش و مہ بینش و مریخ جلال

خسرو جم حشم و داور کسریٰ انصاف
شاہ دارا دل و سلطان سکندر اقبال

مدح حاضر میں پڑھوں اسکے وہ مطلع جس سے
ہمسری کی نہ رکھے مطلع خورشید مجال

ہو تری یک نظر فیض سے ناقص کو کمال
مہر سے گر نہ کامل ہو دو ہفتے میں ہلال

نیر جاہ ترا وہ ہے کہ تا دور فلک
نہ کسوف و نہ غروب و نہ ہبوط و نہ وبال

آگے بخشش کے ترے خرمن دریا کا نہ
آگے ہمت کے ترے کوہ طلا یک مثقال

ہووے جوں چادر مہتاب گلیم شب تار
رخ پر نور جو تو پونچھ کے جھاڑے رومال

جام سے قطرہ جو ٹپکا تو معلق ہی رہا
دستگیری نے لیا تیری جو کر تو نکو سنبھال

گر تیرے قہر کی گرمی تپ محرق بنجائے
لب دریا پہ حبابوں کی جگہ ہوں تبخال

قوت ماسکہ ممسک کے قوا سے گم ہو
فیض جاری سے ترے بخل کو یہاں تک ہو زوال

حکمت آموز تیرا علم جہاں ہو تو وہاں
نہ ارسطو کو ہو طاقت نہ فلاطون کو مجال

ہو تیری عقل سے عاجز دم بحث معقول
ایک مقولہ میں فقط فعل کی عقل فعال

دم ہے کیا باد صبا میں کہ دم سیر جہاں
ق تیرے گلگون سبکسیر کے جادے دنبال

یونہی دو چار قدم خاک اڑا کر رہ جائے
اور پہنچ جائے کہیں سے وہ کہیں مثل خیال

ہے وہ پیکل میں اگر دیو تو صورت میں پری
ہے اوڑان اُس میں ملک کے تو بشر کے خصال

جلد اتنا کہ جہاں عرصۂ جولاں اُسکا
عہد مستقبل و ماضی کا وہاں ہے یک حال

زیب تن اُسکے جو مہندی کا ہر گل تصویر
پھڑکا وے میں ہے وہ صوت فانوس خیال

اُس فلک سیر کو جولاں جو کرے تو تو یہ ڈر
مزرعہ سبز فلک ہو نہ مبادا پامال

تیرے ہاتھی کی بلندی کی طرف کی جو نگاہ
سر پہ اندیشہ نے لی ہاتھ سے ستار سنبھال

کہکشاں کو وہ فلک پر سے زمیں پر پھینکے
نیشکر راہ میں مانگیں اگر اُس سے اطفال

جیسے ماتھے پہ بزرگوں کے ہو سجدہ کا نشاں
اُس کی مستک پہ شہا جلوہ نمایوں ہے ڈھال

ہے جو اُس فیل کی خرطوم سر فیل کا صو
آئے اعدا پہ قیامت سر میدان قتال

اُسکے دانت انکے لئے ہیں وہ وش تیر شہاب
ہے جن اعدا کو سراوج شیاطیں کی مثال

آبداری میں تری تیغ کی ہے برق کی موج
کیا تماشا ہے کہ ہے آب سے آتش سیال

تیری شمشیر کو ہے خون عدو روز مباح
پر غلط تیسرے دن ہوتا ہے مردار حلال

طائر روح عدو کیلئے حیا دا جل
سبزۂ تیغ میں جوہر سے لگا رکھتا ہے جال

طاقت دم زدن اس دور میں ہے کسکو رہی
دیکھکر تیرا نسق اے شہ فرخندہ خصال

پر ترا ذکر جو آتا ہے زباں پر تو نفس
لب پر آ جاے ہے سینہ سے پے استقبال

ہو قوی دست اگر زور حمائت سے ترے
شیر سے پنجہ کرے پنجۂ مژگان غزال

تقویت دیوے اگر پاس حفاظت تیرا
شعلۂ شمع کو صرصر سے نہ ہو اضمحلال

ہے ترے عہد میں فتنے سے زمانہ خالی
فیلسوفی ہے حکیموں کی خلا کہنا محال

آتش و آب میں یہ بطہ تیرے عدل سے ہے
دیوے ہیزم کو جلا کر کوئی پانی میں جو ڈال

کاکل موج دخاں کیلئے اُس کے دریا
لے تہ آب سے شانہ پہ ماہی کا نکال

خبر جملۂ عشرت ہے تیرا جشن سعید — مبتدا جس کا شہا غرۂ ماہ شوال
ہوتی ہے سیرت و صورت سے تیری شاہا — روشن غنچۂ تصویر زباں منہ میں لال
بس دعا ہی پہ فقط ختم سخن کرتا ہے — یہ جو ہے ذوق ثنا خواں ترا اور مدح سگال
جشن ہر سال تیرا ہووے مبارک تجھکو — رہے جب تک کہ زمانہ میں حساب مہ و سال

قصیدہ نمبر (۲۲)

لاتا نیرنگ سے ہے رنگ نئے چرخ میل — واہ بگڑا ہے کچھ اس خم میں عجب رنگ سے نیل
دُر زمانہ سے وہ عیار ہے یہ ہوش ربا — لاکھ بیہوشیوں سے جسکی بھری ہے نہ بیل
ہے توکل کا احاطہ وہ عزیمت کا حصار — کہ بجز حفظ خدا جسکی نہ خندق نہ فصیل
گم ہوں مظاہر کی خرابی سے صفاتِ اصلی — زنگ دیتا ہے چھپا جوہرِ شمشیر اصیل
پیش دشمن نہ گذر حق سے نہیں سانچ کو آنچ — بلکہ ہے آتش نمرود گلستان خلیل
ہوتے سیرت سے ہیں مردانِ دلاور ممتاز — ورنہ صورت میں تو کچھ کم نہیں شہباز سے چیل
نہیں بے قید علایق کسی عالم میں بزرگ — رسم تحریر میں بھی چھوٹے نہ زنجیر سے فیل
ہے ترا خاک بھی قاروں کو سفر حشر تلک — نہیں تا تحت ثریٰ منزل آرام بخیل
عید یکروزہ جہاں میں ہے مصاں ہے یکماہ — بعد ہے کثرت تکلیف کی یہاں عیش قلیل
کشت سبز فلکی دیکھ سے نرکھ چشم ثمر — خوشہ فیض سے بے بہرہ ہے یہ مزرعہ نیل
قابل انسان کی صحبت کے ہے انسان ملک — بنگیا پیش نبی صورت دحیا جبریل
جتنا خورشید تپا اتنی ہی بارش ہووے — ہووے کیونکر تپش عشق نہ رحمت کی دلیل
عشق کھنچوائے ہے ایک زہ جفا کش سے برس — بار صد کوہ الم بے عمل جز تقیل
لگتی نہ چرخ کو گرنالۂ عاشق کی ہوا — دم میں جلے دخانی کی طرح ہو تحلیل

شمع کشتہ کے لئے ہے دم عیسےٰ آتش
سوزش عشق سے زندہ ہوں محبت کے تفصیل

سعب ہے جو کرے نالۂ دل در دظہار
نالہ ہے دل کی زبان دل ہے موکل یہ دکیل

دل کے ہے ایک ورق میں وہ حقیقت ساری
جس کا اجمال قصا اور قدر ہے تفصیل

جی میں ہے اور پڑھوں میں کوئی مطلع ایسا
گوہر مخزن معنے سے ہو جسکو تاویل

گنج حیرت میں کروں علم خموشی تحصیل
یہ عجب درس ہے جس میں نہ ہے قال نہ قیل

درس توحید ہے لوں ایک شفا کا نسخہ
بحث میں علت و معلول کے ہے عقل عیل

جادہ افروز رہی یک بدرو جی ہے اسکو
شمع فانوس سمجھ خواہ چراغ قندیل

فکر بیہودہ میں کس واسطے ہے تو پابند
کچھ نکال اپنے لئے ذوق نکلنے کی سبیل

خواب غفلت سے ہو بیدار کہ آئی پیری
نہیں مہتاب یہ ہے روشنی صبح رحیل

عرصۂ عمر ہے وہ تار کہ کھنچا اور ٹوٹا
کچھ اگر وقت معین کی طرف ہو ڈھیل

وہی منزل ہے جہاں ٹھیرے حیات گذراں
کہ پئے راہ فنا کوئی نہ فرسخ ہے نہ میل

مشق اندوہ سے ایکروز نہیں تو بیکار
تیرے ہفتہ میں نہیں کوئی بھی روز تعطیل

غم عصیاں ہے تو ہے رحمت غفار وسیع
فکر روزی ہے تو ہے رزق کا رزاق کفیل

ہے تمنائے زر و مال تو سب جائیگا چھوڑ
چھوڑ جانیکو تو کافی ہے فقط ذکر جمیل

پھر بہار چمن عمر میں دلگیر ہے کیوں
سیر کر سیر کہ ہے فرصت گلگشت قلیل

غنچۂ عیب ہے دیکھ تو کیا رنگ چمن
گل کی رنگیں ہے قبا غنچہ کی رنگیں سندیل

ہوئے آراستہ ہیں آج بدلکر پوشاک
فصل سے باغ تلک باغ سے تا بہ نخیل

نظر آتا ہے برنگ لب ساغر جو ہلال
ٹپکا پڑتا ہے لب مست سے شوق تقبیل

گاہ مئے خم میں ہے گہ شیشہ میں کیا کیا پئے سیر
روح کرتی ہے کسی مست کی قالب تبدیل

تہنیت خواں ہو تو آج اُس شہ دریا دل کا
جسکے نزدیک ہے ایک قطرہ سے کم قلزم نیل

وہ بھا دے شہ والانسب پاک گہر
خسرو چرخ سریر شہ خورشید اکلیل

ماہ نو چشم زدن میں مہ کامل ہو جائے
نظر مہر میں ہے اس کے وہ نور تکمیل

نور معنے ہے بہر شکل تجلی اس کا
اللہ اللہ رے نہ ہے شکل شہنشاہ شکیل

مدح حاضر میں پڑھوں مطلع روشن ایسا
مطلع شمس کو بھی جسکے ہو واجب تعجیل

بعد شاہان سلف کے تجھے یوں ہے تفضیل
جیسے توراں پہ توریت و زبور انجیل

تو ہے اس طرح سے عزت دہ اولاد پسر
جیسے موسیٰ شرف افزائے بنی اسرائیل

نور افزائے بصارت ہو اگر تیرا جمال
آئمہ آنکھوں سے نقطے سے اللہ جمیل

روئے نیکو پہ ہے مائل تیری خوئے نیکو
کہوں کیونکر نہ کہ الحسن لہ الحسن یمیل

ہے جو انسان کے قالب میں تنا نور ظہور
برج خاکی میں ہے خورشید فلک کی تحویل

دانش آموز ہو گر تربیت عام تری
بید مجنوں کو بنا دے ابھی انسان عقیل

جوہر تیغ اجل ایک ترے حکم کی نقل
تیر حکمی قضا حکم کی تیری تمثیل

عہد میں تیرے جو ہو راہ تعدی مسدود
کھلے فعل متعدی سے نہ باب تفعیل

تشنۂ ذوق حلاوت ہوں کیونکر نہ بیاب
تیری شیریں سخنی ہے انہیں شربت کی سبیل

گنجۂ پیدوں کے لئے نکتۂ برجستہ ترا
قابض طبع رواں ہے روشن دانہ بیل

جب ہوں مہمان ہوا تیرے نشان بندوق
نسر طائر کو بھی تو سمجھے ایک اڑتی ہوئی چیل

ہو ثبت عدو میں تیرا تیر صف دوز
رشتۂ مہرۂ تسبیح کی مانند دخیل

طائر روح عدو کیلئے بہر پرواز
تیر کی تیری صدا جیسے کبوتر کو زفیل

وہ قیامت ہے تیری فوج کہ شور محشر
دم نہ مارے کبھی سُن پائے جو گھوڑوں کی صہیل

نالۂ بوک کی ہیبت سے رکھے پھونک کے پاؤں
کوچۂ صور سے گذرے جو دم اسرافیل

دون تیرے گھوڑے کیونکر میں پرسے نسبت
نہ یہ صورت نہ یہ رفتار نہ یہ ڈول نہ ڈیل

گرم جولاں وہ کہاں ہو کہ رکھے ہے وحشت
نہ تو میدان تصور نہ فضائے تخییل

عرصۂ معرکہ میں گر تجھے اے شاہسوار
اُس سبکسیر سے منظور رہو کا تعجیل

جائے یوں جیسے ہوا سم بھی نہ پانی سے ہو تر
نہ ہو پروا اُسے ہے راہ میں تالاب کہ جھیل

کوہ البرز کو سائے میں دبالے اپنے
ہے وہ اے شاہ فلک تہ تری زین فیل

حملہ آور ہو وہ جسدم تو پڑے جان عدو
اُسکی حرطوم ہو دست کشش عزرائیل

تو جو محراب عماری میں ہوا جلوہ نما
اُسکے دانتوں پہ یہ حرطوم سے سوجھے تمثیل

خانۂ قوس میں خورشید جہانتاب آیا
دن ہیں کوتاہ ہوئے اور ہوئی رات طویل

نہیں یہ جوش گل و لالہ نکل آیا ہے
داد خواہی کے لئے خاک سے خونِ ہابیل

عدل نے تیرے کیا روئے زمیں کو گلزار
آج تک عدل میں کوئی نہ رہا تیرا عدیل

واسطے دیدۂ بد ہیں کے ہے یہ عین صلاح
ہو تیری نوک سناں سُرمہ کو یکے جو میل

تیر برسائے عدو پر جو کماندار قضا
کم نہ فوارہ سے ہو تیر و نکی اُسکی تندیل

رہزن نطفہ بدخواہ ہوا دل سے قضا
اُسکی پشت پدری سے نہ کبھی تا حاصیل

محکمہ میں تیرے انصاف کے ہوں تھ قلم
دے اگر بھوکے بھی کوئی حرف کو چھیل

ذوق کرتا ہے سخن تیری دعا پر کوتاہ
ہو گراں خاطر نازک پہ مبادا تطویل

عید ہر سال ہو فرخ تجھے با جاہ و جلال
ہوں قوی پایہ ترے دوست بقدر تعدیل

جو ضلالت سے ہوں گمراہ وہ ائے مثل خدا | ذل اقدام سے ہوں خاک مذلت پہ ذلیل

قصیدہ نمبر (۲۴)

پائے نہ ایسا ایک بھی ان خوشتر آسماں | کھائے اگر ہزار برس چکر آسماں
ہے بادۂ نشاط طرب سے لبالب آج | ایک عمر سے پڑا تھا تہی ساغر آسماں
دیکھے نہ اس طرح کا تماشا جہان میں | گر ہو تمام چشم تماشا گر آسماں
اترا رہا ہے عطر سے عیش و نشاط کے | سچ ہے زمیں پہ پاؤں رکھے کیونکر آسماں
افراط انبساط سے ہے کیا عجب اگر | مثل حباب جامہ سے ہو باہر آسماں
شادی کی اسکی دھوم ہے آج آسمان تلک | تابع زمانہ جس کا ہے فرماں بر آسماں
فرزند شاہ یعنی جواں بخت ذی وقار | تسلیم کو ہے جس کے جھکاتا سر آسماں
ہلے اسکی بارگاہ میں مانند چوبدار | حامی عصائے کاہکشاں لیکر آسماں
اس بیاہ کی نوید سے ہے اسقدر سرور | ہے پیر پر جوانوں سے ہے بہتر آسماں
پھرتا ہے اہتمام میں شادی کے رات دن | مقدور کیا کہ ٹھیرے یکدم بھر آسماں
فرد حساب صرف سے اس بیاہ کے ہو کم | گو لاکھ جمع و خرچ کا ہو دفتر آسماں
تو روز کی بخت مطبخ عالی میں اسقدر | ہے جسکا ایک توڈہ خاکستر آسماں
اس روشنی کی چند دکھا دیجے بیچ یاں | نازاں ہے آفتاب کے پنجہ پر آسماں
ابر بہار دود چراغاں سے توبہ تو | ہوں سات آسماں کی جگہ ستر آسماں
چشم قمر میں اور بھی ہو روشنی دوچند | کاجل لگائے اسکے دھوئیں سے گر آسماں

کر ڈالے پارہ پارہ فلیتوں کے واسطے
مہتاب کو سمجھ کے کہن چادر آسماں

یہ کہنہ و سیاہ و دو ہ خوشرنگ و نو بنو
فائق ہو کیا سبوچۂ ساچق پر آسماں

قندیلیوں میں ہیں و نقل پڑے اُن کا عکس اگر
لے کہکشاں کی مانگ میں موتی بھر آسماں

آرایش ایسی در و وہ گلہائے رنگ رنگ
ادنا سا جنہیں غنچۂ نیلوفر آسماں

بنوائے اُسمیں پھول طلائی نقرئی
لے لیکے ماہ و مہر سے سیم و زر آسماں

نقار خانہ کی ہے چراغاں سے وہ شکوہ
گویا ہے ایک زمیں پہ پر از اختر آسماں

کرتا ہے رقص تخت پہ نقارہ خانہ کے
ق شہنائی کی صدا کو جو سُن سُنکر آسماں

آوازۂ دمامۂ نوبت سے گونج اُٹھا
وہ جو سب آسمانوں کے ہے اوپر آسماں

دولہا دولہن کی ہے یہ علامت سہاگ کی
آیا ہے ایک سہاگ پڑا بنکر آسماں

جائے عجب نہیں ہے کہ عطر سہاگ کے
شیشہ کے شیشہ بھر کے ڑھاوے گر آسماں

یارب ہمیشہ دولہا دولہن میں رہے سہاگ
جبتک کہ ہو ہے نیچے زمیں اُوپر آسماں

مہندی کے وصف لکھنے کے قابل نہیں کیے ہے
نیلا سا ایک کاغذ بے مسطر آسماں

جو برج اُڑے ہے اڑکے یہ ہوتا ہے وہ بلند
رکھ لے ہے سر پہ مثل گل احمر آسماں

کرتا رہا برات کی شب شام سے نثار
شبنم کی جائے صبح تلک گوہر آسماں

پُوچھے براتیوں کے نہ ہرگز ہجوم کو
انجم سے لاکھ جمع کرے شکر آسماں

عیش و طرب کو مژدہ کرتا جہاں میں ہے
زہرہ سے اب قران مہ انور آسماں

ہنگام نرم عقد ستاروں کے واسطے
کیا کیا سجے ہے اوج و شرف کے گھر آسماں

بدلیں کی ہے نظر کے جلانے کے واسطے
انجم سپند آگ شفق مجمر آسماں

بسوئت سہرہ باندھ کے دولہ ہوا سوار
کیا کیا بلائیں لیتا تھا جھک جھک کر آسماں

کرتا تھا اِزدِحام کو دم پڑھ کے دمبدم
دولہا کے صبحدم رخِ روشن پر آسماں

ایسا نہیں جہاں میں کوئی نخل آرزو
لایا ہو آج جس میں نہ برگ و بر آسماں

کرتا ہے شاخ خشک تمنا کو نخل سبز
در پردہ مثل پردۂ بازی گر آسماں

شادی کا اُسکے نور بصد کے ہے اہتمام
کرتا ہے جس کا روز طوافِ در آسماں

وہ شاہ نامور کہ بہادر شہؒ اسکا نام
ہو حکم سے نہ اُس کے کبھی باہر آسماں

وہ آفتابی اس کی محل جس سے آفتاب
وہ چتر اس کا جس سے نہ ہو ہمسر آسماں

مطلع پڑھوں حضور میں ایسے کہ مطلع سے آفتاب کے بھی برتر آسماں

تجھ سا زمیں پہ دیکھے جو فرخ فر آسماں
قرباں نہ کیوں زمیں کے ہو پھر پھر کر آسماں

طالع سدا مساعد و عالم سدا مطیع
کوکب ہمیشہ یار ترا یاور آسماں

تُو آسماں سے رتبہ ترا یوں بلند تر
جس طرح کوہسار سے بالاتر آسماں

خطب کے واسطے ترے نامِ بلند کے
گر مشتری خطیب ہو تو منبر آسماں

وہ بحرِ بیکراں ہے تری ہمت وسیع
ہے بُلبلا سا ایک کنارے پر آسماں

دریائے قہر تیرا جو طوفاں کرے بپا
بہ جائے مثل کشتی بے لنگر آسماں

قد پر تیرے وہ راست قبائے علی جاہ
زیبندہ جسکے واسطے بالا بر آسماں

تیری کفِ فشانی دست کرم سے ہے
گویا کہ ایک دامن پر گوہر آسماں

چمکائے تیغ تیز کو اقبال گر ترا۔
ہو مصقلہ ہلال تو صیقل گر آسماں

یوں دل میں تیرے جلوۂ ذاتِ محیطِ حق
آجائے جیسے آئینے کے اندر آسماں

سُرعت میں تیرا رخش فلک سیر کیا شہا
رفعت میں بھی ہے پیل جبل پیکر آسماں

شاہا عجب نہیں ترے شبدیز کے لئے
بنوائے ماہ نو سے رکاب زر آسماں

پہنچا نہ اُسکے کاوے کے انداز کو کبھی
کھاتا رہا زمیں پہ سدا چکر آسماں

انجم ہیں کیا شرر تیرے نعل سمند کے
ہے بلکہ تیرا گرد رہ لشکر آسماں

مانا اگر بلندیٔ شان و شکوہ میں
ہاتھی سے تیرے ہو بھی گیا ہمسر آسماں

پر اُسکے نقش پا کے مقابل بنا سکے
چار آفتاب ایک جگہ کیونکر آسماں

یہ ذوق کی دعا ہے کہ جبتک زمانہ ہیں
منسوب ہر ستارے سے ہووے ہر آسماں

بزم نشاط و عیش رہے تیرے گھر میں روز
لائے ہمیشہ تیری مرادیں بر آسماں

مارے جگر میں حاسد بدخواہ کے ترے
تا خط و طمع سے سونشتر آسماں

اشعار در تاریخ دیوان نواب الٰہی بخش خاں معروف

سبزہ زنگاں کہ بباغ دمیدند
تازہ چوں شاخ گل و لالہ و ورد

از کمر تا دہن شاں مو ہوم
چوں خط جوہری مجوہر فرد

چشم دارند بقتل مشتاق
چوں حریفے کہ کند قصد نبرد

بجمال رخ آنہا معروف
مدتے شد کہ دلش خوش مسکرد

رفت صیت سخنش از دہلی
تا صفاہان و عراق و ہا ورد

نوشتہ شد از نظر خوش سیر

واندراں حال سخنہا میگفت ہمہ چوں نالۂ موزوں پُر درد
صد و یک مطلع رنگیں آخر گفت با نالۂ گرم و دم سرد
شد چو تسبیح زمرّد نامش رونق و آب گہر رفت بگرد +
مُرد فیروزہ و خوں شد دل لعل کہربا چوں پر قانی شدہ زرد
پیش آن گنج گہر نیست چو خاک گنج خسرو کہ بود باد آورد
ذوق چوں خواست دو تاریخش ہا اندریں دفتر معنے بد و فرد
اول از دانۂ خوشرنگ شمار کرد و آں عقدۂ مطلب وا کرد

باز با خامۂ رنگیں بنوشت +
طرفہ تسبیح زمرد آورد

قطعۂ تاریخ تعمیر چاہ معمورۂ محمد شاہ سہارنپوری

سید با صفا محمد شاہ کرد تعمیر طرفہ مسجد و چاہ
ذوق تاریخ سال ہر دو بہم زد رقم ساخت کعبہ و زمزم

خسرو اورنگ اقبال کی تیرے خورشید + کھائے ہے وقت شرف غرہ شرف کی سوگند
تاب کیا نجم سعادت سے تیرے ہو ہمسر منزل اوج پہ چمکے نہ تاباں ہر چند
دم تحویل یہ کہتے ہیں عناصر چاروں چار چند آپ کا ہو مرتبہ بالا صد چند
پرورش امن کے سایہ میں کیا کرتا ہے شیر نر بچۂ آہو کو بجائے فرزند
قصر دولت سے تیرے مرغ نظر ریختہ پر بام حشمت پہ تیرے کاہکشاں نصف کمند

قصیدۂ مسدس دعائیہ

سریر آرائے گردوں جبتک سلطان خاور ہو
قمر دستور اعظم صدر اعلےٰ سعد اکبر ہو
عطارد میر منشی زہرہ ناظر آسماں پر ہو
زحل میر عمارت ترک گردوں میر لشکر ہو

سر ہفت آسماں جبتک کہ دور ہفت اختر ہو
الٰہی یہ بھادر شاہ شاہ ہفت کشور ہو

رہے نام سلیماں تا نگین حکمرانی سے
رہے نام فریدون تا درفش کاویانی سے
رہے دارا کو تا نام آوری تاج کیانی سے
سکندر تا ہو نامی سکۂ کشور ستانی سے

ترا اے خسرو والا حشم عالم مسخر ہو
سریر سلطنت پر تو ہمیشہ دادگستر ہو

بخار ارض سے تا ابر ہو اور ابر میں پانی
رواں پانی سے تا دریا ہو اور دریا کو طغیانی
زمیں میں تا ہو کاں اور کان میں ہو جوہر کانی
پئے جوہر ہو قیمت اور قیمت کو فراوانی

تری شمشیر جوہر دار میں نصرت کا جوہر ہو
ترے قبضہ میں بحر پر گہر ہو کان پر زر ہو

رکھیں تا عود کو آتش پہ اور آتش کو مجمر میں
رہے نافہ میں مشک اذفر اور بو مشک اذفر میں
صدف میں تا ہو گوہر اور ہو تا آب گوہر میں
گل تر تا ہو گلداں میں ترے ہو تا گل تر میں

ترے ابر کرم سے باغ عالم تازہ و تر ہو +
شمیم خلق سے تیرے جہاں یکسر معطر ہو

طریق رہبری میں خضر ہو جبتک ہدایت فن
سہارا ہو تا بحر غریق الیاس کا دامن

رہے اور یسا تا قطع تعلق سے جنان مسکن — مسیحا کا ہو بالا طا تا خورشید سے روشن

چراغِ عمر سے تیری جہاں سارا منور ہو
فروغ اسلام کو ہو رونق دین پیمبر ہو

شفق گلگونہ ہو جبتک سحر کے روئے نیکو کو — کرے آراستہ تا شام اپنے سوئے گیسو کو
ثریا نور تن تا کہکشاں کے ہووے بازو کو — کرے سمر سے تا قوس قزح سبز اپنے ابرو کو

لب پانخوردہ دشمن کے لہو سے تیرا خنجر ہو
سرِ بدخواہ فندق تیری انگشت سناں پر ہو

گلستاں میں ہو تا گل اور گل سے شاخ ہو پیدا — نیستاں میں ہو تانے اور نے سے نغمہ ہو پیدا
نہال تاک میں انگور ہو انگور میں صہبا — نشہ صہبا میں ہو اور ہو نشہ جبتک نشاط افزا

شراب عیش سے خالی کبھی تیرا نہ ساغر ہو
ہمیشہ جشن جمشیدی سے تیرا جشن بہتر ہو

رہے تا کام دینداروں کو احکام شریعت سے — خوشی تا حاجیوں کو ہووے کعبہ کی زیارت سے
رہے تا عابدوں کو شوق محراب عبادت سے — نماز اہل سنت تا ہو مسجد میں جماعت سے

ترا خطبہ میں ہو نام اور خطبہ زیب منبر ہو
ترا حامی ابوبکر و عمر عثمان و حیدر ہو

قلم تا راستی پیشہ ہو اور کاغذ صفا ئیر — قلمزن تا ہو مشک افشان و کاغذ خط سے مشک آگیں
زبانیں تا سخن ہو اور سخن میں معنی رنگیں — سخن تا داد چاہے اور تا اہل سخن تحسیں

ترا مداح دائم خسرو اذوق سخنور ہو
ہمیشہ تہنیت خواں ہو دعا گو ہو ثنا گو ہو

اشعار متفرقات قصائد و قطعات و مخمسات وغیرہ

قطعہ در مدح میرزا شاہرخ بہادر

میرزا شاہرخ بہادر نے — قصد صید افگنی کیا جسدم
خون نخچیر سے ہوا سارا — دامن دشت لالہ زار ارم
نہ بچا اُس شکار افگن سے — صید کوئی سوائے صید حرم
مرغ و سیمرغ اور غزال و پلنگ — ہوئے مسکن پذیر دشت عدم
ہے جگر گوشۂ بہادر شاہ — ہو بہادر نہ کیوں وہ نیک شیم
سمجھے شیر آپ کو ہزار غنیم — اُسکے پر سامنے ہے مثل غنم
شیر گردوں بھی اسکے لشکر میں — پائے ہرگز نہ قدر شیر علم
رہے مانند شیر قالیں کے — اوج ہمت سے اُسکے زیر قدم
ہاتھ میں جب تفنگ لی اُس نے — ہمسر اژدہائے آتش دم
کئے شیر ژیاں شکار کئی — اُس غضنفر شکار نے پے ہم
ہے بجا گر دلاوران جہاں — کھائیں اُسکی دلاوری کی قسم
جبکہ اس جرات و شجاعت کو — چاہا اسطرح دل نے کیجے رقم
تا رہے یادگار عالم میں — وصف عالی صاحب عالم

لکھی اے ذوق میں نے یہ توصیف
مع تاریخ ثانی ۱۲۶۲ھ رستم

لکھتے ہیں کسکی تہنیت عید مدح خواں | آراستہ ہوا جو قلمدان آسماں

عہد میں تیرے نکالے دانت گر سین ستم | کام لے زنبور کا خامہ سے ست معدلت
گر پڑے پاؤں پہ تیرے مہر اگر سایہ دار | آفتابی سے جو تو کہدے کہ اسکو روک مت

فصل گل آج ہے وہ سلطنت بارائے طرب | کہ ملا باغ میں بلبل کو ہزاری منصب

ہے اگر لیلی سیاہی تو ورق عذرا عذار | خط ترا شیریں ہے شاہا اور قلم شاخ نبات
ہو گیا خورشید مالا مال دو ہی نور سے | دی جو تو نے دولت انوار دانش کی زکوت
ہاتھ میں بندوق لے جسوقت تو بہر شکار | شیر گردوں کو ہو مشکل ہاتھ سے تیرے نجات

پر نہیں پر ترا توسن وہ پری سا بال | سیر کر جسکے ہے ایک قاف سے لیکر تا قاف
ہو قوی دست ترے زور سے اسلام اگر | کھینچے شمشیر سر کفر پہ پھر مرکز کاف
پا تا گرداب سے ہے گردۂ نان آبی | تیری بخشش سے جو دریا کا معین ہے کفاف
دست ہمت نے ترے کھوئی روپے کی قدر | چٹکیوں میں ہیں اڑاتے اسے کیا کیا صراف

دیتا ہے تیری فوج میں نقارہ جب فلک | آتا ہے صاف چوب کی صورت نظر ہلال

آنسر طائر ایک پرندہ نہ بچ سکے | منظور تجھ کو جبکہ شکار پرند ہو۔

مطلع قصیدۂ مدح حضرت بادشاہ اکبر شاہ جنت آرامگاہ

قصیدہ مرقومۂ الذیل آغاز شباب کا تھا۔ والد مرحوم نے ایام جوانی میں ایک بیاض بنائی تھی۔ اُستاد مرحوم کی غزلیں لکھا کرتے تھے۔ اس میں ایک قصیدہ اکبر شاہ رضوان اللہ علیہ کی مدح میں تھا۔ ایک زمانہ تھا کہ بندہ آزاد کو سب یاد تھا۔ افسوس کہ نہ وہ رہے۔ نہ بیاض رہی۔ یہ چند اشعار یادگار رہے۔ اللہ ۔ع ۔ تو باقی و یادگار باقی +

آج کچھ ایسی ہوا ہے عیش کی تاثیر سے
ہر ورق کاغذ کا رشک گلشن کشمیر ہے

گر نہال دشت کو شوق حنا بندی نہیں
ہاتھ کیوں میدہی رنگتا برگ بید انجیر ہے

مدح حاضر میں سنا دے مطلع روشن۔ کہ ذوق
منتظر مشرق میں بیٹھا مہر پر تنویر ہے

نام کو اللہ اکبر کیا تری تاثیر ہے +
لہر زن میں شامل اور داخل بہر تکبیر ہے +

بادشاہی قصہ خوانوں میں میر آمیر علی نام ایک خوش بیان شخص تھے۔ اُنہوں نے استاد مرحوم سے کہا کہ گھوڑے کی تعریف میں چند شعر کہدیجئے کہ داستان میں جب ایسا موقعہ آتا ہے تو اشعار حسب دلخواہ نہیں پاتا۔ جی ڈھونڈتا رہجاتا ہے۔ اُستاد مرحوم نے حسب عادت وعدہ کر لیا مگر پورا کرنے کی فرصت کجا۔ جب کئی تقاضے گذر گئے۔ اور اُنہوں نے پھر کہا تو ایکدن فرمایا۔ کہ جب ہم بادشاہ کیلئے قصیدہ کہیں تو یاد دلانا۔ اُسمیں طبیعت پر ذرا زور ڈال کر کہینگے۔ تمہارا کام ہو جائیگا۔ ہمارے قصیدہ کا ایک جز قوی ہو جاے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا +

قصیدہ مذکور معدوم ہوگیا۔ غدر کے بعد عالم تباہی میں ایکدن میسر موصوف حافظ ویران کو ملگئے۔ حافظ کو اللہ مغفرت کرے اُن سے اشعار مفصلہ ذیل حاصل کئے اور

مجھے دئے تین شعر متفرق اور بھی ہیں وہ بھی لکھتا ہوں ✤

کروں اگر رقم نہنیت کا میں آہنگ | تو ہو ے خامہ سے پیدا صدائے ابربط و چنگ
ہے نرا زور رحمایت کہ پانوں کو اپنے | کرے ہے شیر کی چربی سے مالش آہو لنگ
شہا ترے رخ روشن کو کس سے دوں تشبیہ | کہ مہر و مہ کو گہن لازم آئینہ کو زنگ

گھوڑے کی تعریف میں

کروں میں کیا ترے گلگوں کا وصف چالاکی | اُڑا ہی جاتا ہے وہ تو بنگ طائر رنگ
نہ پہنچے گرد کو اُس کے وہ پیک فکر رسا | کہ ہووے عرصۂ نہ چرخ جسکی ایک شلنگ
چلے ہے یوں کج و واکج ادا و ناز کے ساتھ | کہ جیسے مست مئے ناز کوئی دلبر شنگ
وہ چلنے میں ہے تندرو اور اُڑنے میں شاہیں | اُچکنے میں ہے وہ آہو۔ لپکنے میں ہے پلنگ
نہیں پری وہ پری سے ہے پر سوا پر اں | نہیں وہ آدمی۔ لیکن سب آدمی کے ڈھنگ
رواں ہو گر وہ سبک سیر آب دریا پر | تو سُم بھی تر نہ ہو اُس کا چہ جائے زانو تنگ
جو چھیڑے اُسکو تو میداں میں اور کہیں اُسکے | بز بر نعل سُم آکر شرر فشاں ہو سنگ
شرار سنگ نظر سے نہاں نہ ہونے پائے | ڈپٹ کے اور وہ پھر آئے سینکڑوں فرسنگ
اگر ہو تجھکو تماشا اُسکے خانہ زیں میں | تمام عرصۂ گیتی کی سیر کا آہنگ
تو اس ارادہ کے آنے میں دل تلک ہو دیر | اور اُسکے جاکے پھر آنے میں کچھ ہو دیر نہ رنگ

ہیں وہ نعلیں خسرو اترے سر اور نگ گل | جن پہ کھاتا ہے چمن میں تختۂ اورنگ گل

کرے ہے مہر علی دل کو صاف پر انوار | طلوع شمس پہ موقوف ہے وجود نہار

علیؑ سے کیونکہ نہ ہو زیر لشکر کفار | علیؑ ہے شکل علیؑ اور علیؑ ہے حرف جار

مخمس در مدح

خسرو اچڑھ کے سر گنبد دوار ہلال | خود لب عجز سے کرتا ہے یہ اقرار ہلال
خاضر خدمت عالی ہے بہر کار ہلال | گرز بردار ہے خورشید کمندار ہلال
آسماں لیکے سپر چلتا ہے تلوار ہلال

دست ہمت ترا خورشید سے ہے بالا تر | تری بخشش سے ہے ہر نیساع ق شرم میں تر
آئیں تیرے در دولت پہ گدا یا نہ اگر | اپنے کانسہ میں بھرے چرخ وہیں لعل و گہر
اور کشتی میں بھرے درہم و دینار ہلال

ذوق کرتا ہے سخن تیری دعا پر کوتاہ | عید ہر سال ہو فرخ تجھے باحشمت وجاہ
تیری دولت سے ہوں خورسند ترے دلخواہ | اور جو حاسد ہیں ترے واسطے انکی ہر ماہ
چرخ پر تیز کرے خنجر خونخوار ہلال

قصیدۂ ناتمام در منقبت

لکھوں جو میں کوئی مضمون ظلم چرخ بریں | تو کربلا کی زمیں ہو میری غزل کی زمیں
یہ حال ہے مرا ضعف دماغ سے کہ مجھے | صدائے صور قیامت ہے ہر نفس کی طنین
زمانہ عہدہ پرداز و بخت بدناساز | ستارہ بر سر پرکاش و چرخ بر سر کیں

عجب نہیں ہے کہ راہب خط چلیپا سے
بنائے تیرے طویلہ کے واسطے خرزیں

رباعیات مدح

شاہا تجھے با دولت و بختِ فیروز | فرخ ہو سدا جہاں میں جشن نوروز
ہووے شرف اندوز ترے طالع سے | ہر سال حمل میں مہر عالم افروز

خورشید سے یکروز جہاں میں نوروز | اور تجھ سے جہاں روز مسرت اندوز
ہے تجھکو زمانہ میں شرف دوازدہ ماہ | اور ہے مہر جہانتاب کو یکماہ یکروز

کہتا ہے یہ فیروزے رنگ نوروز | تو ہو صف اعدا پہ مقرر فیروز
ہو دشمن سرکش کیلئے سہم الموت | اے شاہ عدو کش تیرا تیر دل دوز

دعا ہے ذوق کی ہو خلعت ولیعہدی | مبارک آپ کو با آفتابی و کرسی
یہ آفتابی و کرسی خدا کرے فرخ | بحق سورۂ والشمس و آیۃ الکرسی

اشعار قصیدہ

آگے تیری طبع موزوں کے ہے ایک فعل عبث | یہ جو کرتے ہیں عروضی فاعلاتن فاعلات
فیض سے تیرے نکیونکر ایک جہاں سرسبز ہو | ذات ہے تیری شہا سرچشمۂ آبحیات

اشعار قصیدہ ہفتدہ زبان

جبکہ سرطان و اسد مہر کا ٹھیرا مسکن | آب و ایلولہ ہوے نشو و نماے گلشن

جوش روئیدگی سبزہ پہ یاد آئی ہے
آنبتہ اللہ نباتاً حسناً

جسطرح شعلہ کا عالم ہو بہ فانوس خیال
خوف سے یوں ترے لرزاں ہے عدو زیر کفن

شاہا بعمر و دولت و اقبال و عزّ و جاہ
فرخ یہ تجھ کو سالگرہ ہو ہزار سال

بلکہ خدا کرے تری عمر اس قدر دراز
ہوں جس میں بے شمار گرہ بے شمار سال

کوہ اور آندھی میں ہیں گر آتش و آب و خاک و باد
چل نکلیگے آج پر آتش و آب و خاک و باد

تا کہ یہ گبر اور ہنود طاق پرست پوں باز
چھوڑ دیں شرک پوجنا آتش و آب و خاک و باد

تمت بالخیر